جلد دوم

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علامہ خالد مسعودؒ

تلمیذ

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین

حسان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com

Marfat.com

MFN
238248

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علامہ خالد مسعودؒ
تلمیذ
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

DATA ENTERED

جلد دوم

ترتیب و تدوین
حسان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com

297-08
196
14554
جلد 2

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: توضیحاتِ فکرِ فراہی

مصنف: علامہ خالد مسعودؒ
تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین: حسان عارف/محسن فارانی

قیمت: 600/-

اشاعت طبع اوّل: اکتوبر 2016ء

تعداد: 1100

پرنٹنگ: شفیق پرنٹنگ پریس، لاہور

ناشر: مجلس حزب الانصار، شارع بگویہ، بھیرہ، ضلع سرگودھا

فون نمبر: 048-6690847–0321-4868787

ای میل: hassanarif1972@gmail.com

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، پاکستان
فون: 042 37320318 فیکس: 042 37239884

ملنے کا پتہ
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

فہرست مضامین

جلد دوم

باب ہفتم ... افاداتِ فراہی

ایمان 8
نماز کی حقیقت 14
حکمتِ صوم وجہاد 26
نبی اور مقام رسالت 33
عقیدۂ شفاعت 40
مُعجزہ کی حقیقت 46
احکام رسُول کا قرآنِ مَجید سے اِستنباط 52
قرآن کا طرزِ اِستدلال 61
توحید پر قرآن کا اِستدلال 68
اَعمال کی جزا اور سزا کا تصوّر 76

باب ہشتم ... اسالیبِ قرآن

اسالیبِ قرآن 82
فصل 94
تنوعِ خطاب 98
اِلتفات 105
اِعتراض 114
تضمین 122
حذف 131
حذفِ فعل 150

Marfat.com

معطوف علیہ کا حذف 159

مقابل کا حذف 164

اجمال کے بعد تفصیل 170

مخاطب کو متوجہ اور متنبہ کرنے والے اسالیب 181

بابِ نہم... ذکر و فکر

وقت کی ایک اہم ضرورت 192

زکوٰۃ سے متعلق بعض وضاحتیں 194

صدرِ اول کی تاریخ کے لیے چند رہنما نکات 200

مشاہداتِ حج 203

معاشرتی نظام کو بگاڑنے کی بین الاقوامی تحریک 210

مکاتیبِ اصلاحی نمبر 213

تدبرِ قرآن کا ایک قابلِ قدر مطالعہ 217

امام فراہی سیمینار 220

نظمِ قرآن کے نظریہ کی مقبولیت 222

بابِ دہم... قومی و ملی مسائل

نفاذِ شریعت 226

ہماری سیاست کا بدنما چہرہ 229

انتخابی نتائج اور دینی جماعتیں 233

دامِ ہمرنگِ زمیں 235

مغرب کی ثقافتی یلغار 239

مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ 242

ملت کے تحفظ کی ضرورت 245

بابِ یازدہم... تبصرۂ کتب

فقہی اختلافات کا حل 250

Marfat.com

تحقیق عمرِ عائشہؓ 253
ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت 260
روایتِ افک 265
بین الاقوامی برادری کی مسلم اقلیتیں 271
تصوف کی حقیقت 279
ضعیف احادیث کی معرفت اور اس کی شرعی حیثیت 285

بابِ دوازدہم ... مکاتیبِ خالد

تفسیر تدبرِ القرآن 288
مولانا امین احسن اصلاحی 289
تدبرِ حدیث 292
مسئلۂ رجم 293
فکرِ فراہی شرقِ اوسط میں 295
استفسارات 296
علالت 299
احوالِ وطن 300
سفرِ حج 304
متفرق 310

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ

کے نام سے شروع کرتا ہوں
جو بڑا ہی مہربان
نہایت رحم کرنے والا ہے

Marfat.com

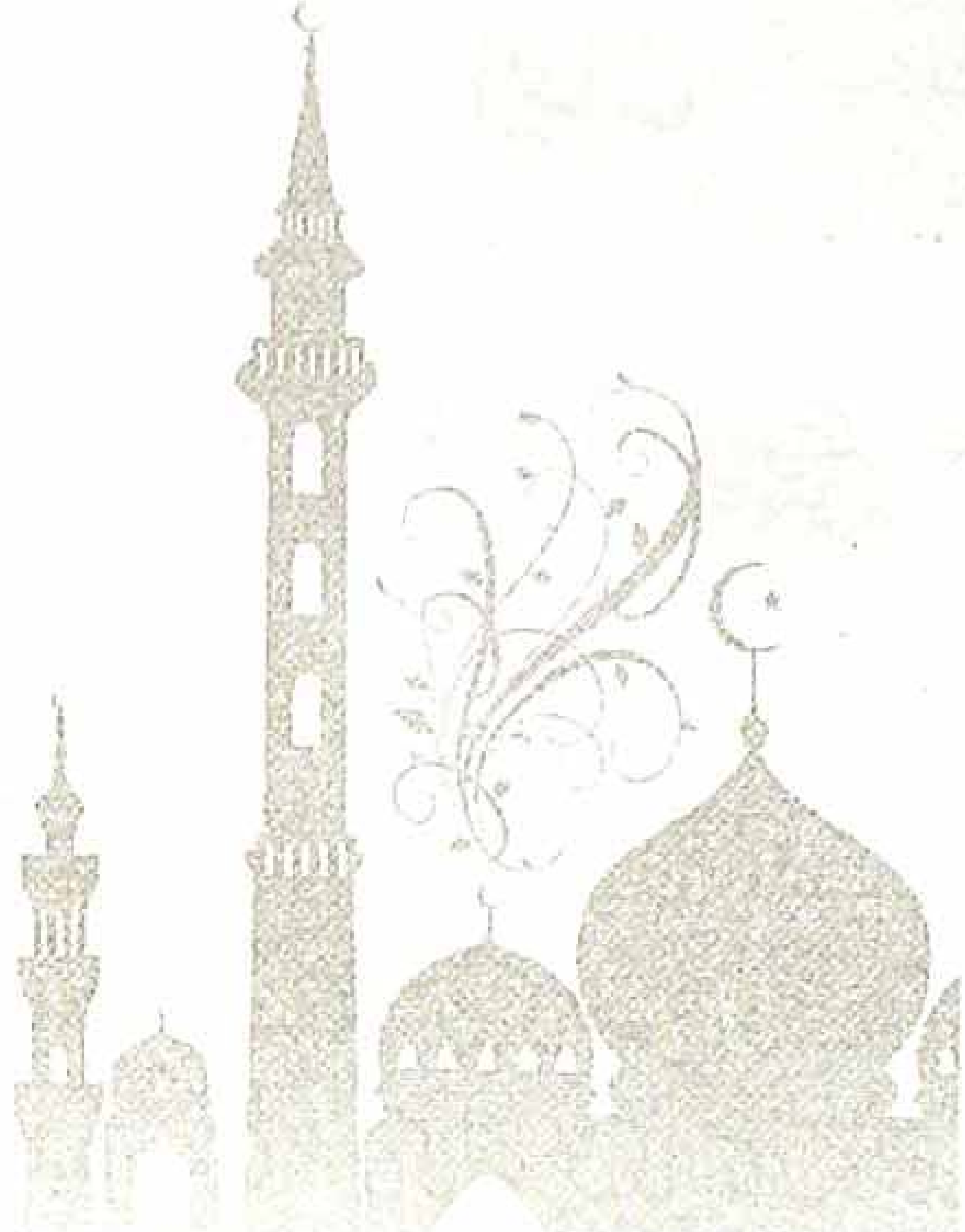

افاداتِ فراہی

باب ہفتم

- ایمان
- معجزہ کی حقیقت
- نماز کی حقیقت
- احکامِ رسول کا قرآنِ مجید سے استنباط
- حکمتِ صوم وجہاد
- قرآن کا طرزِ استدلال
- نبی اور مقامِ رسالت
- توحید پر قرآن کا استدلال
- عقیدۂ شفاعت
- اعمال کی جزا اور سزا کا تصور

Marfat.com

ایمان

ایمان کی اصل امن ہے اور اس کے معنی اعتماد کرنا، کے ہیں۔ یہیں سے لغت میں یہ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

((امنه ای اعطاه امنا)) ''اس کو امن دیا''۔

قرآن میں ہے: ﴿وَ اٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴾ ''اور ان کو خوف سے امان دی۔'' (قریش : 4)

((امن له۔ صدقه و اعتمد علیه)) ''اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا۔''

((امن به۔ صدقه و ایقن به)) ''اس کی تصدیق کی اور اس کا یقین کیا۔''

قرآن مجید میں یہ لفظ ان تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ اس کے مشتقات [1] میں سے ''مومن'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔

یہ ایک قدیم دینی اصطلاح ہے۔ عبرانی زبان میں ''اَمَـنَ'' کا مادہ موجود ہے اور اس کے معنی صدق و اعتماد کے آتے ہیں۔ اسی سے ''آمین'' کا لفظ پیدا ہوا جو تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے اور اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔

ایمان محض یقین کا نام نہیں۔ ایمان کا مطلب ایک چیز کی تصدیق کرنا اور اسے مان لینا ہے، چناں چہ اس کا ضد تکذیب، انکار اور کفر ہے لیکن یقین کا ضد ظن اور شک ہے، اس وجہ سے یہ ضروری نہیں کہ جو شخص یقین رکھتا ہو وہ تصدیق بھی کرے۔ عین ممکن ہے کہ یقین رکھنے کے باوجود ایک آدمی محض سرکشی اور غرور کی بنا پر کسی چیز کی تکذیب کر دے جیسے فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰیٰتُنَا مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۳﴾ وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (النمل : 13-14)

''پس جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں آئیں، انھوں نے کہا: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے! اور ان کا انکار کیا محض ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے حالاں کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کیا، پھر دیکھو ان فسادیوں کا انجام کیا ہوا۔''

---

[1] مشتقات: مشتق کی جمع۔ ''مُشْتَقٌّ'' کے معنی ہیں: پھاڑا ہوا، کسی لفظ سے اخذ کیا ہوا۔

Marfat.com

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو ایمان رکھتا ہو لازماً یقین بھی رکھتا ہوگا کیوں کہ بسا اوقات آدمی ظن غالب کی بنا پر ایمان لے آتا ہے، بعد میں اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیتا ہے تو وہ ظن کی حالت سے نکل آتا ہے۔ تاہم کمال ایمان اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب یقین حاصل ہو۔

قرآن مجید نے ایمان کے بعض ضمنی پہلو بھی واضح کیے ہیں، مثلاً یہ کہ ایک مومن صرف اللہ پر توکل کرنے والا ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝٢﴾ (الانفال: 2)

''یہ بات ان کا ایمان زیادہ کرتی ہے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''

دوسرے یہ کہ ایمان چوں کہ مضبوط اعتقاد کا نام ہے اس لیے لازماً یہ عمل پر ابھارتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝٣﴾ (البقرہ: 3)

''وہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم وشرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے اور اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے، وہ مومن ہے۔

ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور عقائد واعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پس قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ شخص ہوا جو خدا کا خالص ومخلص بندہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام وآیات پر یقین واطاعت کی اس کیفیت کے ساتھ مضبوط ہے جس کی بنیاد رضا ومحبت پر ہے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان کی کوشش کے لحاظ سے درجے اور مناصب عطا فرماتا ہے۔ جو روح پاکیزگی اور طہارت کی راہ میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے، تقرب الٰہی کے مقامات ومنازل میں اسی قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور چوں کہ روح کی ترقی کی دو راہیں ہیں: ایک علم وعمل کے اندر سے ہو کر نکلی ہے، دوسری قلب وارادہ کے اندر سے۔ اس لیے علم وعمل کی راہ میں اس کا ہر قدم اس کو ہدایت وتقویٰ سے قریب تر کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۝١٧﴾ (محمد: 17)

''اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت (یعنی علم) میں افزونی بخشی اور ان کے

Marfat.com

حصہ کی پرہیز گاری ان کو عطا فرمائی۔''

پس ہر علم نافع اور عمل صالح ہدایت وتقویٰ کا دروازہ کھولتا ہے اور علم وعمل کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مثلاً فرمایا:

﴿وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات: 14)

''اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔''

یعنی تمھارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، اس لیے کہ اس نے علم سے ارادہ اور قول سے عمل کی شکل ابھی نہیں اختیار کی۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (المجادلة: 22)

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمادیا ہے اور اپنی طرف سے ایک فیضانِ خاص سے ان کی تائید فرمائی ہے۔''

یہ ان لوگوں کی باہمی محبت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش میں لانے والی چیز ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرہ: 165)

''اور جو (خدا پر) ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝۶۵﴾ (النساء: 65)

''پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کردو اس پر، اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں۔''

یعنی جس نے اپنے نفس اور اپنے تمام عزائم واعمال کو پوری طرح اللہ کے حوالے نہ کردیا وہ پکا مومن نہیں ہے، کیوں کہ ایمان جن عقائد واعمال کا مجموعہ ہے، ان میں سے اس نے چند پورے کیے ہیں، تمام پورے نہیں کیے۔ اسی مفہوم کی آیت یہ بھی ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ (الانفال: 2-4)

Marfat.com

''مومن تو وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان کو اس کی آیتیں سنائی جاتی ہیں، ان کے ایمان میں اضافہ کردیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے مندرجہ ذیل اوصاف گنائے ہیں:

- اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں پر خشیت طاری ہوجاتی ہے۔
- آیات الٰہی کے سننے سے ان کا ایمان بڑھتا ہے۔
- اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
- نماز قائم کرتے ہیں۔
- راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ سچے اور راستباز مومن ہیں۔

اسی کے مشابہ ایک اور آیت ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾﴾ (الحجرات: 15)

''مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہیں پڑے اور جنھوں نے اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔''

آیت ذیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے:

﴿أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا ۚ لَّا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾﴾ (السجدہ: 18)

''تو کیا وہ جو مومن ہے اس شخص کے مانند ہوجائے گا جو نافرمان ہے؟ دونوں برابر نہیں ہوسکتے!''

دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومن کو فاسق کا ضد قرار دیا اور تصریح کے ساتھ فرمایا کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں ایمان کے بعد جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے ﴿آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ وہ درحقیقت تفصیل یا نتیجہ کے طور پر آتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ صحیح تصور کا نتیجہ صحیح تصدیق ہے اور صحیح تصدیق کا ضروری نتیجہ درستیٔ عمل ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے حالاں کہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ یہودیوں کے دعوائے ایمان اور نافرمانیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا:

﴿بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾﴾ (البقرہ: 93)

''اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمہارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا ہے۔''

Marfat.com

یعنی تمھارا دعوائے ایمان غلط ہے اور اس ایمان کو ایمان کہنا تمھاری ہی اصطلاح ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور اس نام کے ایمان سے کیسی کچھ نالائقیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے ہیں: ایک قول، دوسرے عمل۔ چوں کہ قول بھی جھوٹ ہوسکتا ہے، اس لیے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن قرار نہیں دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے دعوائے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی اصل کسوٹی ہے۔ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا﴾ (النساء: 136)

''اے ایمان والو، (عمل سے) ایمان لاؤ۔''

اسی کے مثل دوسری جگہ ہے:

﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (العنکبوت: 2-3)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے؟ اور بے شک ہم نے آزمایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کی پہچان کرائے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کی بھی پہچان کرائے گا۔''

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ سچا مومن وہ ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں کا جامع ہو۔

ایمان کے ایک معنی چوں کہ ایقان کے بھی ہیں، قرآن مجید میں اس معنی کے استعمال سے بعضوں کو خیال ہوا کہ معتبر و حقیقی ایمان یہی ایقان ہے اور یہ ایک یقین محض کی حالت ہے۔ اس وجہ سے اس میں عمل سے کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی۔ یقین اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں، پس عمل یقین کا جزو کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہی رائے ہے جو ایمان و عمل کے باب میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اختیار فرمائی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بالکل علیحدہ نوعیت رکھتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک قاضی وفقیہ ان مسائل کو دیکھتا ہے یا جس نگاہ سے امیر اسلام وراثت ونکاح اور خراج وجزیہ وغیرہ کے معاملات اور سیاسی مسائل کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ قانون وسیاست کی نگاہ ہے جو حکمت وفلسفہ کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے اور مسلمانوں کے شعار اور ان کے ظاہری حالات میں ان کے طریقے پر ہو۔ ایسے اشخاص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہیں۔ ان میں صادق وکاذب اور متقی وفاجر کی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس قانونی ایمان میں سب برابر ہوں گے۔ اس میں کمی وبیشی نہیں واقع ہوتی کیوں کہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندہ کے درمیان کے باطنی احوال ومعاملات کی جستجو نہیں کیا کرتی۔ یہ معاملات صرف قیامت کے دن بے نقاب ہوں گے۔ پس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے

Marfat.com

اس بحث میں ایمان سے اس کے خاص مفہوم ایقان کو مراد نہیں لیا ہے بلکہ مجرد اقرار واظہار کو مراد لیا ہے یعنی ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول وعمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا؟ یہ سوال نہ تھا کہ علم وعمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا۔ اگر سوال مؤخر الذکر صورت میں ہوتا تو اس کا جواب محض ایک ہی ہوتا کیوں کہ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ایمان علم وعمل دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک قلبی وروحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد واعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتا ہے اسی طرح اعمال سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رکن ہیں: ایک علم دوسرا عمل۔ ان میں سے اگر ایک کو بھی گرا دو گے، اس کی پوری عمارت گر جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول وفروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اس کے لیے اس ایمان سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔ جہاں تک نفس علم ویقین کا تعلق ہے، ابلیس کچھ کم نہ تھا تاہم وہ مومن نہ تھا۔ ایسا یقین معتبر نہیں۔ اس قسم کا یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب اور بڑھتا ہے۔ فرعون اور اس کے ساتھی بھی یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یقین ایمان نہ تھا۔

(یہ مضمون مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تصانیف مفردات القرآن، تفسیر سورہ العصر اور تفسیر سورہ اخلاص سے مرتب کیا گیا ہے۔)

شفاعت

اللہ تعالیٰ نے شفاعت سے متعلق لوگوں کے خود ساختہ عقیدہ کو باطل ٹھہرایا ہے جو ایک بندے کو دوسرے بندے سے بمقابلہ اللہ کے زیادہ قریب کرے اور یہ چیز شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی شفاعت کی توثیق کی جو بندہ کو اس سے قریب کرتی ہے۔ اس طرح پہلے وہ اس کی رضا کا طالب بنتا ہے۔

(تعلیقات، البقرہ:255)

شفاعت کے گمان میں رہنا اللہ کی رحمت کا انکار کرنا ہے۔ چوں کہ اس کی رحمت ہر چیز کو محیط ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور سب کی پکار سننے والا ہے اس لیے اس کے بجائے کسی اور کا دامن تھامنا اس کی رحمت پر پورا ایمان نہ رکھنے کے مترادف ہے۔ نیز بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عدل کا جو معاملہ رکھا ہے اس کا بھی انکار ہوتا ہے۔ مزید برآں اس کے علم، حکمت اور اپنے فیصلوں میں اس کے مختار کل ہونے کی بھی اس سے نفی ہوتی ہے۔

(حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ انعام)

Marfat.com

نماز کی حقیقت

نماز کی سب سے نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے۔ جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات اور گفتگو کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے داہنے بائیں کسی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ نماز نہ صرف ذریعہ تقرب ہے بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے: ﴿وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ﴾ ''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔'' اسی لیے نماز راس العبادات قرار پائی۔ صلوٰۃ کا اصل مفہوم (اَلْاِقْبَالُ اِلَی الشَّیْءِ) ''کسی شے کی طرف بڑھنا اور لپکنا'' ہے۔ یہی مفہوم رکوع، تعظیم، تضرع اور دعا کا بھی ہے۔ صلی النار کے معنی ہیں: ''وہ آگ کی طرف بڑھا'' یا ''آگ میں داخل ہوا۔'' قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

﴿سَيَصْلٰى نَارًا﴾ (اللھب: 3)

''وہ آگ میں داخل ہو گا۔'' اور

﴿وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ۝١٢﴾ (الانشقاق: 12)

''وہ جہنم میں داخل ہو گا۔''

اسی اصل سے تصلیة کا لفظ ہے۔

﴿وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝٩٤﴾ (الواقعة: 94)

''اور جہنم میں داخل کیا جانا۔''

صالی اس شخص کو کہتے ہیں جو آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو۔ یہی لفظ اس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو آگ میں گھس جائے۔ ''گھڑ دوڑ کا وہ گھوڑا جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہلاتا ہے۔ ان مشتقات کی روشنی میں میرا خیال یہ ہے کہ عربی میں صلوٰۃ کا اصل مفہوم قربتِ قریبہ کا ہے۔ یہ کلمہ نماز و عبادت کے لیے بہت قدیم سے مستعمل ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے لیے اور عبرانی میں نماز اور رکوع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

نماز کی تاریخ:

عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم اور فطرت انسانی میں سب سے زیادہ اترے ہوئے دو طریقے ہیں: ایک نماز، دوسرا قربانی۔ سجدہ، رکوع اور نذر اظہار بندگی کے وہ مقبول عام طریقے ہیں جو ہر قوم و ملت میں، عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی، اس نے کسی روح یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان

Marfat.com

کو معبود بنایا ہو، عام رہے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مہذب اور وحشی قوموں اور برحق اور گمراہ جماعتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے تاہم نماز اور قربانی کی مقبول و محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل میں، خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو، ہر جماعت میں پائی گئی ہے۔ جس طرح معبود کے ایک عام مفہوم میں، باہمہ گر متفق ہونے کے باوجود خود معبود کے بارے میں قوموں کے آراء و معتقدات نے الگ الگ راہیں اختیار کر لیں، اسی طرح نماز اور قربانی میں بھی صرف مشترک حقیقت پر سب کا اتفاق رہا، ان عبادات کی شکلیں ہر ایک کے یہاں مختلف سانچوں میں ڈھل گئیں۔ قرآن مجید میں ترکِ نماز کی وجہ سے بعض قوموں کی گمراہی کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ﴾

(مریم: 59)

''پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ تو یہ لوگ بہت جلد اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔''

یہود کے ہاں خدا کے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ قربانی سمجھا گیا ہے۔ انھوں نے نماز کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ نصاریٰ کا حال یہود کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف نماز ہے، قربانی کا کوئی ذکر نہیں۔ امت مسلمہ کے لیے یہ دونوں عبادتیں یکجا کی گئی ہیں اور خدا نے ان کے فلسفہ اور ان کی عظمت کو پوری طرح واضح کیا ہے۔

نماز کی حقیقت جاننے کی اہمیت:

نماز کی ایک محض شکل ہے اور ایک اس کی روح۔ اگر ہم نماز کی حقیقت سے واقف ہو سکیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم نماز کی پوری پوری حفاظت کر سکیں گے کیوں کہ روح سے خالی نماز ایسی نہیں کہ آدمی اسی پر قناعت کرے۔ اس کی مثال تو محض ایک چھلکے کی ہے جس کے اندر کوئی گودا نہ ہو۔ البتہ اس طرح کی نماز کو سرے سے ترک کرنے کا فیصلہ کر لینا صحیح نہیں۔ ترقی کی امید اور کوشش کے ساتھ اس کو باقی رکھنا ضروری ہے۔

نماز کی حقیقت سے واقف ہونے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے علم میں وہ باتیں آ جاتی ہیں جن کا نماز سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ پس وہ نماز کو باطل کرنے والی ان چیزوں سے الگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح وہ ان چیزوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے جو نماز سے موافقت رکھتی ہیں۔ نتیجتاً وہ ان کو اختیار کر کے اپنی نماز کو بہتر بنا سکتا ہے، مثلاً قرآن میں آیا ہے:

﴿اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ (البقرة: 153)

''مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔''

اس آیت میں واوِ بیان کے لیے ہے معلوم ہوا کہ صبر نماز سے موافقت رکھنے والی ایک صفت ہے۔

نماز کی حقیقت سے واقف ہونے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جس طرح ہم حرارت یا برودت سے آگ کے ہونے یا

Marfat.com

نہ ہونے کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی طرح نماز کی موافق ومخالف علامات کے ذریعہ سے ہم روح نماز کی موجودگی یا غیر موجودگی کا تعین بھی کر سکتے ہیں، مثلاً جس شخص کی نماز میں خشوع نہ ہو اس نے گویا نماز کی حقیقت کو ملحوظ نہ رکھا، کیوں کہ قرآن میں آیا ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝﴾ (المومنون: 1-2)

''فائز المرام ہوئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے ہیں۔''

نماز کی حقیقت:

اسلام میں نماز کا جو مقام ہے اس کے پیش نظر تو میرا خیال ہوتا ہے کہ نماز ہی کو اصل دین قرار دوں لیکن اپنی بات کو سمجھانے کی خاطر میں اسی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہوں کہ نماز شریعت کا اولین حکم، توحید کا مظہر اور اس کی گواہی ہے۔ یہ ایمان کے بعد راہ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے، یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے، اسی سبب سے یہ شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار پائی ہے۔ ذیل کی دو آیات میں دیکھیے کہ توحید کی دعوت کے بعد نماز کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: 111)

''اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔''

﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

(المدثر: 1-5)

''اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور (لوگوں کو) خبردار کر! اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر! اور اپنے دامن کو پاک رکھ! اور ناپاکی کو چھوڑ۔''

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی مرتبہ کوہ طور پر مخاطب کیا تو توحید کی معرفت بخشنے کے بعد نماز ہی کا حکم دیا:

﴿فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝﴾

(طٰہٰ: 13-14)

''جو وحی کی جارہی ہے اس پر کان دھرو! بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔''

Marfat.com

☆......نماز اس عہد کی یاددہانی ہے جو ہم نے خدا سے خالص اسی کی عبادت کے لیے کر رکھا ہے۔تخلیق کی اصل یہی ہے کہ خالق کی عبادت کی جائے، اسی لیے خدا کی تمام مخلوقات اس کی عبادت میں مصروف ہے۔نماز اسی عبادت کا مغز ہے اور اس کی تعبیر تسبیح کے لفظ سے کی جاتی ہے۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات تسبیح میں مصروف ہے یعنی اپنی اپنی نماز کی ادائیگی کیا کرتی ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

(بنی اسرائیل : 44)

”ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ، اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ﴾

(النور : 41)

”دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے! ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے۔“

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔

☆......نماز کا حکم خدا کے ساتھ ہمارے اس عہد کا بھی ایک تقاضا ہے جس کے تحت ہمیں اسی کے ذکر میں مصروف رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس عہد کا بیان قرآن مجید میں یوں ہوا ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرہ : 152)

”تو تم مجھ کو یاد کرو، میں تم کو یاد کروں گا۔“

ایک اور جگہ آتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝٤١ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝٤٢ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝٤٣﴾

(الاحزاب : 41-43)

”اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور وہ مومنین پر نہایت مہربان ہے۔“

Marfat.com

یعنی جس طرح تم اس کو یاد کرتے ہو اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو، اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمھاری روشنی بڑھتی ہے۔

اس ذکرِ الٰہی کی جو شکل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ نماز ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰهٰ: 14)

''اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔''

﴿وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵﴾ (الاعلیٰ: 15)

''اور اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔''

خدا کے ساتھ ہمارے اسی عہد کا نتیجہ ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیے گئے ہیں اور کسی حالت میں بھی اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ چوں کہ اس امت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا عہد نماز کے ذریعے سے قائم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا رشتہ اسی وقت تک مضبوط رہے گا جب تک ہم نماز پر مضبوطی سے قائم رہیں گے۔ اسی وقت تک ہم اپنے دشمنوں پر غلبہ پائیں گے اور اس دشمن ازلی (شیطان) سے بھی مامون رہیں گے جو ہمارے اپنے پہلو میں موجود ہے۔

☆......نماز رب واحد کا شکر ہے۔ بندہ اپنی دعا میں اگر خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو یہ کفر ہے، اسی طرح اگر نماز ترک کر دی جائے اور خدا کے ذکر سے منہ موڑ لیا جائے تو یہ بھی کفر ہے۔ بعض جگہ تو قرآن مجید میں نماز کو تعبیر ہی شکر کے لفظ سے کیا گیا ہے، مثلاً:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ﴾

(البقرہ: 152-153)

''تو تم مجھے یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر کرتے رہو، میری ناشکری مت کرنا۔ اے ایمان والو! ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔''

یہاں دیکھیے نماز کو شکر سے تعبیر کیا گیا اور نماز اور شکر دونوں کی بنیاد صبر کو قرار دیا گیا۔ یہ شکر خاص طور پر ہمارے اوپر اس لیے واجب ہے کہ خدا ہی نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ اس موقع پر شیطان نے جو کردار ادا کیا وہ یہ تھا کہ اس نے تکبر اور خود پسندی کی بنا پر خدا کا حکم نہ مانا اور آدم کو سجدہ نہ کیا۔ اب اگر ہم نماز کو ترک کر دیں تو ہمارا یہ کفر شیطان کے کفر سے تین لحاظ سے زیادہ ہوگا۔ ایک اس لیے کہ نماز ہماری فطرت ہے، دوسرے اس لیے کہ ہم نے خدا سے اسی کی عبادت کرنے کا عہد کر رکھا ہے، اور تیسرے اس لیے کہ خدا کا شکر ادا کرنا ہمارے اوپر اس لیے واجب ہے کہ اس نے ہمیں فرشتوں سے سجدہ کروایا۔

☆......نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے اس

Marfat.com

میں معاد ❶ کی ایک جھلک پائی جاتی ہے، گویا بندہ جس وقت نماز میں کھڑا ہوتا ہے اس وقت وہ خدا کے سامنے اپنی حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ نماز انسان کو اس کا مبدا بھی یاد دلاتی ہے جو کمال اطاعت اور عبادت گزاری پر مشتمل تھا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (الاعراف: 29)

''اور ہر مسجد میں اپنا رخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو، اپنی اطاعت کو اس کے لیے خاص کرتے ہوئے، جیسا اس نے تمھیں پہلے پیدا کیا، تم پھر لوٹائے جاؤ گے۔''

نماز کی آخرت کے ساتھ اسی مشابہت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ آخرت کے ایک منکر کے لیے نماز کی ادائیگی گراں گزرتی ہے، لیکن جن لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے اعمال و اقوال کی جوابدہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور گناہوں سے تائب ہو کر لازماً اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جاتے ہیں اور جو خشیت اور پستی خدا کے سامنے آخرت میں ان پر طاری ہونے والی ہے اس کا عکس دنیا ہی میں ان پر نظر آنے لگتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور کریں:

﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (البقرة: 45-46)

''اور بے شک یہ (نماز) گراں ہے، مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں۔ جن کو گمان ہے کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک دن وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾﴾ (النور: 37)

''ان میں ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے، نماز قائم کرنے سے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے اندیشہ میں مبتلا رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں سب مضطرب ہوں گے۔''

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن جب ہم کو پکارے گا تو ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگیں گے۔

﴿يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾﴾ (بنی اسرائیل: 52)

''جس دن وہ تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے اور خیال کرو گے کہ تم بس تھوڑی ہی مدت رہے۔''

---

❶ معاد: آخرت، حشر، عاقبت، لوٹ کر جانے کی جگہ، قیامت۔

Marfat.com

بالکل اسی طرح نمازی نماز کی طرف لپکتے ہیں اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں۔

☆......نماز تقرب الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قربت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے۔ نماز کی سب سے نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے۔ جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ داہنے بائیں کسی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝﴾ (العلق: 19)

''اور سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔''

نماز کی حالت میں اللہ کی نظرِ رحمت نمازی کو نوازتی ہے۔ اس کا سینہ انوار و تجلیات الٰہی سے جگمگا اٹھتا ہے اور اس کی روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی جاتی ہے، زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے:

''بندہ نوافل کی راہ سے برابر میری طرف بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔''

حقیقت میں یہ روحانی زندگی حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

☆......نماز نفس انسانی کی بہیمیت کے توڑنے کی ایک تدبیر ہے۔ نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز ہی سے کچلا جا سکتا ہے کیوں کہ خشوع نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور خدا کے جلال و جبروت اور اس کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں، ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا رہتا ہے۔ فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾

(الفتح: 29)

''محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو دیکھو گے رکوع اور سجدہ میں۔''

☆......نماز اور صبر توام ہیں اور نماز صبر کی حقیقت ہے، اسی لیے صلوٰۃ کا لفظ اکثر صبر کے بدل کے طور پر آیا ہے، مثلاً:

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ: 45)

''اور مدد چاہو صبر اور نماز سے۔ اور بے شک یہ (نماز) گراں گزرتی ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

Marfat.com

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (البقرۃ: 153)

''اے ایمان والو! مدد چاہو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں صبر اور صلوٰۃ کو ایک دوسرے کے بجائے استعمال کیا ہے۔ پہلی آیت میں نماز کا ذکر کیا اور اسے صبر پر مشتمل قرار دیا۔ دوسری آیت میں صبر کا ذکر کیا اور نماز کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ ان دونوں کے باہمی تعلق کی وجہ یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے وعدہ پر پورا بھروسہ کر کے نماز کی پابندی کرتا ہے، اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی ہے جو شب و روز اپنے لگائے ہوئے پودے کی نگہداشت کرتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، اس کو پانی دیتا ہے، اور اس کے پھل لانے کا منتظر ہے۔ اور دوسروں کی غفلت و سرمستی، اس کی اس سرگرمی وخود فراموشی میں کوئی کمزوری پیدا نہیں کرتی۔ لوگ اس کی امید موہوم پر ہنستے ہیں لیکن وہ خدا کی شکر گزاری اور اطاعت کے جس جادۂ مستقیم پر چل رہا ہے، برابر اس پر سرگرم سفر ہے اور لوگوں کے ہنسنے اور مذاق اڑانے سے اس کی ہمت پست نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک آدمی میں ارادہ کی غیر معمولی پختگی اور انجام کار کی کامیابی کا غیر متزلزل یقین نہ ہو۔

نماز کے مضامین:

نماز کی ابتدا ثنا سے ہوتی ہے۔ یہ ثنا سورہ فاتحہ کی ثنا سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ نماز کی ثنا کے چار کلمات ہیں:

(1) سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ — اے اللہ تو پاک اور تعریفوں والا ہے۔

(2) وَتَبَارَكَ اسْمُكَ — اور تیرا نام بابرکت ہے۔

(3) وَتَعَالٰى جَدُّكَ — اور تیرا مرتبہ بلند ہے۔

(4) وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ — اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

ان میں سے پہلا کلمہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ ﴾ ''شکر حقیقی کا سزاوار اللہ ہے، تمام کائنات کا رب'' کی وضاحت کرتا ہے۔ دوسرا کلمہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ ﴾ کی تفسیر ہے کیوں کہ برکت بھلائی کی کثرت کو کہتے ہیں اور خدا کا اسم رحمان تخلیق کی بنیاد اور اسم رحیم مغفرت اور حسن عاقبت کی بنیاد ہے۔ گویا ہر برکت خدا کی صفت رحمت سے حاصل ہوتی ہے۔ تیسرا کلمہ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ ﴾ ''مالک ہے روز جزا کا'' کے مفہوم کی وضاحت ہے۔ اسی لیے حدیث قدسی میں آتا ہے کہ جب بندہ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ ﴾ کے الفاظ منہ سے نکالتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے: (مجدنی عبدی) ''میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب یہ الفاظ کہتا ہے تو اپنا یوم آخرت کا معاملہ خدا کی رحمت کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ امید کرتا ہے کہ خدا اتنا بڑا اور فیاض ہے کہ اس کے اعمال کے لحاظ سے اس کا حساب نہیں لے گا بلکہ اس پر رحم فرمائے گا اور اس کے گناہوں سے درگزر فرمائے گا

Marfat.com

کیوں کہ وہ تمام فیاضوں میں سب سے بڑا فیاض اور تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

چوتھے کلمہ کی مطابقت آیت ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' کے ساتھ بالکل واضح ہے۔

ثنا کے بعد تعوذ، آیت بسم اللہ اور سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ'' کو شیطان سے پناہ کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اپنے نام کو بھول چوک سے (جو شیطان ہی کی جانب سے ہوتی ہے) امان کا ذریعہ بنایا ہے۔

اپنے نام سے آغاز کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں دے دیا تھا، چنانچہ فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝﴾ (العلق: 1)

''پڑھ اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

کیوں کہ کسی شے کا نام اس کی یاد کا واسطہ ہوا کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ کے نام کی یاد ہی درحقیقت اللہ کی یاد ہے اور یہی نماز کی روح ہے۔

سورہ فاتحہ تکمیل نماز کی سورت ہے اور کوئی نماز اس نماز سے زیادہ کامل نہیں ہوسکتی جو ان کلمات پر مشتمل ہو۔ یہ سورہ تمام علوم قرآن کی جامع ہے۔ قرآن بالاجمال تین قسم کے علوم پر مشتمل ہے: توحید، شریعت اور معاد۔ یہ تینوں علوم قرآن میں باہمدگر ملے جلے ہوتے ہیں، علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے بالکل ممتاز اور نمایاں صورت میں نہیں ہوتے۔ سورہ فاتحہ میں بھی ان مضامین کے اجتماع کی نوعیت یہی ہے۔

جہاں تک نماز کی تاریخ معلوم ہے، کوئی نماز ایسی نہیں جو فاتحہ کی روح سے خالی ہو۔ اسی وجہ سے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں۔ اور امت کے حال پر حضور ﷺ کی کیسی بے پایاں شفقت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو نماز بغیر فاتحہ کے ہو، ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے۔ تاکہ لوگوں پر تکمیل نماز کے لیے اس عنصر کی اہمیت اچھی طرح واضح ہوجائے اور اس کو یہود و نصاریٰ کی طرح چھوڑ نہ بیٹھیں۔ ان لوگوں نے اپنی فاتحہ کو چھوڑ کر اپنی نمازوں میں من گھڑت دعائیں داخل کرلیں لیکن اس امت پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل واحسان ہے کہ اس کے اندر کا کوئی گروہ بھی اس سورہ کی عظمت واہمیت سے غافل نہیں ہے۔ جس طرح نمازوں کی تعداد، ان کی رکعات اور ان کے قیام وقعود کے بارے میں سب متفق ہیں، اسی طرح اس سورت کے پڑھنے کے بارے میں بھی تمام مسلمانوں میں پورا اتفاق رائے موجود ہے۔

رکوع وسجدہ کی تسبیحات (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِيْمِ) ''پاک ہے میرا پروردگار عظمت والا'' اور (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی) ''پاک ہے میرا رب بلند وبرتر'' ان کی ہیئت سے پوری پوری موافقت رکھتی ہیں اور علی الترتیب دو سورتوں سورہ الواقعہ اور سورہ الاعلیٰ کی یاد دہانی کراتی ہیں۔

نماز کے خاتمے پر جو اذکار پڑھے جاتے ہیں وہ نماز کے اذکار کے بالکل مطابق ہیں یعنی تینتیس تینتیس مرتبہ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' پڑھنا اور ایک مرتبہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ

۱۲۵۵۰۴

Marfat.com

الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر) ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت ہے، تمام شکر اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر مکمل قادر ہے۔'' آخر الذکر کلمہ تشہد سے مشابہت رکھتا ہے۔

رکعات اور نمازوں کی تعداد:

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ دس کا عدد کمال پر دلالت کرتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾

''یہ دس پورے ہوئے۔ اور ہم نے دس کے ساتھ اس کو مکمل کیا۔''

اس بنیاد پر فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد بشمول وتر شب و روز دونوں میں دس دس رکھی گئی۔ یعنی فجر، ظہر، عصر کی رکعتیں دس ہیں اور مغرب اور عشاء کی دس۔ سنتوں کی رکعات کی تعداد بھی شب و روز میں بیس بنتی ہیں اور اگر اشراق، چاشت اور اوّابین ملا لیے جائیں تو کل تعداد پچاس بنے گی جو دس ہی کا حاصل ضرب ہے۔

ظہر اور عصر کی نمازیں چوں کہ جہری نہیں اس لیے جہری قراءت کو شب و روز میں ہم وزن کرنے کے لیے فجر کی نماز میں طویل قراءت کا حکم دیا لیکن چوں کہ وقت کم ہونے کی وجہ سے طلوع آفتاب کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اس نماز کی رکعات دو ہی رکھیں۔

مغرب کی نماز اول شب میں ہونے کی وجہ سے نماز فجر کے درجے میں ہے۔ اس میں بھی فرض اور سنت کی تعداد کم رکھی۔

عشاء کی نماز ظہر کی نماز کے برابر ہے۔ ظہر کے وقت کی مناسبت سے اس کا اصل وقت وسط شب تھا مگر اس میں امت کی آسانی کے لیے تخفیف کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ عام قاعدے کے لحاظ سے فضلیت اگرچہ اول وقت میں ہوتی ہے لیکن خاص طور پر اس نماز میں تاخیر کو پسند کیا گیا۔ نماز عصر کی مناسبت سے شب کی نماز وتر کا اصل وقت آخر شب تھا لیکن امت کی آسانی کے لیے اسے عشاء کی نماز کے ساتھ ملایا گیا۔

نمازوں کے اوقات:

نمازوں کے اوقات قرآن مجید کی کئی آیات میں واضح کیے گئے ہیں:

سورہ روم میں ہے:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝﴾ (الروم: 17-18)

''پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت صبح کرتے ہو، اور اس کی حمد ہو رہی ہے آسمانوں اور زمین میں، اور عشاء کے وقت اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔''

یعنی آسمان و زمین میں تعریف اللہ کی ذات کو زیبا ہے اس لیے تم بھی اسی کی تسبیح و تحمید کرو۔ اس کے اوقات کی

Marfat.com

وضاحت یوں کی کہ ﴿تُمْسُوْنَ﴾ سے مغرب اور عشاء مراد لیں، ﴿تُصْبِحُوْنَ﴾ سے فجر، ﴿عَشِيًّا﴾ سے مراد عصر اور ﴿تُظْهِرُوْنَ﴾ سے نماز ظہر۔

سورہ طور میں ہے:

﴿وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝۴۸ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝۴۹﴾ (الطور: 48-49)

''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔''

﴿حِيْنَ تَقُوْمُ﴾ ''جب تم اٹھتے ہو'' یعنی سوکر اور آرام و استراحت کرنے کے بعد۔ اس جملے سے تین اوقات مراد لیے، فجر، ظہر اور عصر، رات کو سوکر اٹھنے کے بعد نماز فجر کا وقت، دوپہر کے قیلولہ سے اٹھنے کے بعد ظہر کا وقت، کیوں کہ دوپہر کا قیلولہ عرب کے ہاں معروف تھا جیسا کہ دوسری جگہ ذکر کیا ہے:

﴿وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ﴾ (النور: 58)

''جب تم دوپہر کے وقت اپنے کپڑے اتارتے ہو''

اور دن کو ٹھنڈا کر کے گھر سے کام کاج کے لیے نکلنے سے نماز عصر کا وقت مراد لیا۔ ﴿مِنَ الَّيْلِ﴾ سے مراد ''من آنـاء اللیل'' ہے یعنی ''رات کی گھڑیوں میں''۔ گویا اول شب میں مغرب اور سونے سے پیشتر عشاء کی نماز کا وقت ہوا۔ اور ستاروں کے ڈھلنے کا وقت یعنی آخر شب نماز وتر کا اصل وقت ہے۔

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝۷۸ وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹﴾

(بنی اسرائیل: 78-79)

''نماز کا اہتمام رکھو...... زوال آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک، اور خاص کر فجر کی قراءت کا۔ بے شک فجر کی قراءت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ بیداری تمھارے لیے مزید برآں ہے۔ توقع رکھو کہ خدا تمھیں مقام محمود سے سرفراز فرمائے۔''

اس آیت میں ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے کئی اقوال ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس سے نماز مغرب مراد لیتے ہیں اور ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نماز ظہر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ دونوں اقوال مروی ہیں۔ سلف میں سے بعض لوگوں نے اس سے عصر بھی مراد لی ہے۔ کچھ اقوال ایسے بھی ہیں جو اس لفظ کو ظہر و عصر دونوں پر مشتمل سمجھتے ہیں۔ تاویل کے اس اضطراب [1] سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دُلُـوْكِ کا لفظ ان تمام معانی کا حامل سمجھا گیا ہے اور لوگوں نے اپنے اپنے رجحان غالب کی بنا پر اس سے کوئی وقت مخصوص کر لیا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کے اندر مذکورہ تمام معانی پائے جاتے ہیں اور حقیقت کا علم خدا ہی کو ہے۔ میرے

[1] اضطراب: مختلف مفہوم مراد لینا، اختلاف، علت۔

Marfat.com

نزدیک نماز کے اوقات سورج اور ستاروں کی پوجا کرنے والوں کے اوقات کے خلاف مقرر کیے گئے ہیں اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی متابعت میں ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

﴿اِنِّیْ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ ''میں چھپ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

قرآن نے اسی حکمت کے تحت یہ ہدایت دی کہ:

﴿وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ (الطور: 49)

''رات کے حصوں میں اسی کی تسبیح کرو اور ستاروں کے ڈھلنے پر۔''

اگر یہ قیاس صحیح ہے تو ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ کا مطلب ہونا چاہیے ''جب جب سورج ڈھلے'' چناں چہ سورج کا پہلا ڈھلنا وسط النہار کے بعد ہوتا ہے اور یہ ظہر کا وقت ہے جیسا کہ ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے سمجھا۔ اس کا دوسرا ڈھلنا پہاڑوں اور بلند ٹیلوں سے ہوتا ہے اور یہ عصر کا اول وقت ہے۔ پھر سورج سطح زمین سے ڈھلتا ہے جو مغرب کا وقت ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ سورج کا ایک ڈھلنا اس کے بعد ہوتا ہے جب کہ افق پر اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا، شفق غائب ہو جاتی ہے اور مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ عشاء کا اول وقت ہے۔ پس اس آیت سے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء چاروں نمازوں کے اوقات ثابت ہوئے۔

﴿غَسَقِ الَّیْلِ﴾ کے معانی اور مراد کے تعین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس سے ابتدائے شب مراد لیتے ہیں اور دوسرے ظلمت شب۔ جو لوگ دلوك الشمس سے مراد غروب آفتاب لیتے ہیں وہ ﴿اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ﴾ کے الفاظ کو نماز مغرب پر چسپاں کرتے ہیں کیوں کہ غروب آفتاب سے ظلمت شب تک اسی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ﴿غَسَقِ الَّیْلِ﴾ سے اول شب مراد لیتے ہیں وہ ان الفاظ (دلوك الشمس) کو نماز عصر پر منطبق کرتے ہیں کیوں کہ سورج ڈھلنے سے اول شب تک اسی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ غَسَقِ کے معانی کے تعین میں بھی اسی طرح کا اختلاف ہے جیسا اختلاف دُلُوْكِ کے معانی متعین کرنے میں پایا جاتا ہے۔ میں یہاں بھی جامع معانی اختیار کرنے ہی کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں۔

﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ اور ﴿غَسَقِ الَّیْلِ﴾ سے چار نمازیں مراد لینے کے بعد صرف فجر کا ایک وقت باقی رہ گیا تھا، اس کو ﴿قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ کے الفاظ سے الگ بیان کر دیا اور اس وقت کی نمایاں خصوصیت بھی بتا دی۔

یہ پانچوں اوقات وہ ہیں جن میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے۔ اب صرف تہجد کی نفل نماز باقی رہ گئی تھی جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی حکم دیا گیا۔ پس فرض نمازوں کے بعد اس کا ذکر کیا اور اس کی حکمت بھی بیان کر دی۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیا ہے، اس لیے نماز تہجد ہمارے لیے سنت قرار پا گئی، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

(یہ مضمون مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تصانیف مفردات القرآن اور تفسیر سورۂ کوثر سے مرتب کیا گیا ہے۔)

☆......☆......☆

Marfat.com

حکمتِ صوم وجہاد

حکمت صوم:

روزے کا اثر جسمانی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی۔ اس کے جسمانی اثر سے اہل عرب چوں کہ خوب واقف تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے روحانی پہلو...... یعنی تقویٰ، پاکیزگی نفس کے اہتمام اور فقراء کے ساتھ ہمدردی...... کو ان کے لیے نمایاں کیا، اور اس مقصد کی خاطر ''تقویٰ'' کا لفظ استعمال کیا۔ کیوں کہ یہ لفظ روزے کی اصل حقیقت اور اس کے بارے میں اہل عرب کی سابقہ معلومات سے قریب تر تھا۔ اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے ان کی باقاعدہ تربیت کیا کرتے تھے تاکہ مشکل پیش آنے پر وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کرسکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تُند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے کیوں کہ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں، جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آجائے، بڑی کام آنے والی ہے۔

جریر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ظللنا بمستنا الحرور کاننا لدی فرس مستقبل الریح صائم

''ہم لو کے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو بادِ تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو۔''

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اسے بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہل عرب تشبیہ کے لیے انہی چیزوں کو استعمال کرتے تھے جو ان کے عام تجربے میں آئی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

شعر میں لفظ ''لـدی'' کا استعمال معنی خیز ہے کیوں کہ اس سے مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ وہ خود بھی اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا تھا اور چوں کہ یہ بات عام تجربے کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنا گھوڑا لیے کھڑا ہو اور اس کا رُخ گھوڑے کے رُخ سے مختلف ہو، اس لیے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تربیت میں اہل عرب خود بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔

الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں بہت اشعار ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب گھوڑوں کے لیے روزے کی افادیت سے خوب واقف تھے اور اس مفہوم کی تعبیر کے لیے ''صـوم'' ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے چناں چہ اللہ تعالیٰ نے بھی روزے کو ''صوم'' ہی سے تعبیر کیا۔ یوں بھی روزے کی عبادت کے لیے صوم کا لفظ ان

Marfat.com

کے ہاں پہلے سے مستعمل تھا کیوں کہ انھوں نے اپنے ملک کے یہود ونصاریٰ کو روزہ رکھتے دیکھا تھا۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جسمانی پہلو سے روزے کی حکمت عربوں کی نظروں سے اوجھل نہ تھی البتہ اس کے دینی اور روحانی پہلو کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے اس گمان باطل کی تردید کر دی کہ روزے کا مقصد ایذائے نفس ہے اور اس بات کی تصریح کر دی کہ اس کا مقصودِ اصلی طہارت اور پاکیزگی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مسلمانوں کو روزوں کا حکم اسی زمانے میں دیا گیا جب ان پر جنگ وجہاد فرض کیے گئے۔ چناں چہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے روزے کی حکمت اس پہلو سے خوب عیاں ہوگئی کہ دراصل یہ مصیبت ومشقت برداشت کرنے کی مشق ہے۔ یہیں سے روزے اور جہاد کی باہمی مناسبت کے بارے میں بھی اصل حقیقت تک پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ رہا کیوں کہ جنگ کے لیے اس طرز کی تربیت کی ضرورت کا انھیں پہلے سے احساس تھا۔ البتہ ہم لوگ چوں کہ اس پس منظر سے ناواقف تھے اس لیے روزے اور جہاد کی باہمی مناسبت بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل رہی۔ اسی سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر قرآن کا نظم اور آیات کی باہمی مناسبت خوب عیاں تھی۔ اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اپنے اصل موضوع ''حکمت صوم'' کی طرف لوٹتے ہیں۔

حیوانات ہوں یا نباتات، ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ ان کی قوی ترین جنسیں لمبے وقفوں کے بعد خوراک کی طرف رغبت کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس کمزور جنسیں چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد غذا کی طرف لپکتی ہیں۔ ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں بھی اس فرق کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک ایسا واضح امر ہے کہ اس کی طرف اشارہ ہی کافی ہے اور تفصیل کے طالبوں کو گہرے مشاہدے اور حیوانات اور نباتات کے احوال اور عادات پر لکھی گئی کتابوں سے مزید شواہد مل جائیں گے۔ اگر ایک انسانی فرد کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی دیکھنے میں آئے گا کہ جوں جوں اس کی قوت، جنینی حالت سے لے کر جوانی تک بڑھتی جائے گی، کھانوں کے درمیان وقفہ بھی بڑھتا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کھانوں کے درمیان وقفے کا بڑھنا اور قوت میں اضافہ لازم وملزوم ہیں۔

اقوام عالم کی عادات واطوار کے مطالعے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چناں چہ مشہور انگریزی فلسفی لاک نے ''تعلیم وتربیت'' پر اپنی کتاب میں قدیم یونانیوں اور رومیوں کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ دن رات میں ایک ہی مرتبہ کھایا کرتے تھے اور اگر کبھی ایسی ہی حاجت ہوتی تو ایک آدھ خشک ٹکڑے سے افطار کر لیتے۔ اس ابتدائی عہد میں ان کی قوت اور شجاعت کا سب کو اعتراف ہے البتہ جب خوشحالی نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا تو ان کا نام ونشان مٹ گیا۔

اہل عرب کے ہاں بھی اسی قسم کا دستور تھا بلکہ وہ اس ریاضت میں دوسروں سے کچھ آگے ہی تھے۔ جہاں تک مجبوری کی حالت میں بھوک برداشت کرنے کا تعلق ہے تو یہ محتاج بیان نہیں۔ رہا جان بوجھ کر اور تسکین کی مقدرت رکھتے ہوئے مشق کی خاطر بھوکا رہنا، تو اس کی تربیت وہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں ہی کو نہ دیتے تھے، جیسا کہ ہم بیان

Marfat.com

کر چکے ہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو بھی اس مشقت میں برابر کا شریک کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھوکا پیاسا رہنا ان کے لیے مشقت ہی نہ رہی تھی کیوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اس حد تک خوگر بنا لیا تھا کہ اس نے ان کے لیے ایک مستقل عادت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کرتے تھے تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ عادت ان کے ہاں قابل تعریف سمجھی جاتی تھی اور وہ لوگ جن کا حال اس کے برعکس ہوتا، وہ ان کے طعن کے تیروں کا نشانہ بنتے۔

تأبّط شرًّا ❶ نے یہ باتیں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ دوسرے عرب شعراء کے ہاں بھی دھنسے ہوئے پیٹ کی تعریف اور بڑھی ہوئی توند کی مذمت میں بکثرت اشعار ملیں گے۔ حسین بن مطیر کہتا ہے ؎

رأت رجلا اودی یوافر لحمه   طلاب المعالی واکتساب المکارم

''اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پُر گوشت جسم کو اولوالعزمی اور شرف کے کارناموں نے سکھا کر رکھ دیا۔''

خفیف الحشا ضَرْبًا کان ثیابه   علی قاطع من جوهر الهند صارم

''وہ ہلکا پھلکا اور چھریرے بدن کا ہے، گویا اس کے کپڑے ایک اصیل جوہر دار تلوار کو پہنا دیے گئے ہیں۔''

فقلت لها لا تعجبین فاننی   اری سمن الفتیان احدے المشاتم

''تو میں نے اس سے کہا: ''اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ جوانمردوں کے لیے موٹاپا بہت بڑا عیب ہے۔''

عوراء بنت سبیع اپنے بھائی عبداللہ بن سبیع کے مرثیے میں کہتی ہے ؎

طیان طاوی الکشح لا   یرخی لمظلمته إزاره

''وہ بھوکا رہنے والا ہے، اس کا پیٹ اس کی پیٹھ سے لگا ہوا ہے، وہ کسی مصیبت کے آنے پر بدحواس نہیں ہوتا۔''

یعصی البخیل اذا اراد   المجد مخلوعا عذاره

''وہ جب سخاوت اور فیاضی کا تہیہ کر لیتا ہے تو بخیل کے مشوروں سے یوں منہ موڑ لیتا ہے گویا کہ وہ ایسا سرکش گھوڑا ہو جو اپنی لگام تڑوا بھاگے۔''

میة بنت ضرار اپنے بھائی قبیصہ بن ضرار کے مرثیے میں کہتی ہے ؎

لا تبعدن وکل شی ذاهب   زین المجالس والندی قبیصا

''اے کاش تو جو مجلسوں کی زینت اور پنچایت کی جان تھا، ایک مشتِ خاک بن کر ہم سے دور نہ ہو جاتا، مگر ہائے افسوس ہر شے فانی ہے۔''

---

❶ عہد جاہلیت کے شاعر ثابت بن جابر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ایک بار اس کا ایک چھلاوے سے سامنا ہوا۔ وہ اسے مار کر بغل میں دبائے لا رہا تھا تو لوگوں نے کہا: تأبّط شرًّا (وہ بغل میں چھلاوہ دبائے ہوئے تھا)۔ پھر ثابت بن جابر کا نام ہی تأبّط شرًّا پڑ گیا۔

Marfat.com

یطوی اذا ما الشح ابهم قفله　　　بطنا من الزاد الخبیث خمیصا

''وہ اس وقت نجس شے سے اعراض کر کے اپنا پیٹ خالی رکھا کرتا تھا جب کہ بخیل اپنے خزانوں کی کنجیاں کھو بیٹھتے تھے۔''

اور اس کا یہ وصف کہ وہ لوگوں کو اپنے کھانے میں شریک کرتا تھا یوں بیان کیا ہے ۔

لاتعرف الکلم العوراء مجلسه　　　ولا یذوق طعاما وھو مستور

''اس کی مجلس فحش کلمات سے نا آشنا تھی۔ اور وہ کبھی لوگوں سے چھپ کر کھانا نہیں چکھتا تھا۔''

اور تابط شرا نے اپنے ماموں کے مرثیے میں اسے یوں خراج تحسین پیش کیا ہے ۔

یابس الجنبین من غیربوس　　　وندی الکفین شھم مدل

''اس کا پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا ہے لیکن مفلسی کے سبب سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ دوسروں کو کھلاتا ہے اور خود نہیں چکھتا۔ وہ سخی ہے، بیدار مغز اور ہوشیار ہے اور اپنے دشمنوں پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔''

اور عنترہ العبسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

ولقد ابیت علی الطوی واظله　　　حتی انال به کریم الماکل

''میں رات بھر بھوکا پڑا رہتا تھا اور دن میں بھی پیٹ خالی رکھتا جب تک مجھے عزت کا کھانا میسر نہ آتا۔''

کیا عجب کہ جب یہ شعر حضور ﷺ کے سامنے پڑھا گیا ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا ہو: ''کبھی کسی بدو کا میرے سامنے ذکر نہیں ہوا، اور میرے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ہو سوائے عنترہ کے۔'' [1]

حکمت جہاد:

ہمارے قدیم مفسرین کا خیال یہ تھا کہ آیت سیف [2] نے موعظت ونصیحت اور کفار ومشرکین کے لیے رخصت ورعایت کی بہت سی آیتوں کو منسوخ کردیا۔ ہمارے زمانے کے متکلمین کی ایک جماعت اس کے برعکس یہ سمجھتی ہے کہ آیت سیف نے ان کو منسوخ تو نہیں کیا لیکن اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہے۔ ان کے خیال میں عہد نبوت میں جو غزوات ہوئے ان سب کی نوعیت دفاعی تھی اور بعد میں خلفا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو لڑائیاں لڑیں وہ تمام تر ملوکانہ جنگیں تھیں۔ ان کو جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میرے نزدیک اصل حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمانوں پر جہاد کو لازم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ دنیا میں عدل وقسط کو قائم کیا جائے اور ظلم اور فتنہ (یعنی دین حق کے پیروؤں پر ظلم وستم) کو مٹایا جائے۔

---

[1] افسوس کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ روزے کے روحانی اثرات کے بارے میں اپنی تحقیق بیان نہیں کر سکے۔ (خالد مسعود)

[2] آیت سیف سے مراد سورہ توبہ کی آیت 5 ہے:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾

''جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لیے ہر جگہ گھات میں بیٹھو۔''

Marfat.com

دنیا میں دو چیزوں سے بہت بڑا اختلاف پیدا ہوتا ہے، ایک ظلم سے اور دوسرا ظن وگمان کی پیروی سے۔ اس اختلاف کو مٹانے میں بھی دو ہی چیزیں کارآمد ہوتی ہیں: ایک قسط کا قیام اور دوسری علم کی پختگی۔ قسط نام ہے درست علم کا اور علم نام ہے درست رائے کا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ قسط کو قائم کرنے والا ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے خلیفہ انسان کے لیے بھی جو راستہ پسند فرمایا وہ قسط ہی کا تھا۔ چناں چہ اس نے قسط کی طرف ہدایت دینے والی کتاب نازل فرمائی اور جس طرح انسانوں کو کتاب پر ایمان لانے کا حکم دیا اسی طرح قسط کو لازم پکڑنے کا بھی حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قسط سے خالی کوئی دین خدا کو پسند نہیں۔ وہ خود حق ہے اور حق ہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اگر کوئی سرکش طاقت دنیا میں عدل وقسط کو ڈھانے والی اور لوگوں کو دین سے اور اللہ کی اطاعت سے روکنے والی ہو تو اس طاقت کو مٹانے اور دین اور قسط کی نصرت وحمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کو خدا نے ہم پر لازم کیا ہے۔ اسی حمایت قسط اور نصرت دین کو قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ اسی حقیقت کی صراحت ذیل کی آیت میں کی گئی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾

(الحدید: 25)

”بے شک ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں زبردست قوت ہے اور لوگوں کے لیے اس میں دوسرے فائدے بھی ہیں اور اس لیے کہ خدا ان لوگوں کی پہچان کرائے جو غیب میں رہتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔“

اسی آیت کے مشابہ وہ آیت بھی ہے جس میں مظلوم کی نصرت وحمایت کرکے اور ظالم کے ظلم کا دفعیہ [1] کرکے قسط کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

(الحجرات: 9)

”اور اگر مسلمانوں میں سے دو فریق لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔ پس جب وہ رجوع کرلے تو دونوں فریقوں میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

اس تفصیل سے علم حقیقی اور قسط کا باہمی تعلق بھی واضح ہوا اور وہ تعلق بھی معلوم ہوا جو علم وقسط اور دین جہاد کے

---

[1] دفعیہ: خاتمہ، سد باب۔

Marfat.com

درمیان ہے۔ وہ ایمان معتبر نہیں جو شکوک سے پاک نہ ہو اور وہ دین حقیقی نہیں جس میں بغاوت و سرکشی پائی جائے۔ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فتنہ (Persecution) اور سرکشی باقی رہے۔ جب یہ دونوں چیزیں نہ پائی جائیں تو جہاد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿لَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (البقرة: 193)

''ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں۔''

جہل و کفر کے حالات سے ہمیں جتنی کچھ واقفیت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنہ اور خدا سے بغاوت ایک ایسی چیز ہے جس سے دنیا کبھی پاک نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جہاد کا حکم وقتی نہیں تھا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ قرآن سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ (البقرة: 217)

''اور یہ تمھارے ساتھ اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک تمھیں تمھارے دین سے پھیر نہ دیں اگر وہ پھیر سکیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرة: 120)

''تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہ اختیار کرلو۔''

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ جب تک کفر دنیا میں باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ دوسری یہ کہ جہاد صرف فتنہ و سرکشی کی سرکوبی کے لیے لازم ہے۔

اب نبی ﷺ کے طرز عمل پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس وعدہ کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا اور آپ ﷺ کو اس ذمے داری کا وارث بنایا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس آیت کے بموجب ڈالی گئی تھی:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ (البقرة: 125)

''یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔''

نیز آپ ﷺ نبی خاتم کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کے دین کو اللہ تعالیٰ تمام ادیان پر غالب کرنے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے پہلے آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ لوگوں کو وعظ و تلقین فرمائیں تاکہ لوگ آپ کی باتوں کو سنیں اور مانیں اور اپنے حالات کی اصلاح کریں۔ آپ کو قتال کرنے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک لوگوں پر اللہ کی حجت تمام نہیں ہوگئی اور تبلیغ کا فرض اچھی طرح ادا نہیں ہوگیا۔ جب فرض تبلیغ اچھی طرح ادا ہوچکا تو تب آپ کو حکم ہوا کہ آپ ﷺ خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرائیں اور عہد ابراہیمی کے بموجب دین

Marfat.com

حنفی کو اس سرزمین میں از سرنو تازہ کریں اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے قوت کو بھی استعمال کریں۔ قوت کے استعمال کی یہ اجازت بھی آپ کو ہجرت کے بعد دی گئی۔ ہجرت کے بعد اس لیے کہ ہجرت سے پہلے جہاد سوائے اس کے جو حفاظت نفس کے لیے ہو، سرتا سر ظلم وفساد ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتال محض دفاع کے لیے نہیں واجب ہوا بلکہ کعبہ کو فتح کرنے اور بنی اسماعیل کے اندر دین حنفی کو از سرنو قائم کرنے کے لیے ہوا۔

باقی رہے غیر بنی اسماعیل تو ان کے ساتھ جہاد کا حکم اس لیے دیا گیا کہ ان کو عدل وقسط پر قائم کیا جائے اور زمین کو فساد سے پاک کیا جائے۔ اہل کتاب اور غیر بنی اسماعیل کو دین کے معاملہ میں آزادی حاصل رہی۔ ان کے لیے ایمان نہ لانے کی صورت میں جزیہ کی راہ کھلی ہوئی تھی لیکن بنی اسماعیل کے لیے اتمام حجت کے بعد یہ راہ کھلی نہیں چھوڑی گئی تھی۔

لیکن جہاد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فتنہ اور قتل کو روکنے کے لیے بعض اوقات صلح وصفائی کا طریقہ زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ اس لیے جہاد سب سے آخری تدبیر ہے۔ اسی لیے اس کے لیے کئی شرائط بھی ہیں۔

رفع فساد کی خاطر جو لوگ جہاد کے لیے اٹھیں ان کے لیے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو شائبہ فساد سے پاک کریں۔ جب تک خلیفہ اور اس کے متبعین خود عدل پر قائم نہ ہوں اس وقت تک ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدل قائم کرنے کے لیے تلوار لے کر اٹھیں۔

پھر اپنے ملک کے اندر بغیر ہجرت کے جہاد جائز نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت اور ہجرت سے متعلق دوسری آیات سے یہی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد اگر صاحب جمعیت اور صاحب اقتدار امیر کی طرف سے نہ ہو تو وہ محض شورش، بدامنی اور فتنہ فساد ہے۔

پھر قتال کی اجازت حصول قوت کے بعد دی گئی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی سرگزشت میں اس کی دلیل موجود ہے۔ انھوں نے فرمایا:

﴿وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝﴾
(الاعراف: 87)

''اگر ایک جماعت تم میں سے اس چیز پر ایمان لائی ہے جس کو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور دوسری جماعت ایمان نہیں لائی ہے تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فاصلہ کر دے۔''

مذکورہ بالا تینوں شرطوں کے ساتھ جہاد قیامت تک کے لیے واجب ہے۔ دین کے معاملہ میں جبر اور شورش وبدامنی جائز نہیں ہے لیکن حق کی شہادت اور تبلیغ اور مجادلہ حسنہ ہمیشہ ضروری ہے۔

Marfat.com

نبی اور مقامِ رسالت

قرآن مجید اور دوسرے آسمانی صحیفوں پر گہری نگاہ رکھنے والے شخص سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ انبیائے کرام کا گروہ انسانوں کا وہ گروہ تھا جس کی بشریت کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور ربِ فیاض نے ان کی انفرادی استعداد کے مطابق ان پر وحی بشری کا فیضان کیا تھا۔ فطرت انسانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن بھی اس کی خبر دیتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت خدا نے اس کے اندر روح قدسی پھونک کر اسے عزت بخشی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان کو ایک عادل ورحیم رب کے وجود کا الہام کیا گیا ہے جس کی تعبیر ذیل کی آیات سے ہوتی ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣﴾ (الفاتحہ : 1-3)

''شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا وسزا کے دن کا مالک۔''

یہ الہام کثیف نفوس میں تو دب جاتا ہے، لیکن جہاں تک پاکیزہ طبیعت اور صحیح فطرت رکھنے والے انسانوں کا تعلق ہے، انھیں اس حقیقت کا اتنا واضح یقین ہوتا ہے کہ اس میں شک وتردد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے منصب پر فائز کیے جاتے ہیں، پہلے سے جزا وسزا اور عدل وقسط پر یقین رکھتے ہیں اور ظلم اور کفرانِ نعمت سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں نبوت سے پہلے بھی مخلوقات کے لیے رحم وشفقت اور ربِ مُنعم [1] کے لیے عبودیت وتوکل کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن ہی سے خدا کی صفت عدل پر پورا پورا یقین تھا اور وہ اپنے بھائیوں کی زیادتیوں کے انجام سے واقف تھے، اس لیے جب ان کے بھائیوں نے انھیں اندھے کنویں میں پھینکا تو فوراً انھیں اشارہ ہوا کہ بھائیوں کا ظلم کسی روز آشکارا ہو کے رہے گا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١٥﴾ (یوسف : 15)

''پھر جب وہ اس کو لے کر گئے اور اس کو اندھے کنویں میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تم ان کو اس کرتوت سے ضرور باخبر کرو گے جبکہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا۔''

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی نوعمر ہی تھے کہ ایک مظلوم کی نصرت وحمایت کے جذبے کے تحت انھوں نے

---

[1] ربِّ مُنعم: عطا کرنے والا رب، نعمتیں دینے والا پروردگار۔

Marfat.com

ایک ظالم قبطی کو مکا رسید کر دیا۔ دوسرے انبیائے کرام کے حالات میں بھی اس طرح کے واقعات ملتے ہیں۔

بندہ جب اپنے رحیم پروردگار کو پہچان لیتا ہے اور اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں کی بدولت زندہ ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ خدا کے عدل پر بھروسہ کرتا ہے اور قیامت کی جزا و سزا کے ایک شدنی امر ہونے کا یقین کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ ہر طرف سے کٹ کر خدا کا ہو رہتا ہے، اس کی مقرر کردہ بندشوں میں رہ کر تسکین پاتا ہے اور تمام معاملات میں اسی کی مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بندے کی اسی کیفیت کو اس دعا سے تعبیر کیا گیا ہے:

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴﴾ (الفاتحہ: 4)

''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

اس وقت آدمی کی سب سے اہم و برتر حاجت جس کا وہ خدا سے سوال کرتا ہے، یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے عدل کے ان رستوں پر چلائے جو پروردگار کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ انہی رستوں پر چل کر اطاعت و عبودیت کا وہ مقصود حاصل ہوتا ہے جس کا تقاضا مخلوقات سے کیا گیا ہے۔ اس طریقہ سے آدمی خدا کے مطیع بندوں کے نقش قدم پر چلتا اور گمراہی کے ان گڑھوں میں گرنے سے بچ جاتا ہے جو رب سے اس کو دور کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت ذیل کی آیات میں بیان ہوئی ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۝۷﴾ (الفاتحہ: 5-7)

''ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

اسی سیدھے راستے کی ہدایت وہ کامل بشری وحی ہے جو فطرت انسانی کے کمال کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ ایک طاہر و مطہر نفس اپنی پاکیزہ فطرت کے باعث اسے سنتا ہے کیوں کہ صرف پاکیزہ فطرت ہی روح قدسی کا مہبط [1] بن سکتی ہے۔

نبی جب اس فطری الہام سے بھر چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف وحی کا اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ ظالم لوگوں کو تنبیہ کرے۔ نبی کی تعلیم کی ابتدا توحید اور قیامت کی جزا و سزا کے تصور سے ہوتی ہے جس کی بنیاد شکر اور جس کی ضد کفر ہے۔

نبی اپنی ذات میں ایک پیغام ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں اس کا ذکر پیغام کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ سورہ طلاق میں ہے:

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ (الطلاق: 10-11)

---

[1] مہبط: نزول کی جگہ۔

Marfat.com

''اللہ نے تمھاری طرف ایک یاددہانی اتاردی ہے۔ ایک رسول جوتمھیں اللہ کی واضح آیات پڑھ کرسناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو جوایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے۔''

اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔ یعنی قرآن کے آئینہ میں حضور ﷺ کا عکس دیکھ لو۔ جو کچھ اس میں ہے وہ آپ ﷺ کے اخلاق کے موافق ہے۔ یہ حقیقت بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک فنکار کی تصویر میں اس کا ذہن جھلکتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی ہے لیکن نبی کے اخلاق سے پوری مطابقت رکھتی ہے کیوں کہ خدا کا کلام اسی شخص پر نازل ہوتا ہے جس کے اندر اس کے قبول کرنے کی پوری استعداد ہو۔

قرآن میں رسول کا لفظ ''ذکر'' کے بدل کے طور پر بالکل اسی طرح آیا ہے جس طرح ''عذاب'' کا بدل فرعون آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝٣٠ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝٣١﴾ (الدخان: 30-31)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب یعنی فرعون سے نجات دی۔ بے شک وہ بڑا ہی سرکش، حدود سے نکل جانے والا تھا۔''

یہاں بھی یہ حقیقت ظاہر کرنی مقصود ہے کہ فرعون مجسم عذاب تھا۔

بعثتِ انبیاء کی ضرورت:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انبیاء بھیجنے کا سلسلہ کیوں شروع فرمایا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا یہ جواب صحیح نہیں کہ انسان کی عقل خدا کی معرفت اور عدل کے تصور سے خالی تھی، اس لیے خدا نے انبیاء کو اس کی ہدایت پر مامور فرمایا۔ یہ دونوں چیزیں تو عقل انسانی میں موجود تھیں۔ انبیاء صرف ان کی یاددہانی کرانے کے لیے آئے۔ مزید برآں ان کی بعثت کا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ انسان کے لیے حقیقت کے دو گواہ ہوں، ایک اس کے باطن میں عقل، دوسرا خارج میں وحی، تاکہ ہدایت حاصل کرنے کے متنوع ذرائع کی موجودگی میں اس پر خدا کی حجت تمام ہو سکے۔ اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝١٣٠ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝١٣١﴾ (الانعام: 130-131)

''اے گروہ جن وانس! کیا تمھاری طرف تمھی میں سے رسول نہیں آئے جو تمھیں میری آیات سناتے تھے اور اس

Marfat.com

دن کی ملاقات سے تمھیں متنبہ کرتے تھے۔ وہ کہیں گے، ہم اپنے اوپر گواہ ہیں اور دنیا کی زندگی نے انھیں دھوکے میں رکھا اور وہ اپنے خلاف یہ گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تیرا رب بستیوں کو، ان کے ظلم کے سبب سے، اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب کہ وہ بے خبر ہوں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾

(النساء: 165)

''اور اللہ نے بھیجے رسول بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے خدا کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

گویا حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں بصیرت ودیعت کر دی لیکن ہم پر مزید فضل یہ فرمایا کہ تنبیہ و تذکیر کے لیے رسول بھیجے۔

ایک عقل مند آدمی جب یہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں خواہشات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں، عقل کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں اور نفس کی تربیت کے سلسلے میں ارباب عقل کی رائیں باہم دگر مختلف ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے رسول بھیج کر راہ ہدایت روشن رکھی ہے۔ وہ اسی کو ذریعہ نجات سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے، اسی پر ثابت قدم رہتا ہے اور اسی کا مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نجات کا راستہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور وہ امن چین اور قلبی اطمینان کے ساتھ اس پر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ہدایت کے نقطۂ نظر سے اس شخص کے لیے نبی کا وجود اسی طرح غنیمت ہوتا ہے جس طرح دنیا کے مسائل میں ریاست کا وجود غنیمت ہوتا ہے جو ملک میں احکام عدل کے نفاذ کا باعث ہوتی ہے اور جس کے تحت رہتے ہوئے ہر شخص کا مفاد حاصل ہوتا اور تہذیب و تمدن جس سے ترقی پاتا ہے۔

جو شخص نبوت کی ضرورت کا منکر ہو، اس کی مثال اس شخص سے بھی بدتر ہے جو ریاست کی ضرورت کا قائل نہ ہو اور معاشرت و تمدن جیسے فطرت انسانی کے اہم ترین تقاضوں کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہو۔ اگر حقیقت یہی ہوتی تو نیکو کاروں کے لیے انبیاء کا وجود اسی طرح ضروری نہ ہوتا جس طرح بادشاہوں کا وجود ضروری ہے تو ہمیں تاریخ انسانی میں ریاست اور نبوت دونوں کا پہلو بہ پہلو وجود نظر نہ آتا۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ پایا جانا ہی اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں دونوں کا داعیہ موجود ہے اور انسان اصلاً عدل کو پسند کرتا ہے، یوم آخرت کے وقوع اور عملوں کی جزا پر یقین رکھتا ہے اور ایک عادل خدا کو مانتا ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر انسان کی اصل فطرت یہی تھی تو دنیا میں گمراہی و سرکشی کے علمبرداروں کا وجود کیا معنی رکھتا ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جس طرح ریاست کے باغیوں، ملک میں فساد پھیلانے والوں اور رعایا پر ظلم کرنے

Marfat.com

والے جابر حکمرانوں کے پائے جانے سے انسان کے اندر عدل کی فطرت کی نفی نہیں ہوتی، اسی طرح گمراہوں اور بدکرداروں کے وجود کی بنا پر انسان کی نیکی کی فطرت کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے لوگ ہمارے نزدیک ایک بیماری میں مبتلا ہیں جب کہ فطرت انسانی ان امور پر مشتمل ہے جن کا تقاضا ایک انسان اپنی صحت کی حالت میں کرتا ہے۔ اور اوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ توحید انسان کی اصل فطرت ہے۔

انبیاء کی ضرورت کے بارے میں دو باطل نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ فطرت انسانی کو اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جس اہمیت کی وہ واقعی مستحق ہے۔ یہ لوگ انبیاء کی ضرورت کے قائل نہیں۔ دوسرا گروہ فطرت کو اس کے اصل مقام سے گرا کر یہ کہتا ہے کہ انسان کے فطری شر اور نفس کی ناپاکی کے باعث نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ دونوں گروہ انسان کی فطرت کو اس کی اصل شکل میں نہیں دیکھتے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ مخلوقات کے معاملات محض امکان یا اتفاق پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قوتوں میں اضافے پہ اضافہ کر کے ان پر احسان کرتا ہے۔ مثلاً وہ چاہتا تو کھانے کی ایک ہی قسم پیدا کرتا یا روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ مقرر کر دیتا۔ اسی طرح اگر وہ انسانوں کو ایک آنکھ اور ایک کان عطا کرتا تو انھیں اسی پر قناعت کرنی پڑتی، لیکن اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان گنت نعمتیں عطا کرتا ہے اور بے شمار امور میں دوسری مخلوقات پر ان کو فضیلت بخشتا ہے۔ ہدایت کے معاملہ میں بھی اس نے انسانوں کے لیے متعدد اسباب ہدایت پیدا کیے اور اسے صرف فطرت ہی پر نہیں چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نے ایک طرف تو انسان پر اپنی نعمت تمام کی اور دوسری طرف اس پر حجت قائم کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کے معاملے میں محض فطرت کی بنیاد پر انسانوں کا مواخذہ کرتا تو یہ بھی عدل ہوتا کیوں کہ آسمان و زمین خدا کی نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رسول اور کتابیں بھیج کر ان پر مزید احسان فرمایا۔ قرآن میں شریعت کو نعمت قرار [1] دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ رسول بندگان الٰہی کو ان لوگوں کے برے اعمال کی تقلید سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں جو نیکی کے راستہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور جو اپنے حقیقی آقا اور مولیٰ سے منہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص رسولوں کی بات پر دھیان نہیں دیتا حالاں کہ وہ پورے جذبہ خیر خواہی، پوری وضاحت اور نہایت قطعی دلائل کے ساتھ کہی جارہی ہے تو وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ اور اس پر وہ خود ہی ملامت کا مستحق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اولاً تو وہ خود اپنے آقا سے بھاگا ہے۔ ثانیاً وہ بلانے والے کی بات بھی

---

[1] مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ کیجیے:

☆.... ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرہ: 47)

''اے بنی اسرائیل! میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔''

اس آیت میں اس نعمت کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو شریعت عطا کر کے برگزیدہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

☆.... ﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ﴾ (المائدہ: 7)

''اور یاد رکھو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور اس کے اس عہد کو جو اس نے تم سے لیا۔''

اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے، انھیں نعمت شریعت کا احساس دلایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ شریعت اللہ تعالیٰ کے درمیان اور ان کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (خالد مسعود)

Marfat.com

سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ثالثاً وہ ان تمام برے نتائج کا منکر ہے جو اس کی شرارت کی پاداش میں اس کے سامنے آنے والے ہیں۔

نبی کی بعثت قوم کا یوم حساب ہوتا ہے:

یہ بھی جاننا چاہیے کہ کسی قوم میں نبی کی بعثت ان کے لیے حساب اور فیصلہ کے دن کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات قرآن سے بھی واضح ہوتی ہے اور دوسرے صحیفوں سے بھی اسی کی تصریح ہوتی ہے۔ لہٰذا بعثت کے بعد باطل پر حق کے غلبہ کا وقت قریب آجاتا ہے۔ قوم کے اس بحران کے زمانے میں تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ضرور ظہور میں آجاتی ہے۔

چوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار بخشا ہے اس لیے اس نے اختیار سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک وسیع مدت مقرر کردی ہے۔ اس مدت میں انسان اپنی طبعی خباثتیں خوب نکال لیتا ہے جب ایک قوم فطرت کی حدوں کو پامال کرتی چلی جاتی ہے اور باطل ہی کی طرف جھک کر اسی میں غوطہ زن ہوجاتی ہے تو خدا اس کی آزمائش کا پیمانہ لبریز کردیتا ہے، عدل و جزا کے ظاہر ہونے کا وقت آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قوم کو تباہ کر کے کسی دوسری قوم کو زندگی بخشتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر عالم ﷺ کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت [1] کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹادی گئیں۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی شرارتوں کی پاداش میں ہلاک کردی جاتی ہے مگر اس کی ذریت میں سے خدا ایک نئی امت برپا کردیتا ہے۔ اور یہی جماعت ہلاک ہونے والوں کی جگہ زمین کی وارث بنتی ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح کا عمل ہمیں حیوانات و نباتات میں نظر آتا ہے۔ ان کے لیے ایک مدت مقرر ہے۔ جب یہ مدت ختم ہوجاتی ہے تو نئی نسل ان کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اکثر انبیاء کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی سرکشی کے سبب سے تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچ جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی غفلت پر گرفت نہیں کرتا۔ پھر یہ قوم یک بیک پیغمبر کی دعوت سے چونکی ہوجاتی ہے، اس کا ایک حصہ خدا کے آگے عاجزی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو برکت دیتا ہے اور باقی قوم پر حجت تمام کرنے کے لیے انہی لوگوں کو منتخب کر لیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور پیغمبر عالم ﷺ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بہرحال نبی کی بعثت کے ساتھ ہی عدل کے ظہور کا وقت قریب آجاتا ہے اور نبی کی ذات گویا عدل و حساب کا مظہر ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ (بنی اسرائیل: 81)

''حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا۔ بے شک باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔''

---

[1] ذریت: اولاد، نسل۔

Marfat.com

مذکورہ بالا حقائق کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیات میں اشارات کیے گئے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے:

﴿وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ (یونس: 46-49)

''یا تو جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ ہم تم کو دکھا دیں گے یا یہ ہوگا کہ ہم تم کو توفات دیں گے اور ان کا پلٹنا ہماری طرف ہوگا۔ پھر اللہ ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ جب ان کا رسول آجاتا ہے تو عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جاتی۔ وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ دھمکی کب پوری ہوگی۔ کہہ دو کہ میں تو اپنی ذات کے معاملے میں بھی کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب ان کا وقت آجائے گا، نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے، نہ ایک گھڑی آگے بڑھیں گے۔''

گویا انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو امت صالح اور نیکوکار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے اور جو قوم راہ حق و ہدایت سے ہٹ کر گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے۔ اور یہ بات حق و باطل کی کشمکش کے لازمی نتیجے کے طور پر آپ سے آپ ظہور میں آجاتی ہے۔

نبی کا مخصوص معیار کارکردگی:

چوں کہ نبی کی ذات خدا کے عدل کا مظہر اور اس کی بعثت کا زمانہ قوم کی عدالت کا زمانہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نبی کے مواخذہ میں بھی کمال عدل کا اظہار فرماتا ہے۔ اس پر ان معاملات میں بھی گرفت کی جاتی ہے جن معاملات پر دوسروں سے اس شدت سے گرفت نہیں کی جاتی۔ چناں چہ حضرت نوح علیہ السلام شفقت پر، حضرت داوٗد علیہ السلام تمنا پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم محبت و رافت پر زیر عتاب آئے۔ اور حضرت یونس علیہ السلام کا حیا پر اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جہاد فی سبیل اللہ کی تیاریوں میں حد درجہ انہماک پر محاسبہ کیا گیا۔ انبیاء پر شدید گرفت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں پاکیزہ رکھنا اور برائی میں پڑنے سے بچانا چاہتا ہے۔

خود انبیاء کی فطرت بھی چوں کہ عدل پر ہوتی ہے اس لیے وہ پروردگار کے ہاں تقرب کے باعث تمام لوگوں سے زیادہ خدا خوفی رکھنے والے اور عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کی شدت کی وجہ سے خدا کے آگے جھکے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کا یہ حال انھیں رب کی عنایات کا خاص طور پر مستحق بنا دیتا ہے۔ ان کے معاملے میں اللہ کی سنت ان کی استعداد کے مطابق اور اس عدل کے مطابق ظاہر ہوتی ہے جس کا مظاہرہ پورے زمانہ بعثت میں ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

عقیدۂ شفاعت

جس طرح رسول، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے بشیر ونذیر بن کر آتا ہے، اسی طرح اس کی ایک مستقل حیثیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ پروردگار کے سامنے ان کا وکیل اور شفیع بھی ہوتا ہے۔ اس شفاعت کے کئی مواقع ہوتے ہیں۔ شفاعت کا پہلا موقع تو وہ ہوتا ہے جب لوگ اسلام قبول کرتے ہیں تو نبی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ قرآن میں اس امر کا کئی جگہ ذکر ہوا ہے۔ شفاعت کا دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب بندے گناہ کے مرتکب ہونے پر رب کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور اس سے مغفرت کے طالب ہوتے ہیں تو رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتا ہے، یعنی اس کی حیثیت بندوں کے لیے ایک قابل اعتماد امین کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان پر یہ بات واجب کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے مابین کے تمام مقدمات رسول کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کریں۔ اگر وہ ایسا کرنے پر تیار نہ ہوں تو گویا انھوں نے اس کو صحیح معنوں میں نبی تسلیم نہیں کیا۔ شفاعت کا تیسرا موقع قیامت میں پیش آئے گا۔ وہ لوگ جنھوں نے نبی کا زمانہ نہیں پایا، جب توبہ واستغفار کرتے ہیں تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے مگر کبھی کبھی ان کی توبہ نبی کی شفاعت کی طرف پھیر دی جاتی ہے۔ یہ معاملہ کبائر کی شکل میں پیش آتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (النساء: 31)

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تم کو روکا جاتا ہے، تو ہم تمھاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝﴾ (النساء: 18-17)

''اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمے داری تو انھی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر برے کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب کسی کو موت آلے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر کی حالت میں مریں۔ ایسے

Marfat.com

لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ شخص جو نادانی میں بدی کا مرتکب ہوجاتا ہے، اگر فوراً تائب ہوجائے تو اس کی مغفرت ہوجاتی ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو گناہ کرنے کے بعد توبہ نہیں کرتا یہاں تک کہ موت اس کو آلے، خدا کے ہاں مغفرت نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاموش ہے جن سے جانتے ہوئے گناہ سرزد ہوجاتا ہے اور وہ کبائر سے اجتناب نہیں کرپاتے، وہ توبہ کرتے ہیں مگر کچھ مدت کے توقف کے بعد، اگرچہ یہ وقت موت کی کیفیت طاری ہونے سے بہت پہلے ہوتا ہے، یہ لوگ استغفار بھی کرتے ہیں مگر ان کو رسول کا زمانہ نصیب نہیں ہوتا کہ وہ بھی ان کے لیے مغفرت کا طالب ہو۔ انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز رسول کو خاص اذن دے گا اور وہ ان کی شفاعت کریں گے۔ ایسے لوگوں کو بشارت دنیا ہی میں دے دی گئی ہے، فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (الزمر: 53)

''کہہ دو: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ خدا تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

یعنی اللہ کی طرف رجوع کرو اور اس سے مغفرت چاہو کیوں کہ وہ بخشنے والا ہے اور مومن کی صفت یہ ہوتی ہے کہ اپنے رب ہی سے امید رکھتا اور اسی سے خوف کھاتا ہے، لہٰذا وہ ہمیشہ توبہ کرتا ہے اور کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا:

﴿لَا تَايْـــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (یوسف: 87)

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوا کرتے ہیں جو کافر ہیں۔''

شفاعت کے جن تین مواقع کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان تینوں سے پہلے گناہ گار کا خود توبہ واستغفار کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہی شفاعت کی حقیقت ہے۔ اس طرح شفاعت کرنے والا استغفار کرنے میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے اور گنہگار کی زبان بنتا ہے، گویا گنہگار عاجزی اور دعا میں شافع کا وسیلہ پکڑتا ہے۔ اسی اصل پر ہماری نمازوں اور دعاؤں کی بنا کی گئی ہے۔ امام دعا کرتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ انبیاء کا طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ وہ اپنی امت کے افضل ترین لوگوں کو امت کی شفاعت کے لیے اپنے ساتھ شریک کرتے تھے تاکہ تنہا ان کے دعا کرنے سے شفاعت محض مجادلہ[1] کی شکل اختیار نہ کر لے۔ اس بات کا مشاہدہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جبل زیتون پر کی گئی آخری دعا میں بھی کرتے ہیں اور غزوہ بدر کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں بھی کرتے ہیں۔ بدر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[1] مجادلہ: جھگڑا۔

Marfat.com

کی دعا قبول فرمائی اور نبی ﷺ اور ان کے اصحاب کو اپنے وعدہ اور سنت کے مطابق نصرت عطا فرمائی، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾

(الحج : 40)

''اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔''

یہ نصرت اس وقت تک ظاہر نہ ہوئی جب تک نبی اور ان کے ساتھیوں نے اپنا ذمہ پورا نہ کر دکھایا۔ انھوں نے ثابت قدمی دکھائی، تکالیف برداشت کیں، خدا کے لیے ہجرت کی، اپنے گھروں اور مالوں کو خیر باد کہہ دی اور اپنی جانوں کو پروردگار کی راہ میں ڈال دیا تب ان پر نصرت نازل ہوئی۔ اس نصرت کا ظہور بدر کے دن ہوا اگرچہ اس کے آثار ہجرت کے بعد ظاہر ہونے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

(التوبہ : 40)

''اگر تم نبی کی مدد نہ کرو گے تو خدا اس کا مددگار ہوگا۔ اس نے اس کی مدد اس وقت کی جب کافروں نے اس کو اس حال میں نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ تم غم نہ کرو، اللہ ہمارا مددگار ہے تو اللہ نے اس پر تسکین نازل کی اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جن کو تم دیکھ نہیں سکتے اور کافروں کی بات کو پست کیا اور اللہ ہی کا کلمہ بلند رہا، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

غیر مرئی لشکروں کے ساتھ مدد بدر کے موقع پر ہوئی۔ اب دیکھئے کہ ہجرت اور جنگ بدر کے دو مواقع کو بُعد زمانی کے باوجود اس آیت میں کیسے جمع کر دیا ہے۔ ﴿عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا نے نصرت کے ظہور میں تاخیر کی تو اس میں بھی اس کی حکمت کو دخل تھا۔

جہاں تک حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا کا تعلق ہے، آپ کے شاگردوں نے اس میں آپ کا ساتھ نہ دیا [1] لہٰذا یہ دعا

---

[1] یہاں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل انجیل متی باب 26 میں یوں بیان کی گئی ہے:
''اس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام کی ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا: یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر دعا کروں اور پطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین اور بیقرار ہونے لگا۔ اس وقت اس نے ان سے کہا: میری جان نہایت غمگین ہے، یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے، تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو۔ پھر ذرا آگے بڑھا اور منہ کے بل گر کر یوں دعا کی: اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے، تو بھی نہ جیسا میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ پھر شاگردوں کے پاس آ کر ان کو سوتے پایا اور پطرس سے کہا: کیا تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے؟ جاگو اور دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے۔ پھر دوبارہ اس نے جا کر یوں دعا کی کہ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پیے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔ اور آ کر پھر انھیں سوتے پایا کیوں کہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور ان کو چھوڑ کر پھر چلا گیا اور پھر وہی بات کہہ کر تیسری بار دعا کی۔ تب شاگردوں کے پاس آ کر ان سے کہا: اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آ پہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے حوالے کیا جاتا ہے۔''
(خالد مسعود)

Marfat.com

شفاعت کا درجہ حاصل نہ کرسکی۔ اسی لیے حضرت مسیح علیہ السلام کو علم ہوگیا کہ یہود کے لیے اب کسی خیر کی امید نہیں، ان پر لعنت پڑ چکی ہے۔ چناں چہ آپ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوگئے کیوں کہ وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا اور حکمت کے ساتھ رحم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب گنہگار بے پروائی اختیار کرے اور منہ پھیرے رہے تو شفاعت کی شرائط پوری نہیں ہوتیں اور اس کی حیثیت محض مجادلہ کی ہوجاتی ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کمال رافت [1] کی وجہ سے عدل وحکمت کی رعایت نبی کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے اور وہ مجادلہ کرنے لگتا ہے، تاہم وہ اس میں قابل ملامت نہیں ہوتا۔ اب ہم نبی کے احوال کے اس گوشے پر روشنی ڈالیں گے:

مجادلہ:

قرآن مجید اور تورات میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے لیے باصرار رحمت طلب کرنے میں اور اپنے والد کے لیے استغفار کرنے میں بہت الحاح کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس فعل کا تذکرہ اگرچہ مدح کے ساتھ کیا ہے لیکن قوم لوط اور آزر کے ساتھ معاملہ ان کے اعمال کے مطابق ہی کیا۔ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الحاح اس وقت کی جب تک انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ خدا کے دشمن ہیں۔ جونہی ان کے علم میں یہ بات آئی، آپ دعا سے رک گئے۔ یہی بات انبیاء اور صالحین کے مقام سے مناسبت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک اسوہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

پھر ہمارے لیے یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ کسی غیر مستحق کے لیے مغفرت طلب کرنا آخرت میں بالکل بے سود ہوگا کیوں کہ وہاں اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ان کے اعمال کے مطابق ٹھیک بدلہ دے گا جن کا وہ خود گواہ ہے یا جن کی رسول شہادت دے گا۔ مزید برآں رسول اور مومنین کو یہ ہدایت دی کہ وہ عمومی استغفار کرتے رہا کریں تاکہ اس سے ہر اس شخص کو فائدہ پہنچے جو اس کا اہل ہو۔ ہماری اس بات پر قرآن مجید میں متعدد شہادتیں موجود ہیں، مثلاً فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾﴾ (النساء: 105-110)

"ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کرو جو اللہ نے

---

[1] کمالِ رافت: بہت زیادہ نرمی۔

Marfat.com

تمھیں دکھایا ہے۔ اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو اور اللہ سے مغفرت مانگو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالاں کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی، تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا؟ اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم فرمانے والا پائے گا۔"

شفاعت کی ایک اہم خصوصیت:

شفاعت کے بارے میں یہ جاننا چاہیے کہ یہ اذن اور سوال کے بعد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾﴾

(الانبیاء: 26-28)

"اور یہ کہتے ہیں خدائے رحمان کے اولاد ہے۔ وہ ان باتوں سے ارفع ہے، بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے، سب سے باخبر ہے۔ اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے۔ اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔"

بلا اذن شفاعت کا عقیدہ کئی اعتبارات سے غلط ہے۔

اول، ایسی شفاعت سوءِ ادب میں داخل ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ "وہ تو خدا کی خشیت سے خوف زدہ ہوں گے۔" وہ کب شفاعت کی جراٴت کریں گے۔

دوم، یہ شفاعت خدا کے خوف کے منافی ہے۔ ایک مجرم کا سارا بھروسہ شفعاء پر ہوتا ہے اور اس کی نظروں میں عدل کے تقاضوں اور جزا و سزا کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اللہ سے نہیں ڈرتا، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٥١﴾﴾

(الانعام: 51)

"اس قرآن سے ان لوگوں کو خبردار کرو جو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے، جہاں خدا کے سوا نہ ان کا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ شفاعت کرنے والا، تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔"

سوم، شفاعت کا یہ عقیدہ شرک پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے والے شفعاء کو پوجتے ہیں، خدا کی نسبت ان سے

Marfat.com

زیادہ محبت رکھتے ہیں بلکہ خدا سے اس طرح کا خوف کھاتے ہیں جیسا ایک غضبناک سخت گیر انسان سے خوف کھایا جاتا ہے اور شفعاء کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، حالاں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہ حال تھا کہ اللہ پر بھروسہ رکھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو امیدیں تھیں، ان سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ کیے رکھتے تھے۔ انبیاء کی شفاعت کا جو طریقہ قرآن نے بیان کیا ہے وہ بھی کیا ہی خوب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی جو شفاعت کریں گے اس کے الفاظ یوں بتائے گئے ہیں:

﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝١١٨﴾

(المائدہ: 118)

''(اے اللہ!) اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخشے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

یعنی عذاب کے بیان میں ان کا معاملہ پروردگار کی طرف پھیر دیا اور ان کی مغفرت کی شفاعت سے اپنے آپ کو خارج کر لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی خدا کی قدرت وحکمت کے کمال کا اعتراف بھی کیا۔ گویا یہ کہا کہ اگر تو ان کو بخش دے تو یہ خالص تیرے حکم کا نتیجہ ہوگا اور کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ تجھے روک دے یا تیری مخالفت کرے یا کسی بہتر چیز کی طرف تیری رہنمائی کرے۔

چہارم، یہ شفاعت جس طرح خدا کے شرک کے باب سے ہے، اسی طرح یہ اس کے علم اور قدرت کا انکار بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ﴾ (البقرہ: 255)

''کون ہے جو اس کے حضور، اس کی اجازت کے بغیر، کسی کی سفارش کر سکے؟''

عقیدۂ توحید

دین محض اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا بڑا حصہ اخلاق اور نفس کے ان احوال پر مشتمل ہے جو کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے، کسی چیز کو پسند اور ناپسند کرنے اور شوق و استغراق میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ عقلی دلائل میں زیادہ اشتغال رکھتے ہیں ان میں دینی حس کی کمی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے صرف اتنا ہی جاننا کافی نہیں ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس نے ہمیں رحم فرمانے کے مقصد سے پیدا کیا ہے اور حکمت کے ساتھ ہماری پرورش کی ہے۔ پس وہی مالک حقیقی پاک پروردگار، عزیز وحکیم اور رب رحیم ہے۔ اس حقیقت کا ادراک محض قوائے عقلی سے نہیں ہو سکتا۔ (حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، حجج القرآن، ص: 59-60)

Marfat.com

مُعجزہ کی حقیقت

معجزہ سے مراد وہ کام ہے جو انسان کی قوت اور اس کی تدابیر کی حدود سے باہر ہو۔ اس اعتبار سے نشانیاں معجزہ بھی ہوتی ہیں اور امر رب پر دلیل بھی۔ معجزہ کا یہ مفہوم اس آیت سے واضح ہوتا ہے جس میں قرآن مجید نے نزولِ مائدہ ❶ کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا قول نقل کیا ہے:

﴿قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۱۱۳﴾

(المائدہ: 113)

''انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس مائدہ سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان جائیں کہ آپ نے ہم سے سچی بات کہی اور ہم اس پر گواہ بنیں۔''

یعنی اگر خدا ہماری اس درخواست پر آسمانی خوان اتار دے گا تو ہم اس بات کا یقین کر لیں گے کہ اسی نے آپ کو رسول بنایا اور آپ جو پیغام خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں وہ واقعی اسی کا ہے۔ یہ معجزہ دیکھ کر ہم آپ کی حقانیت کی گواہی ان لوگوں کے سامنے دیں گے جو یہاں موجود نہیں۔

معجزہ اور شعبدہ میں فرق:

شعبدہ اور معجزہ میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر محض لہو ولعب ❷ کے لیے اور ثانی الذکر نعمت ونقمت کے لیے ہوتا ہے۔ شعبدہ کا اثر انسان کے سفلی جذبات پر پڑتا ہے۔ اس کی نشو ونما تقویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی شعبدہ باز نے نہ تو اپنی قوم کی قیادت کی اور نہ اس کو سر بلند کیا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ ذلیل وخوار رہے ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝۶۹﴾

(طٰہٰ: 69)

''اور جادوگر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا!''

اس کے برعکس معجزہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس سے نبی اپنے مشن کو ترقی دیتا اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتا ہے۔

---

❶ مائدہ: خوان، دسترخوان۔

❷ لہو ولعب: کھیل تماشا۔

Marfat.com

معجزہ کی ضرورت:

زمرۂ انبیاء کا کوئی فرد جھوٹ سے متہم [1] نہیں ہوتا کہ اس کی صداقت کے اثبات کے لیے معجزات اتارنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ نبی جب اپنی قوم کو توحید اور آخرت کی حقیقت سمجھاتا ہے تو وہ اس کے صحیح ہونے میں شک کرتی ہے۔ اس مرحلہ میں نبی کی صداقت کا نہیں بلکہ توحید و معاد کا اثبات ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے ابتدا میں تو وحی کے ذریعے سے نبی کو صرف دلائل عطا ہوتے ہیں تاکہ مخاطبین کی عقل کی گرہیں کھلیں، معجزہ ظاہر کرنے سے اس وقت اجتناب کیا جاتا ہے لیکن معاملہ جب اتمام حجت کا ہو، اس وقت نبی کو معجزہ عطا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد قوم کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے۔

چوں کہ انسان کی عقل کسی مثال کو دیکھ کر ایک حقیقت کو مانتی اور اس پر غور کرتی ہے۔ اس لیے معجزہ نبوت کی ایک دلیل بھی ہے۔ فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝۱۰۱ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝۱۰۲﴾ (بنی اسرائیل: 101-102)

”اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو اس سے فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تمھیں سحر زدہ آدمی خیال کرتا ہوں۔ موسیٰ نے جواب دیا: تمھیں معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے، آنکھیں کھول دینے کے لیے، اور اے فرعون، میں سمجھتا ہوں کہ تم ہلاکت میں پڑنے والے ہو۔“

معجزہ خدا کا فعل ہے:

یہ دعویٰ کہ معجزہ نبی کا فعل ہوتا ہے، شریعت کی رو سے بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ ظاہر کرنے والا خدا ہے۔ وہ یا تو نبی کے ہاتھ سے معجزہ دکھاتا ہے یا اس کی نبوت کی شہادت کے طور پر خود اتارتا ہے۔ اس حقیقت کی تصریح قرآن کے علاوہ پہلے صحیفوں میں بھی ملتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الرعد: 38)

”اور کسی رسول کے اختیار میں یہ نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا

[1] متہم: جس پر تہمت لگائی جائے۔

Marfat.com

كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

(ابراهيم: 10-11)

''ان کے پیغمبروں نے کہا: کیا تمھیں خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمھیں اس لیے بلاتا ہے تاکہ تمھارے گناہ بخشے اور تمھیں ایک مدت معینہ تک مہلت دے۔ انھوں نے کہا: تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ اچھا لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلا معجزہ۔ رسولوں نے ان سے کہا، ہم تو تمھاری ہی طرح کے انسان ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل کرتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائیں۔ اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

یہاں سلطان مبین، سے مراد اس عذاب کی نشانیاں ہیں جس سے انبیاء کرام اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کا مقصود نبی کی رسالت کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر معجزہ نبی کا فعل ہوتا تو یہ اس کی رسالت کی نہیں بلکہ الوہیت کی دلیل ہوتا۔ اسی لیے نبی پر یہ واجب کیا گیا کہ وہ واضح طور پر یہ کہہ دے کہ معجزہ دکھانا اس کی قوت سے باہر ہے۔

فیصلہ کن معجزہ کا وقت معین ہوتا ہے:

نبی کو جو معجزہ قوم پر اتمام حجت کے لیے دیا جاتا ہے اور جس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے، اس کا وقت خدا کے ہاں متعین ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے کسی امت کی مہلت میں مزید اضافہ فرما دیتا ہے تاکہ وہ معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لائے۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ہدایت اس فہم وبصیرت سے نشوونما پاتی ہے جس کی تربیت نبی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو ایمان معجزہ دیکھ کر لایا جائے وہ محض مقلدانہ ایمان ہوتا ہے جس کے بعد نبی کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں کوئی بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ فیصلہ کن معجزات کے ظہور کے بعد صرف عذاب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کو فیصلہ کن معجزات اسی وقت دیے جاتے ہیں جب قوم کے اندر فکر وفہم کے ذریعے سے ایمان لانے والا کوئی نہیں رہ جاتا اور جو لوگ معجزہ دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھنے کے بعد بھی کم ہی ایمان لاتے ہیں جیسا کہ فرمایا:

﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾ ﴾

(یونس: 74)

''پھر ہم نے اس کے بعد رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لائے مگر لوگ جن باتوں کو پہلے سے جھٹلا چکے تھے ان پر ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم حد سے بڑھ جانے والوں کے دلوں پر اسی

Marfat.com

طرح مہر لگایا کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝﴾ (یونس: 101-102)

''ان سے کہو: آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے، اس کو دیکھو! اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کچھ نفع نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے، یہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن ان لوگوں کو پیش آئے جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دو: انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

پس معجزہ چوں کہ قیامت کے مانند فصل وفرقان [1] ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کے ظہور کے وقت کو غیب میں رکھتا ہے اور نبی اس کا منتظر رہتا ہے۔ کبھی کبھی نبی کا دل لوگوں کے باطل پر اکا کر لینے سے تنگ ہوتا ہے تو وہ فیصلہ طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ نبی معجزہ کے بعد آنے والے عذاب کے اندیشہ سے ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو معجزہ طلب کرتے ہیں۔ چناں چہ مسیح علیہ السلام نے فریسیوں سے یہی سلوک کیا:

''پھر فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لیے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشانی دکھا۔ اس نے جواب میں ان سے کہا شام کو تم کہتے ہو کہ کھلا رہے گا کیوں کہ آسمان لال اور دھندلا ہے۔ تم آسمان کی حرارت میں تمیز کرنا جانتے ہو مگر زمانے کی علامتوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس زمانے کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ اور وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا۔'' [2] (متی 16:1-4)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین عذاب کی جو نشانیاں مانگتے تھے، قرآن نے اس کا جواب بڑی وضاحت سے دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ نشانیاں خدا کے پاس محفوظ ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے منتظر ہیں۔ فرمایا:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝﴾ (یونس: 20)

''وہ کہتے ہیں: ان پر ان کے رب کی جانب سے نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ تو تم جواب دو: غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ تم انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

---

[1] فصل وفرقان: فیصلہ اور فرق کرنے والا۔

[2] مولانا فراہی رحمہ اللہ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ بائبل کا یہ اقتباس ہم نے خود دیا ہے۔ مولانا رحمہ اللہ کا اشارہ بھی اسی اقتباس یا اس جیسی کسی اور عبارت کی طرف ہوگا۔ (خالد مسعود)

Marfat.com

یعنی عذاب کی جن نشانیوں کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ آئیں گی تو ضرور مگر خدا کے ہاں ان کے آنے کا وقت مقرر ہے، جس کا علم صرف خدا کو ہے۔ میں خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی طرح کی آیت یہ بھی ہے:

﴿قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝﴾ (الانعام: 57)

''کہہ دو: میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

یہی مضمون آیت ذیل میں بھی بیان ہوا ہے:

﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الانعام: 66-67)

''کہہ دو: میں تمھارے اوپر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہوا ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے۔''

معجزات کی اقسام:

انبیاء کے مخاطبین جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے ان کی دو قسمیں ہیں:

معجزات کی ایک قسم وہ ہے جن کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو انسان کے حال سے بلند ہوتے ہیں مثلاً خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ یا یہ مطالبہ کہ ان پر آسمان سے ایک کھلی کتاب اتاری جائے۔ دوسرے وہ جن کا تقاضا نبی کی قوت کے بارے میں غلط گمان کی بنا پر کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ نبی ان کے پاس وہ چیزیں لائے جو ان کو محبوب ہیں، اس کا ایک خزانہ ہو یا اس کے ہمراہ فرشتے نازل ہوں۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہوتے ہیں جن کے جواب میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس تاخیر میں دو مصلحتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فہم و تقویٰ رکھنے والے لوگ بصیرت کے ساتھ ایمان لائیں، دوسری یہ کہ ایمان نہ لانے والوں پر حجت تمام ہو جائے اور اس مرحلے سے پہلے ان پر عذاب نہ نازل ہو۔

یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے نبی معجزہ دکھانے کا مطالبہ مسترد کر دیتا ہے۔ ہم نے یہاں ان اسباب کا ذکر مجمل طریقہ سے کیا ہے۔ قرآن میں یہ حقائق تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن کی جن آیات میں معجزات کے مطالبہ کو رد کیا گیا ہے ان سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو کوئی معجزہ عطا نہیں ہوا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں انھوں نے ان آیات کے موقع و محل کو نہیں سمجھا ورنہ قرآن تو خود نبی ﷺ کے ہاتھوں معجزات کے وقوع پر شاہد ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿وَ اِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَ قَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝﴾ (الصافات: 14-15)

Marfat.com

''اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔''

قرآن ایک معجزہ ہے:

ہم مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ قرآن اس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس جیسی کتاب تصنیف کرنے کا دعویٰ کرے لیکن علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کیا پہلو ہے۔ میرے نزدیک اور بیشتر علماء کے نزدیک، قرآن کی فصاحت و بلاغت اس کا اعجاز ہے۔ جو لوگ اس پہلو کا انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی ہدایت اس کا معجزہ ہے۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ﴾ (القصص: 49-50)

''(ان) سے کہو کہ (اگر تم اس کو جھٹلاتے ہو تو) اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اسی کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو۔ اگر وہ تمھارا چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرو کہ بس یہ اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔''

ان علماء کی تقریر ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ ہدایت اسی وقت اھدیٰ [1] اور دلنشین کہلاتی ہے جب وہ ایک ایسے کلام میں پیش کی جائے جو فصاحت و بلاغت کی آخری حد پر ہو۔ پس قرآن کا معجزہ کی حد تک بلیغ ہونا اس کے اھدیٰ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

☆......☆......☆

انسان کے اندر اختیار کی حکمت

انسان پر نعمت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اختیار اور اعلیٰ مراتب کے لیے رغبت رکھی ہے۔ یہیں سے اس کے اندر شر، کج روی اور خواہش نفس کے درآنے کی راہ ملی ہے۔ انسان کو اختیار دینے کا مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کے شکر اور اس کی طرف انابت کے فضائل اسے حاصل ہوں اور وہ عفو اور مغفرت کی خوبیوں کو جان سکے تاکہ وہ رب کریم کی نظر عنایت، اس کی رأفت، عفو اور اس کی رضا کے پانے کا اہل بنے۔ معلوم ہوا کہ رحمت کی انتہا رب کی طرف سے عفو و درگزر اور اس کی مغفرت کے دائرہ کی وسعت ہے۔ اگر اختیار نہ ہوتا تو نعمت کی تکمیل نہ ہوتی۔ اور اگر بندے گناہ نہ کرتے تو رحمت کی وسعت میں کسر رہ جاتی۔ لہٰذا انسان کو جو اختیار ملا ہے اسی نے اس کو اعلیٰ مراتب کے حاصل کرنے کا اہل بنایا ہے اور رب کی رحمت کا مظہر اتم بھی۔ جس طرح وہ اپنے اختیار سے خدا سے منہ موڑتا ہے اسی طرح جب وہ اس اعراض کا کڑوا مزا چکھ لیتا ہے تو اپنے اختیار ہی کی بدولت وہ رب کی طرف لازماً متوجہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی رحمت اور بخشش کا طالب بنتا ہے۔ تب خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کیوں کہ وہ توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، حکمۃ القرآن، ص:96)

[1] اھدیٰ: سب سے زیادہ ہدایت۔

Marfat.com

احکامِ رسول کا قرآنِ مجید سے استنباط

یہ ایک مسلّمہ امر ہے جس میں کوئی مسلمان شک نہیں کرسکتا کہ نبی ﷺ کے ارشادات شریعت کے احکام کی ایک مستقل بنیاد ہیں، خواہ یہ قرآن سے مستنبط [1] ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے دیے ہوئے احکام کتاب اللہ ہی سے مستنبط ہوتے تھے جیسا کہ متعدد احکام کے ضمن میں خود آپ ﷺ نے تصریح فرمائی اور قرآن میں بھی اس پر نصوص موجود ہیں۔ لہٰذا ہمیں اگر رسول اللہ ﷺ کے طریق استنباط کی معرفت حاصل ہوجائے تو ہمیں یہ خیر و برکت اور حکمتوں سے مالا مال کرنے کا باعث ہوگی۔ ان برکات میں سے چند ایک کا ہم یہاں تذکرہ کرتے ہیں اور باقی کو تدبر کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

اولاً، جس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا اسی طرح حکمت اور اسرارِ شریعت کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل کردی تاکہ ہم لوگ اجتہاد کے قابل ہوں، اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھیں اور ظاہری و باطنی دلائل سے استدلال کرنے والے ہوں۔ اس معاملے میں خود حضور ﷺ ہمارے امام اور ہادی ہیں۔ فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴﴾ (النحل: 44)

''اور ہم نے تم پر ذکر اتارا تاکہ تم کھول کر بیان کرو جو لوگوں کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور کریں۔''

پس حضور ﷺ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تاکہ ہم پر تفکر و تدبر کا طریقہ واضح ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تدبر کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ رسول کریم ﷺ کی اقتدا کا بھی حکم دیا اور آپ ﷺ کی یہ حیثیت خاص طور پر واضح فرمادی کہ آپ ﷺ شریعت اور حکمت کی تعلیم دینے والے ہیں۔

ثانیاً، چوں کہ نبی کریم ﷺ کتاب اللہ کے مبین [2] اور مفسر ہیں اس لیے شرائع و عقائد دونوں میں آپ ﷺ کی تاویلات کا علم ایک مفسر کے لیے سب سے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جن مقامات پر حضور ﷺ نے قرآن کے دلالات سے استنباط فرمایا ہے اس کا علم ایک مفسر کے لیے کبریت احمر [3] سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور اصول تاویل کا ایک حصہ ہے۔

ثالثاً، بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ چوں کہ امیوں کی قوم میں سے تھے اس لیے آپ کے ہاں

---

1. مستنبط: استنباط کیا ہوا، ماخوذ۔
2. مبیّن: کھول کر بیان کرنے والا۔
3. کبریتِ احمر: لال گندھک جو کمیاب ہے، بہت قیمتی شے۔

Marfat.com

دقتِ نظر نہیں پائی جاتی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو مخاطب بھی ان کے فہم کے لحاظ ہی سے کیا۔ جو لوگ نبی ﷺ کی ذات کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں وہ قرآن کے متعلق بھی سوءِظن میں مبتلا ہیں۔ وہ اس میں غور وفکر کی ضرورت بالکل نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ظاہر الفاظ پر ہی رک جاتے اور اس کی حکمتوں اور اسرار کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی رائے صریحاً باطل ہے، اس لیے اگر ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے استنباط کی مثالیں پیش کی جائیں تو ان کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوں۔

رابعاً، سلف اور ائمہ کے درمیان کتاب وسنت کی تطبیق کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی صحت کی وجہ سے کتاب وسنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا اور باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں سے کسی ایک کو ترک نہیں کیا لیکن تطبیق کے معاملے میں ان کا اعتماد مضبوط اصولوں کے بجائے ذوق پر رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طریقہ تطبیق میں اور کچھ فروعات میں نزاع باقی رہ گیا۔ حضور ﷺ کے اصولِ استنباط اگر معلوم ہو جائیں تو کتاب وسنت کی تطبیق کا طریقہ واضح ہو جائے گا۔

خامساً، فروعات کے استنباط کی ضرورت پہلے کی نسبت اب کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔ علماء نے اس سلسلے میں کافی کوششیں کیں۔ پھر متاخرین نے استنباط کے اصول بھی وضع کیے اور احکام کے استخراج کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ اس میں ان کے درمیان اختلاف ہوا جس کا واقع ہونا لازمی تھا۔ ان شاء اللہ یہ اختلاف بموجب

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱﴾

(النساء: 31)

''اگر تم ان کبائر سے بچو گے جن سے تمہیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھارے قصور معاف کریں گے اور تمھیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔''

بخشا جائے گا۔

کتاب وسنت میں جو شریعت بیان ہوئی ہے اس سے استنباط مسائل کرنا عین خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔ اس میں جو اختلاف واقع ہوا اس کے سوا چارہ نہ تھا، البتہ اس کے ختم کرنے کی امکانی کوششوں پر ہمارے لیے کوئی پابندی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کا حکم دیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹﴾

(النساء: 59)

''اے ایمان والو! اللہ کی، رسول کی اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔ اگر کسی معاملے میں تم آپس میں جھگڑنے لگو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ تمھارے لیے بہتر اور انجام

Marfat.com

کے لحاظ سے اچھا ہے۔"

پس ہم جب بھی کسی نزاع میں پڑیں تو ہمارے اوپر واجب ہے کہ اپنے اختلاف کو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دیں تا آنکہ نزاع رفع ہو جائے۔

سادساً، اختلاف خواہ اپنی ذات کی حد تک بہت معمولی اور ضرر سے خالی ہو، بسا اوقات بہت بڑے ضرر کا موجب بن جاتا اور خیر و برکت کے دروازے مسدود کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اختلاف سے بچنے کا حکم دیا ہے اور اس کی شناعت [1] کو قرآن وحدیث میں اتنی وضاحت سے بیان کیا کہ آدمی اسے سب سے بڑا گناہ سمجھنے لگتا ہے۔ جب معاملہ یہ ہو تو ضروری ہے کہ علم کے روشن چہرے پر سے اختلاف کے داغ دور کر دیے جائیں۔

احکامِ رسول کی قسمیں:

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ اطمینان ہمیں کیسے ہوگا کہ حضور کا فلاں حکم واقعی قرآن ہی سے مستنبط ہے۔ ہمیں نبی ﷺ کے ہر حکم کے بارے میں صرف سمع وطاعت کی تلقین کی گئی ہے، خواہ آپ کا وہ حکم کتاب اللہ میں آئے یا نہ آئے۔ اوپر ہم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ نبی ﷺ کا ہر حکم قرآن سے مستنبط ہوتا ہے۔ اب ہم اس دعویٰ کی وضاحت کریں گے:

قرآن کی نسبت کے لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کے احکام تین واقعی اور دو فرضی قسموں پر مشتمل ہیں۔ ان قسموں کی تفصیل یہ ہے:

پہلی قسم، وہ احکام جن کے بارے میں حضور ﷺ نے صراحت فرمائی کہ وہ کتاب اللہ سے مستنبط ہیں حالاں کہ ظاہراً کتاب کی نص میں وہ حکم موجود نہیں۔ گویا وہ حکم مستنبط ٹھہرے اور حضور ﷺ کے فرض تبیین کے مطابق ہیں۔ ان احکام میں اصل وفرع پر غور کر کے ان کے استنباط کا پہلو معلوم کرنا دشوار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم، وہ احکام جن کے متعلق حضور ﷺ نے خود کوئی صراحت نہیں فرمائی مگر قرآن سے ان کے استنباط کا پہلو کلام کی دلالتوں کے ایک عارف پر ظاہر ہے۔ پس ایک تو یہ حکم قرآن سے ماخوذ ہونے کی بنا پر صحت سے قریب تر ہوتا ہے اور خدا نے نص کتاب کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ﴾ (النساء: 105)

"ہم نے تیری طرف کتاب اتاری قول فیصل کے ساتھ تاکہ تو لوگوں کے درمیان خدا کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرے۔"

دوسرے، رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں سے زیادہ کتاب اللہ کو سمجھنے والے تھے۔ آپ ﷺ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ جس معاملے کے بعض پہلوؤں کا اشارہ کتاب اللہ میں موجود ہو اس کا کتاب کی روشنی کے بغیر فیصلہ کریں۔

---

[1] شناعت: برا ہونا، برائی۔

Marfat.com

تیسرے، عرب قوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کلام کے اشارات و کنایات کو خوب سمجھنے والے تھے اور حضور ﷺ کو چوں کہ نور و ہدایت اور بصیرت خدا کی طرف سے حاصل تھی اس لیے آپ اس معاملے میں سب سے زیادہ ذکی تھے۔ احکام کی یہی قسم ثانی ہے جس میں بعض وجوہ استنباط علماء پر مخفی رہ گئے ہیں لیکن غور کر کے آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے...... اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرے۔

پس اگر وجوہ استنباط ہم پر واضح ہو جائیں گے تو اصول یہ ہوگا کہ ہم کتاب اللہ کو اصل اور سنت کو اس کی فرع قرار دیں گے۔ صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن پر غور کرتے اور جب اس میں کوئی رہنمائی نہ پاتے تو سنت کی طرف رجوع کرتے۔ اور یہی بات عقلی بھی ہے۔ ان احکام کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ حضور ﷺ نے قرآن کے اشارات سے ان کو مستنبط کیا خواہ ان کے وجوہ استنباط ہم پر مدت ہائے دراز تک مخفی رہیں۔

تیسری قسم، وہ احکام جن کے متعلق قرآن میں کوئی نص وارد نہیں البتہ وہ اس اضافہ کا متحمل ہے۔ ایسے احکام میں ہم سنت کو مستقل اصل قرار دیں گے کیوں کہ ہمیں اطاعت رسول ﷺ کا عام حکم دیا گیا ہے اور رسول ﷺ کا حکم یکساں طور پر پُر از حکمت ہوتا ہے۔ خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور و حکمت کے مطابق ہو جس سے خدا نے آپ ﷺ کا سینہ بھر دیا تھا۔

اب ہم یہ کہیں گے کہ قرآن کی اپنی تعلیم اور اس تجربہ کے مطابق جو ہم نے حاصل کیا، قرآن جس طرح ظاہر میں نور و برہان ہے اسی طرح اپنے باطن میں روح و ریحان ❶ ہے۔ گویا اس کی حیثیت وہی ہے جو ایک زرخیز باغ کے لیے بارش اور سورج کی ہوتی ہے۔ یہ جس طرح اپنی نصوص اور اشارات سے عقلوں کو رہنمائی دیتا ہے اسی طرح اپنے قطرات سے دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ بارش غیب کے آسمان سے ہوتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو قرآن کی جہت مکنون ❷ کی طرف بھی رہنمائی فرمائی۔ ارشاد ہوا:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴾

(الشوریٰ: 52)

”اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف اپنے حکم کی روح وحی کی۔ تم نہیں جانتے تھے شریعت کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو جانتے تھے لیکن ہم نے اسے نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم صراط مستقیم کی طرف بلاتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے اس روح سے نبی کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا۔ اس اعتبار سے حضور ﷺ کے احکام کی تیسری قسم بھی حقیقت میں قرآن سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس

❶ ریحان: ایک خوشبودار پودا، ناز بو، جوہر۔ ❷ جہت مکنون: پوشیدہ پہلو۔

Marfat.com

کا طریقہ استنباط چوں کہ مکنون ہے اس لیے ہم ان احکام میں سنت کو مستقل بنیاد مانیں گے۔

یہ تین قسمیں حضور ﷺ کے احکام کی واقعی قسمیں ہوئیں۔

چوتھی قسم، ان احکام پر مبنی ہے جو کتاب اللہ سے زائد ہیں اور کتاب ان کی متحمل نہیں۔

پانچویں قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو قرآن کے مخالف ہیں۔

یہ آخری دونوں قسمیں فرضی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں کیوں کہ ان سے قرآن کا جلی یا خفی نسخ لازم آتا ہے۔ علماء کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے وہ انہی احکام میں ہوا ہے لیکن یہ احکام گنے چنے ہیں۔ اگر ان کے بارے میں کتاب وسنت کے درمیان توفیق ❶ پیدا کی جا سکے تو نزاع ختم ہو سکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کتاب وسنت کے فہم کا ایک لطیف طریقہ سمجھایا اور اپنے بندے پر ان دونوں کے درمیان توفیق پیدا کرنے کا عظیم دروازہ کھول دیا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ کا کوئی حکم ایسا نہیں رہا ہے جس میں لوگ نسخ وغیرہ کے قائل ہوئے ہوں اور قرآن کے ساتھ موافقت نہ دکھائی جا سکی ہو۔ اب تاریکی کا وہ پردہ چاک ہو گیا ہے جس کے نیچے لوگ اختلاف کرتے تھے۔ اب کتاب اللہ کا چشمۂ صافی ابلنے لگا ہے اور اس کا پانی سنت کی جدولوں سے ہوتا ہوا نور وحکمت کی مبارک کیاریوں کو سیراب کرتا ہے۔

اب ہم قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ❷ کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ واللہ الْهَادِیْ اِلٰی سُبُلِ الصَّوَابِ. ❸

قرآن وسنت کے درمیان توفیق کی چند مثالیں

حدیث رویتِ باری تعالیٰ:

وہ حدیث جس میں رویت باری تعالیٰ کی خبر دی گئی ہے۔ ❹

قرآن کی آیت:

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝﴾ (المطففین: 15)

''ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔''

سے مستنبط ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ رب کریم اور مومنین کے مابین کوئی حجاب نہ ہوگا۔

حدیث لا وصية لوارث:

حدیث لا وصية لوارث (وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں ہو سکتی) احکام میراث سے مستنبط ہے۔ وارثوں کے حصے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں'' اس

---

❶ توفیق: موافقت، مطابقت۔ ❷ تطبیق: مطابقت۔

❸ وَ اللّٰهُ الْهَادِیْ اِلٰی سُبُلِ الصَّوَابِ: اور اللہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

❹ یعنی یہ کہ آخرت میں مومنین کو خداوند تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ (خالد مسعود)

Marfat.com

آیت سے احکام میراث میں ہر کمی وبیشی کی نفی ہوتی ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہو سکتی۔ اس کے حق میں جو وصیت ہے وہ خود خدا نے بیان کر دی اور پھر تصریح فرمادی کہ یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص ان سے تجاوز کرے گا اسے عذاب دیا جائے گا۔

مقدارِ وصیت:

حدیث ((لا وصية فى اكثر من ثلث والثلث اكثر)) ''ایک تہائی سے زیادہ مال میں وصیت نہیں اور ایک تہائی زیادہ سے زیادہ حد ہے۔'' اس تقسیم سے مستنبط ہے جو اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکہ کے سلسلے میں بیان فرمائی ہے۔ اس تقسیم کے تین حصے ہیں، ایک وارثوں کا حصہ، دوسرا قرض کی ادائیگی اور تیسرا وصیت جو مرنے والے نے کی ہو۔ چوں کہ وصیت کا ذکر قرآن نے کر دیا لیکن اس کی مقدار قرآن میں منصوص [1] نہیں تھی اس لیے نبی ﷺ نے اسے حرام نہیں قرار دیا بلکہ مال کے ایک تہائی حصے تک اسے محدود کرنے کا حکم دیا تا کہ احکام وراثت کے مقصود کا تحفظ ہو جائے۔ آیت میراث، جیسا کہ اس کے سیاق سے ظاہر ہے، دراصل ورثا کے حقوق کے تحفظ ہی کے لیے نازل ہوئی۔

البتہ یہ حدیث وصیت کا عام حکم نہیں دیتی بلکہ اس کا حکم اس خاص شخص کے لیے ہے جس کے قرض کی مقدار کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ لیکن اس حدیث کو عام رکھنے میں ایک مصلحت بھی ہے اور وہ یہ کہ جب وصیت جائز ہے تو وارثوں کے ورثہ پانے میں دو موانع [2] ہیں۔ ایک قرض دوسرا وصیت۔

خندہ پیشانی سے بات کرنا صدقہ ہے:

سورہ النساء کی آیت:

﴿فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝﴾ (النساء: 8)

''انھیں اس میں سے کچھ دے دلا دو اور ان سے اچھی طرح بات کرو۔''

اور سورۂ بقرہ کی آیت:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى﴾ (البقرہ: 263)

''اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے اچھا ہے جس کے پیچھے ایذا کی بلا لگی ہوئی ہو۔''

سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خندہ پیشانی سے بات کرنا اور کسی کی غلطی سے درگزر کرنا بھی صدقہ کی ایک قسم ہے۔ یہی حقیقت حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے:

((الكلمة اللينة صدقة))

''نرم بات کرنا صدقہ ہے۔''

---

1. منصوص: جس کی (قرآن میں) نص (حکم) موجود ہو۔
2. موانع: مانع کی جمع، رکاوٹیں۔

Marfat.com

ماں کے حقوق:

حدیث میں آیا ہے کہ کسی شخص نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ وہ کس کے ساتھ احسان کا سلوک کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ۔'' اس نے اپنا سوال دہرایا تو آپ ﷺ نے دوبارہ یہی جواب دیا اور تیسری مرتبہ سوال کرنے پر فرمایا: ''اپنے باپ کے ساتھ۔''

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر ماں اور باپ دونوں کا درجہ برابر رکھا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم حضور ﷺ کے اس ارشادات کی طرف بھی اشارات پاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ (الاحقاف: 15)

''اس کی ماں نے اسے (پیٹ میں) تکلیف سے اٹھائے رکھا اور تکلیف ہی سے جنا۔''

یہاں سے گویا ماں کے ساتھ احسان کے وجوب کی دلیل فراہم فرمائی۔ اس موقع پر باپ کا ذکر ہی حذف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک چیز کا ذکر اور دوسری کو نظرانداز کر دینا برابر نہیں ہوسکتا۔

پھر ایک جگہ یوں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (لقمان: 15)

''اور اگر وہ دونوں تیرے ساتھ اس بات پر جھگڑا کریں کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ ماننا۔''

یہ معلوم ہے کہ یہ جھگڑا بیشتر باپ کی جانب سے ہوتا ہے۔ جہاں تک احسان کے سلوک کا تعلق ہے اسے دونوں کے لیے برابر قرار دیتے ہوئے توحید کے معاملے میں ان کی بات نہ ماننے کی تلقین کی ہے۔

عقل بھی ماں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کی طرف دلالت کرتی ہے۔ ایک تو ماں کو بچے سے محبت زیادہ ہوتی ہے، دوسرے اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر ماں کو اپنے بیٹے کی زیادہ حاجت ہوتی ہے۔

نکاح میں پھوپھی و بھتیجی کو جمع کرنے کی ممانعت:

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر کوئی حکم واجب کیا ہے اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے، مثال کے طور پر مقتول کے قصاص کے ذیل میں فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ (البقرہ: 179)

''تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔''

حکم قربانی کی روح کی طرف یوں توجہ دلائی:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج: 37)

''اللہ کو نہ قربانی کا خون پہنچے گا اور نہ اس کا گوشت بلکہ اسے تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔''

Marfat.com

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کا حکم دے کر اس کی حکمت بیان فرمائی:

﴿لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (المائدہ: 94)

"یہ اس لیے کہ خدا جان لے کہ غیب میں رہ کر کون اس سے ڈرتا ہے۔"

اس طرح کی آیات بے شمار ہیں۔ شریعت کے ہر حکم کے تحت کوئی حکمت ہے اور وہی حکمت اس حکم کا مقصود ہے۔ چناں چہ نبی ﷺ نے ہم پر یہ واضح فرمایا کہ شرائع ہماری اصلاح کے لیے ہیں۔ آپ نے ہر حکم کی حکمت بتائی اور ہر اس بات کو کھولا جو اگرچہ صراحت کے ساتھ قرآن میں بیان نہیں ہوئی مگر حکم کے عموم یا خصوص کے تحت داخل ہے۔

اس طرح کی ایک مثال وہ حکم ہے جس میں آپ ﷺ نے بیوی کے ساتھ اس کی پھوپھی اور خالہ کو نکاح میں جمع کرنے سے روکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بہنوں کو جمع کرنے کی ممانعت (جو خود قرآن سے ثابت ہے) حیا اور صلہ رحمی پر مبنی ہے اور حیا حرمت کی اصل بنیاد ہے۔ اگر اس بنیاد پر غور کیا جائے تو عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو ایک ساتھ کیسے جمع کیا جا سکتا ہے جب کہ اس صورت میں حیا اور صلہ رحمی کے علاوہ بے ادبی کی ایک مزید علت بھی لازم آتی ہے۔

نبی ﷺ کی یہ وضاحت آیت محرمات [1] کے منشا کے خلاف نہیں ہے۔ اس آیت میں نمایاں ترین محرمہ رشتوں کو بیان کر کے بعد میں فرمایا:

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ (النساء: 24)

"تم پر حلال کر دی گئیں وہ عورتیں جو ان کے علاوہ ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ منکوحہ عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ محرمات سے خارج ہیں، لیکن روکا جو گیا ہے تو وہ صرف مشہور رشتوں سے، لیکن آگے جمع بین الاختین [2] کی ممانعت بطور اصل کے آئی کیوں کہ عادتاً یہی واقعہ پیش آ سکتا ہے اور نکاح میں عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو جمع کرنا عادت سے بعید ہے۔ لہٰذا اصل حکم بیان کر کے خلاف عادت واقعہ کا حکم نبی ﷺ کی وضاحت کے لیے چھوڑ دیا گیا جس طرح نماز کی ہیئت اور بے شمار فروعی احکام لسان نبوت کے لیے چھوڑ دیے گئے۔

زنا کی سزا:

جن احادیث کا ماخذ قرآن سے معلوم کرنے میں علماء کو اشتباہ ہوا ہے ان میں وہ حدیث بھی ہے جو حد زنا کے باب میں وارد ہوئی ہے یعنی

((البکر بالبکر مائة جلدة و تغریب عام والثیب بالثیبة مائة جلدة و الرجم))

"اگر زانی غیر شادی شدہ ہوں تو سزا سو کوڑے اور ایک سال جلا وطنی ہے۔ اگر زانی شادی شدہ ہوں تو سزا سو

---

[1] محرمات: مُحَرَّم کی جمع، وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے۔ [2] جمع بین الاختین: دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا۔

Marfat.com

کوڑے اور رجم کی ہے۔''

ان کا خیال یہ ہوا کہ حضور ﷺ کے اس قول سے شادی شدہ زانی کے لیے محض رجم اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے محض سو کوڑے کی سزا کا حکم لازم آتا ہے۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ماعز اسلمی اور غامدیہ عورت کے قضیہ میں رجم کی سزا نے شادی شدہ زانی کے لیے سو کوڑوں اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے ایک سالہ جلاوطنی کا حکم منسوخ کر دیا ہے، ان کے نزدیک گویا آیت حد زنا ❶ اپنے ظاہر مفہوم پر باقی نہیں رہی بلکہ سنت سے تبدیل ہوگئی اور پھر سنت بھی ایک ایسے قضیہ سے تبدیل ہوگئی جس کا موقع ٹھیک معلوم نہیں اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اسے اس کے صحیح محمل پر محمول کیا جا رہا ہے یا نہیں۔

جاننا چاہیے کہ سب سے بنیادی چیز قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔ مجرد ظن کی بنا پر ان کے نسخ کا فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔ حضور ﷺ کے مذکورہ ارشاد میں واضح طور پر آیا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے سزا سو کوڑے اور جلاوطنی ہے۔ دوسری روایت میں ((ثم تغریب عام)) ''یعنی سو کوڑے اور پھر ایک سالہ جلاوطنی'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اسی طرح شادی شدہ زانیوں کے لیے الفاظ ((ثم الرجم)) ''یعنی سو کوڑے پھر رجم'' بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں پہلی حد سو کوڑوں ہی کی ہے۔ لیکن اگر مجرم سزا پانے کے بعد پھر اسی گناہ میں مبتلا ہوں تو انھیں سخت سزا دینا اولیٰ ہے۔ کیوں کہ اب ان کا گناہ حدود اللہ کے مقابلے میں جسارت دکھانے کا ہے اور قرآن نے مفسدین فی الارض اور حدود اللہ کے معاملے میں سرکشی کرنے والوں کے لیے ان کے گناہ کے درجات کے لحاظ سے سزا کے مختلف درجے بیان کیے ہیں، مثلاً تقتیل (بری طرح قتل)، سولی، قطع اطراف (یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا) اور جلاوطنی وغیرہ۔ چناں چہ حضور ﷺ نے ماعز کے قضیہ میں یہ تصریح فرمائی۔ چوں کہ وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کی بداخلاقی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ((ینب کنبیب التیس)) ❷ اس لیے اس کو جو سزا دی گئی وہ نکال (عبرت کی سزا) ہے۔ یہودی عورت کے قضیہ میں آپ نے رجم کا جو حکم دیا ہے وہ توریت کے حکم کے مطابق تھا اور قرآن میں احکام نازل ہونے سے قبل حضور ﷺ توریت کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔

فی الجملہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب جرم ایک سے زیادہ مرتبہ صادر ہوا تو حضور ﷺ نے شادی شدہ لوگوں کو عبرت کے لیے سخت سزا دی اور غیر شادی شدہ لوگوں کو نسبتاً خفیف سزا دی۔ اسی لیے حدیث میں لفظ ((ثم)) ''پھر'' واقع ہوا ہے۔ بعض حدیثوں میں جو 'واؤ' آئی ہے اس سے بھی 'ثم' ہی کا مفہوم مراد ہے اور عربی میں کبھی کبھی 'واؤ' اس معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

---

❶ ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ (النور: 2)
''زانی مرد اور عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

❷ ینب کنبیب التیس: وہ شانڈ کی طرح بار بار جفتی کرتا ہے۔

Marfat.com

قرآن کا طرزِ استدلال

قرآن مجید کے طرز بیان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں استدلال خطابیات کے ذریعے ہے جب کہ خطابیات کا شمار روشن دلیلوں میں نہیں ہوتا اور ان سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے متکلمین کو معاف کرے، انھوں نے بھی یہ بات لکھ دی۔ قرآن مجید کے بارے میں اس ظن فاسد نے اس کی نہایت فیصلہ کن دلیلوں پر تدبر کی راہ میں ایسی دیوار حائل کر دی کہ متکلمین اس صافی وشیریں چشمہ سے پیاس بجھانے سے مایوس ہو کر ظن وگمان اور نقلی فلاسفہ کی مضحکہ خیز خرافات کے کھاری سمندر پر جا اترے۔ میں نے ان لوگوں کی دلیلوں سے واقف ہونے اور ان کی گہرائی میں اترنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ان نام نہاد دلیلوں کو صحرا کے اس سراب کے سوا کچھ نہیں پایا جس کو ایک پیاسا پانی کا ذخیرہ سمجھ لیتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ متکلمین کے اس گمان کو غلط ثابت کروں اور دکھاؤں کہ قرآنی دلائل دل کے زیادہ قریب اور عقل میں گہری جڑیں رکھنے والے ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۹﴾

(العنکبوت : 49)

”بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔“

حجت، دلیل اور آیت میں فرق:

ایک مخالف کے اوپر جس چیز سے دعویٰ ثابت کر دیا جائے اس کو حجت کہا جاتا ہے۔ وہ چیز جس کی مدد سے ایک شخص کسی معاملے میں اپنے حق میں یا اپنے مخالف کے خلاف استدلال کرتا ہے، اس کو دلیل کہا جاتا ہے۔ گویا حجت اور دلیل میں فرق یہ ہے کہ حجت دلیل سے زیادہ خاص نوعیت کی ہے۔ آیت سے مراد وہ چیز ہے جو نظر وفکر کو ابھارتی ہے اور اس کے حوالے سے کسی معاملے میں دلیل لائی جا سکتی ہے۔ یہ گویا مادۂ استدلال کا کام دیتی اور اس کے لیے سبب فراہم کرتی ہے۔ آیت حجت اور دلیل دونوں کے لیے مادہ کا کام دیتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات عام ہے کہ وہ آیات (نشانیوں) کا ذکر کرتا اور ان سے استدلال کرتا ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت دلیل اور حجت کی ہوتی ہے کیوں کہ وہ اس شخص پر دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں جو ان پر غور کرے

Marfat.com

اوران سے استدلال کرے۔ اس حقیقت کو قرآن نے صراحت سے بیان بھی کر دیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳﴾ (الرعد: 3)

''بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔''

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۴﴾ (الرعد: 4)

''بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔''

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝۲۲﴾ (الروم: 22)

''بے شک اس میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ۝۷۵﴾ (الحجر: 75)

''بے شک اس میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

قرآن مجید کے اکثر دلائل میں ایسی چمک ہے جو نظر کو خیرہ کر دیتی ہے اور ایسی گرج ہے جو غور وفکر کے دریچے کھول دیتی ہے۔ قرآن کے مخاطب چوں کہ نہایت ذہین وفصیح، باریک معانی تک فوراً پہنچ جانے والے اور فالتو کلام کی کانٹ چھانٹ میں نہایت سخت تھے، اس لیے قرآن نے دلائل کے لیے منطقیانہ انداز کا سہارا نہیں لیا۔ اگر قرآن اہل منطق کے طریقہ پر اپنے دلائل کو ترتیب دیتا تو یہ چیز سوچنے کے فطری طریقہ سے ان کو کہیں دور لے جاتی۔ یہ بات قدرے تفصیل طلب ہے۔

حجت اور اس کی قسمیں:

حجۃ مصدر احتجاج سے اسم ہے۔ میرے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ مخالف پر کوئی ایسا امر لازم کر دیا جائے جو اس کے نزدیک مسلمات میں سے ہو۔ یہ کام اتنے واضح طریقہ سے کیا جائے کہ مخالف کے لیے صاف ضد کے سوا انکار کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے۔ حجت کے لیے تین چیزوں کا موجود ہونا لازم ہے:

اولاً: مادۂ استدلال جو مخالف کے نزدیک مسلم ہو۔ یہ حجت کے مقدمات ہوتے ہیں۔

ثانیاً: وہ چیز جس کا ثابت کرنا مطلوب ہو۔ اس کا نام نتیجہ ہے۔

ثالثاً: مقدمات کی ترتیب ایسی شکل میں ہو جس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔ اس کو صورتِ حجت کا نام دیا جاتا ہے۔

مادۂ استدلال کے لحاظ سے حجت کی دو قسمیں ہیں۔ اگر مادہ کی بناء فطرت انسانی کی شہادت پر رکھی جائے تو یہ حجت فطری کہلاتی ہے۔ اگر اس کی بنا کسی فریقِ خاص کے مسلمات پر ہو تو اس کا نام حجتِ جدلی ہے۔

مادہ کے حوالے سے حجت اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب وہ مخالف کے نزدیک مسلم ہو جائے۔ حجتِ فطری سے وہ دلیل لائی جاتی ہے جو عام ذہن کو متاثر کرے۔ اس کے برعکس حجتِ جدلی سے کسی فریق خاص ہی پر حجت قائم کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

صورت کے لحاظ سے بھی حجت کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ اگر صورتِ حجت فقط دو مقدمات یعنی صغریٰ و کبریٰ اور ان کے نتیجہ پر مشتمل ہو تو اس کو منطقیانہ حجت کہا جاتا ہے۔ اور اگر اس کی صورت یہ نہ ہو تو اس کا نام خطابیانہ حجت ہے۔ ان دونوں کے فرق کو اس مشہور مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جو منطق میں بکثرت استعمال ہوتی ہے۔ وہ ترکیبِ منطقی یوں ہے:

عالم تغیر پذیر ہے۔ (صغریٰ)

ہر تغیر پذیر چیز حادث [1] ہوتی ہے۔ (کبریٰ)

اس لیے عالم حادث ہے۔ (نتیجہ)

یہی بات اگر خطابیانہ انداز میں کی جائے تو اس کی ان گنت شکلیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تقریر یوں ہوگی کہ عالم کے حادث ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلسل ایک حالت سے دوسری حالت میں اور بناؤ سے بگاڑ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، اس کی کوئی چیز دائمی نہیں۔ یہ صورت حال کسی قدیم ذات کے حسب حال نہیں، لہٰذا عالم قدیم اور غیر حادث نہیں ہو سکتا۔

دوسرے الفاظ میں یہ تقریر یوں کی جا سکتی ہے کہ اس جہان میں ہمارے مشاہدہ میں یہ بات نہیں آئی کہ کسی چیز کو ایک ہی حالت پر بقا حاصل ہو۔ جہان کا کوئی بھی حصہ لے لیں۔ اس میں مسلسل تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ یہ ایک سے دوسری حالت میں بدل رہا ہے۔ اس کے اجزا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے اور جس چیز کے اجزا باہم مخالف ہوں اس کی تعمیر کا کمزور ہونا لازم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جہان اپنے بل بوتے پر ثبات نہیں پا سکتا۔ اس کا وجود مستقل نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک دور میں اس کا کوئی وجود نہ تھا، بعد میں یہ وجود میں آیا۔

حجت منطقی خلافِ فطرت ہے:

حجت کی مذکورہ دونوں قسموں کا مقابلہ کیجیے تو اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

پہلی یہ کہ ترکیب منطقی میں یہ ضروری ہے کہ کبریٰ پہلے سے تسلیم شدہ ہو۔ کبریٰ ہی اس حجت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جب تک وہ ثابت نہ ہو دلیل مکمل نہیں ہوتی۔ منطق مادہ کو ثابت کرنے کے درپے نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی ترکیب ایسی شکل میں کرنے سے سروکار رکھتی ہے کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو نتیجہ خود بخود برآمد ہو جائے۔ اس میں ضروری ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ کون سی چیز ثابت کیے جانے کی محتاج ہے۔ وہ معلوم ہو جائے تو اس کو ثابت کرنے کے درپے ہوا جاتا ہے۔ اگر مخالف کبریٰ کو مان کر نہ دے تو دوسری حجت قائم کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کلام شکست وریخت کا شکار رہتا ہے اور حسنِ نظام سے نکل کر مخاطب پر غلبہ پانے اور اس کو نیچا دکھانے کی کوشش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

---

[1] حادث: قدیم کی ضد، نئی چیز جو پہلے نہ ہوئی ہو، فانی۔

Marfat.com

دوسری بات یہ کہ ترکیبِ منطقی کی بنیاد تجزیہ پر ہے۔ یہ اس طریقے کے خلاف ہے جس کے مطابق ذہن اور خطاب عام طور پر کام کرتا ہے۔ فطرت تمام امور کو مرکب صورت میں سامنے لاتی ہے اور نفس انسانی اسی مرکب صورت ہی میں ان کا احساس اور ادراک کرتا ہے۔ پھر وہ ان میں سے بعض امور کو اسی طرح سے لیتا ہے اور بعض کو دوسرے امور کے ساتھ ترکیب دے لیتا ہے۔ رہا تجزیہ تو یہ دوسری نگاہ میں وجود میں آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل بھی کسی منطقی تجزیہ کے بغیر ہی معانی اخذ کرتی اور حق اور باطل میں امتیاز کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی معاملہ گڈمڈ ہو جاتا ہے اور عقل دلائل میں کسی خلل کا احساس کرتی ہے تو اس وقت وہ منطق کے اصولوں کو استعمال کر کے کلام کے تجزیہ کی طرف مائل ہوتی ہے تاکہ بات کے مختلف اجزا پر غور کرے۔ یہ اسی طرح کا عمل ہوتا ہے جس کا استعمال ہم نظم میں علم عروض کی صورت میں کرتے ہیں۔ شاعر اگر عروض کی صنعت کا عالم بھی ہو تو وہ شعر کہتے وقت ان کو استعمال نہیں کرتا۔ یہی حال سامع کا بھی ہوتا ہے۔ وہ شعر سنتے وقت اس علم کو استعمال نہیں کرتا۔ اس کے استعمال کی نوبت اس وقت آتی ہے جب شعر میں کسی خلل کا احساس ہو یا ایک وزن دوسرے وزن میں گڈمڈ ہو رہا ہے۔ تب شعر کے اجزا کو الگ کر کے اس کو علم عروض کی کسوٹی پر پرکھ لیا جاتا ہے۔ ٹھیک یہی مصرف منطق کا بھی ہے۔ یہ حجت کو مختلف اجزا میں تقسیم کر کے یہ متعین کرتی ہے کہ کون سی چیز دلیل میں سے حذف ہو گئی ہے۔ اگر کوئی چیز زائد ہو تو منطق اس کو دور کر دیتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قدیم و جدید مصنفین کے ہاں آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ وہ اپنے موضوع پر استدلال کرتے ہوئے کبھی منطقی ترکیب کی شکل میں اپنی دلیل کو پیش کرتے ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ان کے لیے بھی مشکل ہوتا اور سننے والوں کی سماعت بھی اس سے بیزار ہو جاتی۔ اس سے طبیعتیں اکتا جاتیں۔ اسی لیے ہوتا یہ ہے کہ مصنفین اپنے فکری بہاؤ کے مطابق لکھتے ہیں اور سننے والے اپنے فہم کے مطابق اس کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ترکیبِ منطقی خلاف فطرت ہے۔ یہ صنعت کلام کو سہل نہیں رہنے دیتی، اس لیے اس کے ماہر خود بھی اس کا لحاظ نہیں رکھ سکتے اور خطابیانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ لطیف مطالب پر کلام کر رہے ہوں جن کو تصور میں لانا لوگوں کے لیے مشکل ہو جیسے الٰہیات کے مسائل، یا بیان ایسے موضوع کا ہو جس کو قبول کرنا لوگوں کو مشکل نظر آتا ہو جیسے اخلاق اور شرائع [1] کے مضامین یا ایک مسئلہ کے دلائل مختلف ہو رہے ہوں اور کوئی شخص ان کو گڈمڈ کرنے کی نیت رکھتا ہو تو وہ منطقی استدلال سے پہلو تہی کرتا ہے تاکہ اس کی دلیل کی کمزوری واضح نہ ہونے پائے۔

اہم چیز مادۂ استدلال ہے:

چوں کہ منطق کو اصل بحث محض کلام کی صورت سے ہوتی ہے جو ایک صنعت ہے، اس لیے حجت خواہ منطقی شکل

[1] شرائع: شریعت کی جمع، شرعی قوانین۔

Marfat.com

میں پیش کی جائے یا خطابی شکل میں اس کا فائدہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ اگر اس کو نتیجے کے حصول کے لیے صحیح طور پر پیش کر دیا جائے تو محض صورت کے باعث اس کی قوت یا ضعف متاثر نہیں ہوتے اور متوسط درجہ کی عقل پر اس کی دلیل مخفی نہیں رہتی۔ اس لیے ہمارے نزدیک دلیل میں صورت اور منطقی شکلوں سے اجتناب ہونا چاہیے، بحث صرف مادۂ دلیل سے ہونی چاہیے جو اصل اہمیت کی چیز ہے اور اسی پر حجت قائم ہوتی یا ساقط ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک جدلی دلیلوں کے مادہ استدلال پر گفتگو کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ تو ایک خاص فریق کے مسلمات کا حصہ ہوتا ہے اور اس کے بارے میں صرف یہ معلوم ہونا کافی ہوتا ہے کہ مخاطب اس کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اصل ضرورت فطری دلائل کے مادہ پر غور کرنے کی ہے۔ اس کی بنیاد فطرت کی درستی کے یقین پر ہے۔ یہ یقین بجائے خود فطری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس اگر اپنی فطرت کی روشنی میں باتوں کا یقین کرنے والا نہ ہوتا تو نہ اس کو علم حاصل ہوتا، نہ اس کا کوئی ارادہ ہوتا، نہ اس کو فکر ونظر کی عادت ہوتی، نہ تحقیق کی جستجو ہوتی اور نہ اطمینان کی تلاش ہوتی۔ مطلق شک ایک باطل خیال ہے۔ فطری یقین کی راہیں کھولنا کلام کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہیے۔

قرآنی استدلال فطری شہادتوں کی بنیاد پر ہے:

قرآن حکیم لوگوں پر ایسے دلائل کے ذریعے حجت قائم کرتا ہے جو فطرت پر مبنی ہیں۔ کبھی کبھی وہ فریق کے خاص مسلمات کے ذریعے بھی حجت قائم کرتا ہے، مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قرآن اپنے مخاطب سے اسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے جس کو وہ مانتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی حجت سے بڑھ کر کوئی حجت دلنشین نہیں ہوسکتی۔

فطرت کی شہادتوں کا معاملہ یہ ہے کہ انسان خواہ زبان سے اقرار نہ کرے، زبانِ حال سے ان کی شہادت لازماً دیتا ہے۔ اگر وہ ان کے وجود کا انکار کرتا ہے تو یہ محض اس کی ضد ہے۔ قرآن نے انسان کو اس کی فطرت کی شہادت پر متنبہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسا نفس رکھ دیا ہے جو اس کے اپنے خلاف گواہ بنا ہوا ہے، وہ اس کو پکارتا رہتا ہے اور لوگ اس کی پکار کو سن کر اس کو جواب بھی دیتے ہیں۔ چناں چہ فرمایا:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝١٤ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝١٥﴾ (القیمة: 14-15)

''بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔''

اس نفس انسانی پر گواہ کئی چیزیں ہیں، مثلاً

خارجی اشیاء کا یقین

اپنے نفس کا یقین

انسان کا ارادہ

انسان کا اختیار

اس کے نفس کا اسے ملامت کرنا

Marfat.com

نیکی اور بدی میں اس کا تمیز کرنا

اور فطرت کی آواز کے دوسرے تمام مظاہر۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اضطرار سے اس پر حجت قائم کی ہے۔ اگر اس کی فطرت کے اندر حقائق کا اقرار موجود نہ ہوتا تو اس کے اوپر یہ حجت تمام نہ ہوسکتی۔ اسی بنا پر قرآن کا استدلال فطری اور اضطراری کہا گیا ہے۔

رہے وہ امور جن پر انسان زبانِ حال سے گواہی دیتا ہے تو وہ مختصراً یہ ہیں:

1۔ ایمان بالغیب: انسان جب دکھائی دینے والی حاضر اشیاء پر ایمان لا چکتا ہے تو اس کے ساتھ نتیجے کے طور پر وہ ان چیزوں پر بھی ایمان لے آتا ہے جو اس کے حواس کی گرفت میں نہیں آتیں۔ کیوں کہ اثر کو دیکھ کر اثر پیدا کرنے والی چیز اور صفت کو دیکھ کر موصوف کی ذات پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ یہ اثر پیدا کرنے والا اور صفت کا مالک چوں کہ خود انسان نہیں ہوتا، اس لیے وہ اس ذات پر ایمان لے آتا ہے جو اس کے حواس سے غائب ہے۔

2۔ حواس کی درستی پر ایمان: اگر انسان کا حواس پر ایمان نہ ہوتا تو وہ نہ اپنے حواس کی بناء پر ان سے خارج کسی چیز پر استدلال کرتا اور نہ کسی ایسے امر پر استدلال کرتا جو داخلی نوعیت کا ہو مثلاً لذت یا الم کا احساس۔ اس صورت میں انسان ایسا بجھا ہوا اور جامد ہوتا کہ نہ اس کے اندر کوئی حرکت ہوتی اور نہ وہ کچھ سوچ سکتا۔

3۔ عقل کی درستی پر ایمان: آدمی جب حواس کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کی بنا پر اثر سے موثر پر استدلال کرتا ہے تو اس میں عقل کی درستی پر اس کا ایمان مضمر [1] ہوتا ہے۔

4۔ قلب کی درستی پر ایمان: یہ ایمان اس امتیاز میں مضمر ہے جو آدمی خیر اور شر کے درمیان اور نفع اور ضرر کے درمیان کرتا ہے۔ انسان کے تمام ارادوں اور تمام حرکات کا منبع اس کا قلب ہے۔ اگر اس کی درستی پر اس کا ایمان نہ ہوتا تو نہ وہ سوچتا اور نہ حرکت کرتا۔ چوں کہ وہ مسلسل سوچتا اور محنت کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ جس طرح اس کا ایمان عقل کی درستی پر ہے۔ اسی طرح قلب کی درستی پر بھی ہے۔

5۔ ترجیح اور اختیار کے اصولوں پر ایمان: انسان اپنے دل اور عقل سے ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دیتا اور کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان عمل میں خود مختار ہونے کا یقین رکھتا ہے اور یہ یقین ہر اس چیز میں مضمر ہے جس کا وہ ارادہ کرتا، جس کو عمل میں لاتا یا جس کو ترک کرتا ہے۔

6۔ عدل وحق پر ایمان: اس کا ثبوت اس چیز سے ملتا ہے کہ آدمی کے ذمے جو حق ثابت نہیں ہوتا وہ اس کا انکار کردیتا ہے۔ اس کے لیے وہ مشقت اٹھاتا، غضبناک ہوتا، دوسروں سے بحث اور جھگڑا کرتا اور دوسروں سے مطالبات رکھتا ہے۔

---

[1] مُضمر: پوشیدہ، دل (ضمیر) میں رکھا گیا۔

Marfat.com

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عدل وحق کے بارے میں انسان کی ضد کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ گھٹیا خواہشات کے پیچھے لگ جاتا اور ان نشانیوں سے تغافل برتتا ہے جو اس کو اعلیٰ لیکن بدیر واقع ہونے والے نتائج پر متنبہ کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ اصولِ ترجیح کی بنیاد پر اپنی عقل اور قلب کے حکم کی مخالفت کر بیٹھتا ہے۔

7۔ اس ذات پر ایمان جس نے وہ تمام چیزیں پیدا کیں جن پر ایمان لانا انسان کی فطرت میں ہے۔ جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی۔

انسان کی فطرت میں یقین ہے، شک نہیں:

یقین انسان کی فطرت میں ہے۔ اس سے وہ پہلوتہی نہیں کرسکتا۔ بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر حیوان کے اندر یقین ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جمادات کی طرح ہو جاتا۔ جو شخص یقین کا انکار کرتا ہے وہ اپنی ذات کی تکذیب کرتا اور اپنے حواس کی مخالفت کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کا انکار تو خود اس بات کا اقرار ہے کہ وہ اپنے کلام کے وجود کا یقین رکھتا ہے، اسے یہ یقین ہے کہ وہ کلام کر رہا ہے۔ اسے یہ یقین بھی ہے کہ وہ اپنی بات مخاطب کو سنا رہا ہے۔ وہ جب کسی معاملہ پر غور کرتا ہے تب بھی وہ اپنے دل میں ایک رائے کا توڑ کرتا اور دوسری رائے کے مضبوط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس طرح اس کو اپنے علم اور اپنی سوچ کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اس کے ارادہ کے نتیجے میں کوئی کام یا حرکت ہوتی ہے تو یہ بھی اس کے یقین کی دلیل ہوتی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مطلق یقین کے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ہمارے نزدیک یقین ضروری ہے اور اسی پر ہر علم اور عمل کی بنیاد ہے۔

(کتاب حجج القرآن سے ماخوذ)

☆......☆......☆

﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾

یہ استثناء عام معنی میں نہیں ہے بلکہ اسی طرح کا استثنا ہے جیسا کہ سورہ غاشیہ میں ہے:

﴿لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ○ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ○ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ○﴾

(الغاشیہ: 22۔ 24)

یعنی جو روگردانی کرے گا اللہ اسے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس پیغمبر کو منتخب کر لیتا ہے، اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور اس کے احوال و معاملات کو جانچتا پرکھتا ہے۔ کلام کے موقع ومحل سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے معاملات میں علم غیب کا محتاج نہیں ہوتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ اس کے معاملہ کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور مصالح کے لحاظ سے اسے ہدایت دیتا رہتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (الطور: 48)

(حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، تعلیقات: سورہ جن: 26۔ 27)

Marfat.com

توحید پر قرآن کا استدلال

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چار امور کے بارے میں اپنی تعلیم کے حق میں بکثرت دلائل دیئے ہیں۔ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، دوسرا اللہ تعالیٰ کو پکارنے میں شرک کا ابطال، تیسرا غیر اللہ کی شفاعت کا مسئلہ اور چوتھا اشیاء کی حلت وحرمت۔آخر الذکر امر یعنی اشیاء کو بلا شرعی دلیل کے اپنی مرضی سے حرام وحلال قرار دے لینا نہایت سنگین حرکت ہے اور چوں کہ باطل عبادت کا زیادہ مدار اسی پر ہے اس لیے قرآن مجید نے اس مسئلے پر بکثرت بحث کی ہے۔

مذکورہ چاروں امور نہایت اہم ہیں۔قرآن نے ان کے ضمن میں یہ بتایا ہے کہ ان میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ساتھ ہی اس نے اپنی حجت بھی واضح کی ہے کیوں کہ یہ امور ایسے ہیں کہ ان میں غلطی ان لوگوں کو بھی شرک کے گڑھے میں لا گراتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔اس پر قرآن نے بدیں الفاظ متنبہ کیا ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ﴾ (یوسف : 106)

''اور ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔''

ان امور کی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان میں قرآن کی حجت کو واضح کیا جائے اور اس بارے میں لوگ جو غلطی کرتے ہیں اس کے اسباب کو دریافت کیا جائے لیکن یہاں ہمارے لیے اس کا موقع نہیں۔ البتہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے مسئلے میں قرآن کے دلائل کی وضاحت کریں گے:

توحید کی دلیل صفات الٰہیہ سے:

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تعلق ہے یہ اللہ تعالیٰ کی نمایاں ترین صفات سے ثابت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ وہ خالق اور قادر مطلق ہے، اس کی رحمت اور بخشش نہایت وسیع ہے، اس کا علم ہر شے کو محیط ہے اور وہ ایک ایسا عادل ہے جو ظلم سے کبھی راضی نہیں ہوتا اور جب وہ کسی بھی ظلم سے راضی نہیں ہوتا تو شرک جیسے سب سے بڑے ظلم سے وہ کیسے راضی ہو سکتا ہے۔قرآن جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے کمال کے حوالے سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس صفت میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح وہ مخلوق...... اور مخلوق بھی کمزور ترین

Marfat.com

مخلوق......کو الٰہ بنالینے کی شناعت ❶ کو واضح کرتا ہے، مثلاً اس نے بتوں کی مذمت میں کہا ہے:

﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝﴾ (الحج: 73)

''اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!''

اس آیت میں بتوں کی تحقیر کا وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت اختیار کیا تھا جب انھوں نے اپنی قوم کے بتکدہ میں داخل ہو کر بڑے بت کے سوا تمام بتوں کے اعضاء توڑ دیئے۔ لوگوں نے جب ان سے استفسار کیا کہ کیا یہ حرکت تم نے کی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿بَلْ فَعَلَهٗ ڰ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: 63)

''بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں۔''

یہ ایک ایسی تحقیر آمیز اور مسکت حجت تھی جس کے جواب میں قوم کے پاس اس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بت بولنے پر قادر نہیں۔

میرے نزدیک بتوں کی بے بسی کا اس سے زیادہ بلیغ اظہار نہیں ہو سکتا کہ یہ کہا جائے کہ وہ مکھی سے بھی زیادہ کمزور ہیں یا یہ کہا جائے کہ وہ جانوروں سے بڑھ کر گونگے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی تذلیل کا اسلوب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ جواب میں ایک اور بلاغت بھی ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بڑے بت سے پوچھ لو بلکہ یہ کہا کہ ان مجروح بتوں سے پوچھو۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ اپنی مظلومیت کا فوری اور موثر اظہار ایک مظلوم ہی کر سکتا ہے۔ اسی اصول پر قیامت کے روز اس مظلوم لڑکی سے، جس کو دنیا میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا، پوچھا جائے گا کہ کس جرم کی پاداش میں اس کو یہ سزا دی گئی تھی۔

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ (التکویر: 8-9)

''اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔''

توحید کے آفاقی دلائل:

قرآن مجید نے آفاق کی شہادتوں کی مدد سے الوہیت کو ثابت کیا ہے۔ جس چیز کا مشاہدہ کائنات میں سب سے نمایاں طور پر ہو رہا ہے وہ اس کا حسن ہے، جس کی طرف قرآن نے یوں توجہ دلائی ہے:

﴿الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (السجدہ: 7)

''وہ (اللہ) ہے جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب بنائی ہے۔''

کائنات کا دوسرا اہم مشاہدہ اس کے مختلف اجزا کے درمیان سازگاری ہے۔ فرمایا:

---

❶ شناعت: برائی (شنیع: برا، گھناؤنا)

Marfat.com

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (الذاریات : 49)

''اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔''

اس سازگاری سے دلیل کا جو پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا خالق بڑی حکمت والا ہے اور اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ حکمت پر مبنی ہے۔

قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حوالہ بکثرت دیا ہے جس کا اظہار کائنات کے ہر گوشے میں ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے حوالے سے توحید پر دلیل قائم کی ہے اور اس سے نبوت اور قیامت پر بھی استدلال کیا ہے۔

جب ہم کائنات میں حسن اور رحمت کا مشاہدہ کرتے اور اس کے اجزا کے درمیان سازگاری دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات مخلوق ہے جس کا پیدا کرنے والا ایک رحیم و حکیم اللہ ہے۔

مخلوقات کے وجود سے خالق کا وجود خود ثابت ہو جاتا ہے۔ جب اس نے پیدا کیا تو اس صفت سے اس کا کمال علم اور کمال قدرت رکھنا بھی ثابت ہوا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ ﴾

(الزخرف : 9)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔''

سورۂ ملک میں فرمایا:

﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ ﴾

(الملک : 14)

''کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟''

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ ﴾

(الانعام : 96)

''وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک (دنوں کا) حساب بنا رکھے ہیں۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔''

یاد رہے کہ آسمان سے زمین تک کائنات کے تمام امور حکمت کے مطابق جاری ہیں۔ یہ جہان شدید قوتوں کے اختلاف کے باوجود قائم ہے۔ مخلوقات کی مختلف طبیعتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں اور یہ سارا جہان ایک ایسے ہدف کی طرف رواں دواں ہے جس کا نہ اس کو علم حاصل ہے اور نہ وہ اس کو جاننے کی قدرت رکھتا ہے۔ پھر کائنات کا

Marfat.com

مجموعی مزاج ایسا ہے کہ اس کا رجحان حکمت کی طرف نہایت واضح نظر آتا ہے۔ یہ سب صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ کائنات پر ایک ایسے مدبر حکیم کا حکم نافذ ہو جس کی قدرت، علم اور رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام اختیار اور کامل علم اس کے سوا کسی دوسرے کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ وہ کائنات میں حصہ داری کا دعویٰ کرے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾ (المومنون: 91-92)

''خدا نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ خدا ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

قرآن نے متعدد ایسی آفاقی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک الٰہ حق کے وجود پر دلیل ہیں۔ مثلاً فرمایا:

﴿وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ (النمل: 88)

''اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرتے ہو کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالاں کہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی کاری گری ہو گی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔ بے شک وہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم تو یہ سمجھتے ہو کہ پہاڑ اپنی اصلیت میں جامد ہیں لیکن حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ قیامت کے روز یہ ریت کی مانند ہو جائیں گے بلکہ بے وزن ہو کر بادلوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا وجود اور مضبوطی اللہ تعالیٰ کی صنعت کی بدولت ہے جس نے ہر شے کو مضبوطی عطا فرمائی۔

اسی کی مانند دوسری آیت ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾﴾ (فاطر: 41)

''اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم وغفور ہے۔''

ان آیات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اجسام کی صفات مثلاً نرمی وسختی، حرارت وبرودت، حرکت وسکون وغیرہ اور اسی طرح نفوس کی صفات مثلاً علم، قدرت، رغبت، نفرت، وغیرہ ان کے مادہ کا جز نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو

Marfat.com

ایک ہی مادہ سے بننے والی مخلوقات ان صفات میں ایک جیسی ہوتیں، وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں نہ بدل سکتیں اور مختلف شکلوں اور طبائع کے مالک اجزا ان سے موافقت پیدا نہ کرسکتے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو تمام اجسام اور نفوس پر تصرف رکھتی ہے۔

توحید کے انفسی دلائل:

نفس کی دو جہتیں ہیں: ایک جہت کا تعلق عقل، علم اور قلب ونظر سے ہے جب کہ دوسری جہت کا تعلق ذوق، جذبات اور لذت سے ہے۔ قرآن نے ان دونوں حوالوں سے توحید پر دلیلیں قائم کی ہیں۔ ہم قدرے وضاحت کرتے ہیں:

عقلی جہت:

نفس کو ادراک، فہم اور نطق کی جو صلاحیتیں حاصل ہیں ان کے ذریعے وہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے جسم کا ایسا مالک ہے جو ارادہ اور فیصلہ کی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلا اور قریبی علم اس کو اپنے وجود، اپنے علم، ارادہ اور اختیار ہی کے بارے میں حاصل ہے۔ ان معاملات میں نہ اس کو کسی قسم کا شک لاحق ہوتا ہے اور نہ اس پر کسی دلیل کی کوئی حاجت ہوتی ہے۔

نفس کے علم میں یہ بات بھی ہے کہ وہ ایک واحد ذات ہے جس کو علم، ارادہ اور اختیار حاصل ہے لیکن اگر ان صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی اس سے سلب کر لی جائے تو وہ پہلی سی ذات نہیں رہے گی بلکہ دوسری مخلوق بن جائے گی۔

نفس کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جو صاحب علم و ارادہ ہوا ہے تو اس حیثیت سے کہ یہ حادث ہے۔ اس کے سامنے اگر یہ سوال آئے کہ بالفرض وہ علم و ارادہ سے عاری ایک لطیف جوہر کی حیثیت سے نئی مخلوق بن جائے تو کیا یہ جوہر قدیم ہوگا یا حادث، تو نفس پورے یقین کے ساتھ اس سوال کا یہ جواب دے گا کہ یہ جوہر بھی حادث ہوگا۔ نفس کا یہ علم پہلے اپنی ذات سے اور پھر کائنات کی دوسری اشیاء سے متعلق ہے۔ کیوں کہ نفس پہلے اپنی ذات کو جانتا ہے اور خارج کی اشیاء کی طرف بعد میں متوجہ ہوتا ہے۔ اگر نفس قدیم ہوتا تو قدامت چونکہ اس کی صفت ہوتی اس لیے وہ کشادہ دلی کے ساتھ اس کا شعور رکھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدامت کا تصور بھی اس کے بس میں نہیں۔ اس کا ادراک کرنے سے وہ عاجز اور اس پر غور کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ وہ جوہر، جو نفس کو محیط ہے، حادث ہے۔

نفس کا حوالہ اگرچہ ایک محدود چیز کا حوالہ تھا لیکن اس سے وہ تین حقائق سامنے آئے جو اوپر مذکور ہوئے۔ انھی کی روشنی میں کائنات کے حوالے سے غور کیجیے تو اس کے لیے بھی تین اصول برآمد ہوتے ہیں:

اولاً: یہ کہ کائنات کا ایک الٰہ ہے جو اس کی تدبیر کرتا اور اس پر تصرف کرتا ہے۔

ثانیاً: یہ کہ وہ الٰہ صرف ایک ہے کیوں کہ اگر اس کو ایک نہ مانا جائے تو اس کی حیثیت ایک محتاج، عاجز اور

Marfat.com

حادث کی رہ جاتی ہے جو الٰہ بننے کے قابل نہیں۔

ثالثاً: یہ کہ نفس کا ایک خالق ہے جو اس کا جز و نہیں۔ وہی ہے جس نے اس کو خلق کیا، اس کو صلاحیتیں دیں اور سننے والا دیکھنے والا بنایا۔ لہٰذا نفس کا اپنے معاملات میں اختیار رکھنا، اس کا ایک ذات ہونا اور عاجز ہونا اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا رب ہر چیز پر اصل متصرف ہے، وہ واحد ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

ذوقی جہت:

ذوقی اعتبار سے نفس ناشکری کو برا فعل سمجھتا ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے واقف ہو جائے تو تکبر اور غفلت اس کو خدا کی شکرگزاری سے نہیں پھیر سکتے۔ اسی لیے قرآن نے نعمتوں کے حوالے سے توحید کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴾ (فاطر: 3)

”اے لوگو! تمھارے اوپر اللہ کا جو انعام ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو! اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔“

دوسری حقیقت یہ ہے کہ نفس اپنی طبیعت کے لحاظ سے اپنے اختیار میں کسی شریک کو برداشت نہیں کرتا۔ ہمارے خاندانوں کے بیشتر معاملات میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسان جب اپنے لیے شریک کو تسلیم نہیں کرتا تو کائنات کے رب کے لیے وہ کیوں شریک تسلیم کر لیتا ہے؟ قرآن نے یہ استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ ﴾ (الروم: 28)

”وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے۔ کیا ہم نے تم کو جو رزق و فضل بخشا ہے اس میں تمھارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟“

شرک کی شناعت کو واضح کرنے کے لیے تورات میں مشرک کو ایک چھنال [1] عورت سے تشبیہ دی گئی ہے جب کہ اس کے برعکس ایک مخلص و موحد بندے کو ایک بیٹے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انسان جس طرح دو باپوں کے تصور کو برداشت نہیں کرتا اسی طرح اپنی بیوی میں کسی دوسرے شخص کو شریک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تورات کی ان تمثیلات کو باطل پسند طبیعتوں نے ان کے مقصد کے خلاف ایک حقیقت سمجھ لیا اور اپنے متعلق یہ دعویٰ کر دیا کہ

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ﴾ (المائدۃ: 18)

---

[1] چھنال: بدکردار عورت۔

Marfat.com

''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔''

تورات کے برعکس قرآن نے اصل حقائق کو روشن کیا ہے اور اس نوع کی تمثیلات استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے جو پہلی امتوں کے لیے مزلہ قدم [1] ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے تورات اور انجیل میں باپ اور بیٹا کے الفاظ مجازی معنی میں استعمال ہوئے، قرآن میں وہاں رب، عبد اور خلیفہ کے الفاظ سے مطلب ادا کیا گیا ہے۔

قرآن نے شرک کے ایک بے بنیاد تصور ہونے پر بھی دلیلیں دی ہیں۔ قوم سبا کی سورج پرستی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ یَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۶﴾ ﴾

(النمل: 25-26)

''شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک لیا ہے کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ پوشیدہ ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا ہے۔ سورج محض خارج کو روشن کرتا ہے لیکن اپنی ذات کے لحاظ سے اندھا ہے اور کسی چیز کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ کسی کو بصر اور بصیرت کی روشنیاں عطا کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ دونوں روشنیاں عطا فرماتا ہے۔ پھر سورج ایک مقتدر حاکم کی قدرت کے تحت ایک نظام میں جکڑا ہوا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ عرش کا مالک اور عظمت والا بادشاہ ہے۔

اسی آیت کی مانند دوسری آیت یوں آئی ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾ ﴾

(الفصلت: 37)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے۔''

اس دلیل کا مدعا یہ ہے کہ مخلوق اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ چوں کہ سورج اور چاند مسخر اور ایک خاص خدمت پر لگے ہوئے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک حکیم وقدیر خالق کی مخلوق ہیں۔

خدا کی ذات کا کامل ہونا اور اس کا الٰہ ہونا شرک کے ابطال پر ایک دلیل کلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کا

[1] مُزِلّہ قدم: قدموں کو ڈگمگانے والی، گمراہ کن۔

Marfat.com

وجوب اوراس کے ہمسروں کی نفی اس بات سے ہی ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا:

﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝﴾ (الانعام: 100-102)

''اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ خالقیت کی صفت سے اللہ تعالیٰ کا مالک ومختار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہر مخلوق خالق کے عبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ چوں کہ فعل تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اس لیے عبادت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا وکیل بھی ہے یعنی ہر چیز کی کفالت اس کے ذمہ ہے۔ اس بارے میں چوں کہ اس کے سوا کسی اور سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی لہٰذا اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پس کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرتا ہے تو اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا حق ادا کرنے سے بھی انکاری ہوجاتا ہے اور خدا کی اس صفت کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اس کا کفیل اور کارساز ہے۔

ایمان علم، عمل اور حال تینوں کے مجموعہ کا نام ہے

دین کی بنیاد علم وعمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت وحالت پیدا ہوتی ہے۔ اسی قلبی کیفیت سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم وعمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور موثر اور ظاہر وباطن میں ہوتا ہے یعنی علم ایمان سے تعلق رکھتا ہے اور عمل اسلام سے۔ (حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، تفسیر سورہ کوثر، ص: 430)

Marfat.com

اعمال کی جزا اور سزا کا تصور

آخرت میں اعمال کی جزا و سزا کا تعلق حکمت تخلیق کی تکمیل اور خدا کی صفت عدل و رحمت سے ہے۔ حکمت تخلیق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے کو موقع دیا جائے کہ اس کے اندر تاثر کی جو قوت ہے وہ اس کو بروئے کار لائے اور جن اثرات کو وہ سمیٹے ہوئے ہے ظاہر کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے جس شے کو بھی پیدا کیا ہے تو اس کو اس کے راز اور عنصر سے خالی کر کے پیدا نہیں کیا۔ اس کے اثرات چوں کہ ایک تسلسل کے حامل ہوتے ہیں اس لیے یہ ایک ترتیب کے ساتھ ظاہر اور خدا کی حکمت کے مطابق ایک دوسرے پر مترتب ہوتے ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کے اندر بھی کچھ اثرات ودیعت کئے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو نمایاں کرتا رہتا ہے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ (النمل: 25)

''(شیطان نے انھیں صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ یہ اثرات چھپے نہیں رہ سکتے، ان کا منظر عام پر آنا لازمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی حیثیت بالکل وہی ہے جو حاملہ کے پیٹ میں اس جنین کی ہوتی ہے جس کے وجود سے حاملہ بھاری ہو رہی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ اس کائنات کے وجود سے قیامت بھی اسی طرح نمودار ہو گی جس طرح حاملہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ فرمایا ہے:

﴿ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ﴾ (الاعراف: 187)

''آسمان و زمین اس (قیامت سے) بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آ دھمکے گی۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ ﴾ (الزلزال: 2)

''اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔''

ان بوجھوں سے مراد وہی اثرات ہیں جو کسی شے کے اندر مخفی ہوتے ہیں اور جن کا ذکر اوپر ہوا۔

ایمان بالغیب عقل پر مبنی ہے:

یاد رہے کہ انسان کے اندر عقل اس کے حواس سے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ عقل کے پیش نظر دائم اور باقی

Marfat.com

رہنے والا حق ہوتا ہے۔ نیز غائب اور حاضر دونوں طرح کے حقائق اس کے لیے یکساں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، جب کہ حواس کو صرف حاضر سے سروکار ہوتا ہے۔ عقل کی اصل فطرت اور اس کے وجود کا نقطہ کمال یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو دیکھنے کے لیے صرف اپنی روشنی کام میں لائے اور حواس پر بھروسہ کر کے حاضر اور فانی چیزوں کو اس حق پر ترجیح نہ دے جو باقی رہنے والا ہے، اور نہ ہی حواس کی ملمع کاریوں کے باعث کسی دھوکہ میں مبتلا ہو۔

ایمان کا عقل پر مبنی ہونا ضروری ہے اور عقل بھی وہ جو حواس کی گرفت میں نہ آنے والے حقائق پر بھی یقین رکھتی ہو۔ جو شخص عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لاتا ہے تو چوں کہ وہ حواس کی جہت سے ایمان لاتا ہے اس لیے عذاب کا خطرہ ٹلتے ہی وہ پھر کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کا ایمان معتبر نہیں ہوتا ہے۔ ایمان بالغیب عقل کی تکمیل ہے۔ اس سے عقل اپنی تخلیق کا اتمام کرتی ہے اور یہی اس کی فطرت کا راز ہے۔

ایمان بالغیب اور تقویٰ:

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نفس کی دو قوتیں ایسی ہیں جن سے وہ کمال کی طرف ارتقا کرتا ہے۔ یہ ہیں علم اور ارادہ۔ ان کا مرتبہ کیا ہے، اس سے آگاہ کرنے کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: 2-5)

''یہ ہدایت ہے اہل تقویٰ کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے۔ اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان بالغیب عقل کی مضبوطی کا نام ہے جس کی مدد سے آدمی ظاہر سے پوشیدہ پر استدلال کرتا اور پھر اس کا یقین حاصل کرتا ہے۔ تقویٰ ارادہ کی درستی اور قلب کی سلامتی کا نام ہے۔

ارادہ عقل کی پیروی کرتا ہے۔ دل کے فساد سے عقل بھی فساد میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان آیات میں تقویٰ کی صفت کو دوسری چیزوں پر مقدم رکھا ہے کیوں کہ ہدایت سے متعلق تمام امور کی شیرازہ بندی اسی سے ہوتی ہے۔ تقویٰ کی اصل یہ ہے کہ آدمی عدل اور حق کا علم رکھتا ہو، بدی کے انجام سے اندیشہ میں مبتلا رہتا ہو اور اس کے ارتکاب سے بچے۔ مخلوقات میں سب سے زیادہ شرف اس کو حاصل ہے جو ایمان بالغیب سے متصف عقل اور علم کا حامل ہو۔ انہی خصوصیات کی بدولت نیکی کا ارادہ ممکن ہوتا ہے اور علم اور ارادۂ خیر ہی مقصد تخلیق ہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک: 2)

Marfat.com

''اس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمھارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔''

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل کو حواس کی اسیری سے بچنے اور دنیا کی لذات سے کنارہ کش ہونے کی تربیت دے تاکہ عقل اپنے مخصوص مشاہدات ہی پر اعتماد کرے اور اپنی فطری رغبتوں کی طرف رجوع کیے رکھے۔ اگر روز جزا قریب نظر آنے والا ہوتا تو یہ تربیت ممکن نہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قیامت کو مخفی رکھا بلکہ اس کا دن موت کے بعد مقرر کیا کیوں کہ موت کے پردے کے پیچھے کے احوال کا علم حواس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

تصور آخرت قرآن کی روشنی میں:

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا اس کو سورہ یونس کی چند آیات بخوبی واضح کرتی ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝﴾

(یونس: 3-4)

''بے شک تمھارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی نہیں۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ کیا تم سوچتے نہیں! اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے ان کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔''

پہلی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ اذن کے بغیر شفاعت کی قیامت میں کوئی گنجائش نہ ہوگی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی شفاعت تربیت عقل اور عدل وقسط دونوں کے منافی ہے۔ دوسری آیت میں ﴿ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ عدل وانصاف کے مطابق جزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ موت بھی ہو اور اس کے بعد نئی زندگی کا وجود بھی ہو۔ اس آیت میں نیکی کے اچھے بدلہ اور بدی کے برے انجام میں بھی فرق کیا گیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''کہ خدا کافروں کو بدلہ دے'' بلکہ فرمایا: ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اس نظام میں قیامت کا اصل مقصود اہل ایمان ہی کی جزا ہے، کافروں کو سزا دینا اصل مقصود نہیں۔

آگے کی آیات میں قرآن نے عقل کے اطمینان کے لیے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ تخلیق کی غایت

Marfat.com

حق ہے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ○﴾ (یونس: 5-6)

”وہی ہے جس نے سورج کو تاباں اور چاند کو نور بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ بے شک رات اور دن کی آمد وشد اور آسمانوں اور زمین کی مخلوقات میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈریں۔“

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ سورج کی تابانی اور چاند کی روشنی، آسمان میں ان کی منزلیں اور ماہ وسال کے حساب میں ان کا استعمال ہونا عقل کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تخلیق ایک حکمت کے تحت ہوئی ہے۔ یہی تعلیم رات اور دن جیسی اضداد کے پے در پے نمودار ہونے اور کسی شے کے مسلسل آنے جانے سے ملتی ہے۔ دنیا میں مختلف انواع واقسام کی مخلوقات کا وجود عقل کو اس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ یہاں تمام امور ایک حکمت کے تحت طے پا رہے ہیں۔ ان مشاہدات سے آدمی کی آنکھ کھلتی ہے، وہ جزا وسزا کے انعقاد کو یقینی سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگتا ہے اور اعمال کے انجام کا خوف اس پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیر سورہ آل عمران کی آیات 190 تا 191 میں بھی موجود ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ○ اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○﴾ (یونس: 7-8)

”جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں اور اسی دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، انہی لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کے اعمال کی پاداش میں۔“

یہاں عقل پر حواس کے غلبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس شخص پر جہالت چھائی ہوئی ہو وہ رب کے سامنے پیشی کی امید نہیں رکھتا۔ وہ اپنی کم ہمتی کے باعث بلند مقاصد کو اختیار کرنے کے بجائے ادنیٰ اور حقیر چیزوں پر قناعت کر لیتا ہے۔ اس کے اندر عدل کی حس ختم ہو جاتی ہے۔ جب وہ دنیا کی محسوس اشیاء سے پوری طرح دھوکہ کھا جاتا ہے تو وہ ان نشانیوں سے غافل ہو جاتا ہے جو اس کے گردوپیش میں بکثرت موجود اور پیہم ظاہر ہو کر مخفی حقائق کو منکشف کرتی ہیں۔ ﴿وَبِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ﴾ کے الفاظ اعمال سے جو اثرات مترتب ہونے والے ہیں ان کو واضح کرنے کے لیے آئے ہیں تاکہ آدمی ان کے تعلق پر متوجہ ہو جائے۔

آگے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ

Marfat.com

﴿الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

(یونس: 9-10)

''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو ان کی منزل پر پہنچائے گا، ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا ترانہ ہوگا: اے اللہ تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی آپس کی تحیت سلام ہوگی اور ان کا آخری کلمہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے'' ہوگا۔''

یہاں ہدایت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے بتائی ہے کہ لوگ اس فرق کو پہچانیں جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ نیز یہ جانیں کہ ایمان ہدایت میں افزونی [1] کرتا ہے یہاں تک کہ ایمان رکھنے والا جنت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ قاری کو یہاں اس خلا کو خود بھرنا ہے جو ہدایت اور جنت کے درمیان موجود ہے۔

آخرت میں ﴿سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ﴾ کے الفاظ سے شکر و حمد کا اظہار اس لیے کیا جائے گا کہ اہل ایمان جس غیب پر ایمان لاتے رہے وہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ تحیت سلام کا سبب یہ ہوگا کہ دنیا میں تو باطل نمایاں اور حق پوشیدہ تھا، اب اللہ نے اہل ایمان کو اس آزمائش سے چھٹکارا نصیب کیا۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کا ترانہ نعمت کی تکمیل پر اس اعتراف کے طور پر ہوگا کہ یہ کامیابی جو ممکن ہوئی تو صرف خدا کے فضل اور اس کی رحمت کے باعث ممکن ہوئی۔

آیات کے مندرجہ بالا مجموعہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف تقویٰ، اللہ کی ملاقات کے شوق، ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری طرف ان کی اضداد کی حیثیت سے دنیوی زندگی پر قناعت، رب کی ملاقات سے ناامیدی، آیات سے غفلت اور بدی کے ارتکاب کو بیان کیا ہے۔ پہلی صفات بندے کو جنت کا مستحق ٹھہراتی ہیں جبکہ دوسری صفات کا انجام دوزخ کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔

سود

سود صدقہ کی ضد ہے، اسی وجہ سے اس کا اثر صدقہ کے اثر کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ صدقہ قلب کو ثبات عطا کرتا ہے اور سود عقل کو خبط کر دیتا ہے۔ سود اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے اور صدقہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا نام ہے۔ پھر صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾

(حمید الدین فراہی، دلائل النظام: 75)

[1] افزونی: افزائش، اضافہ

Marfat.com

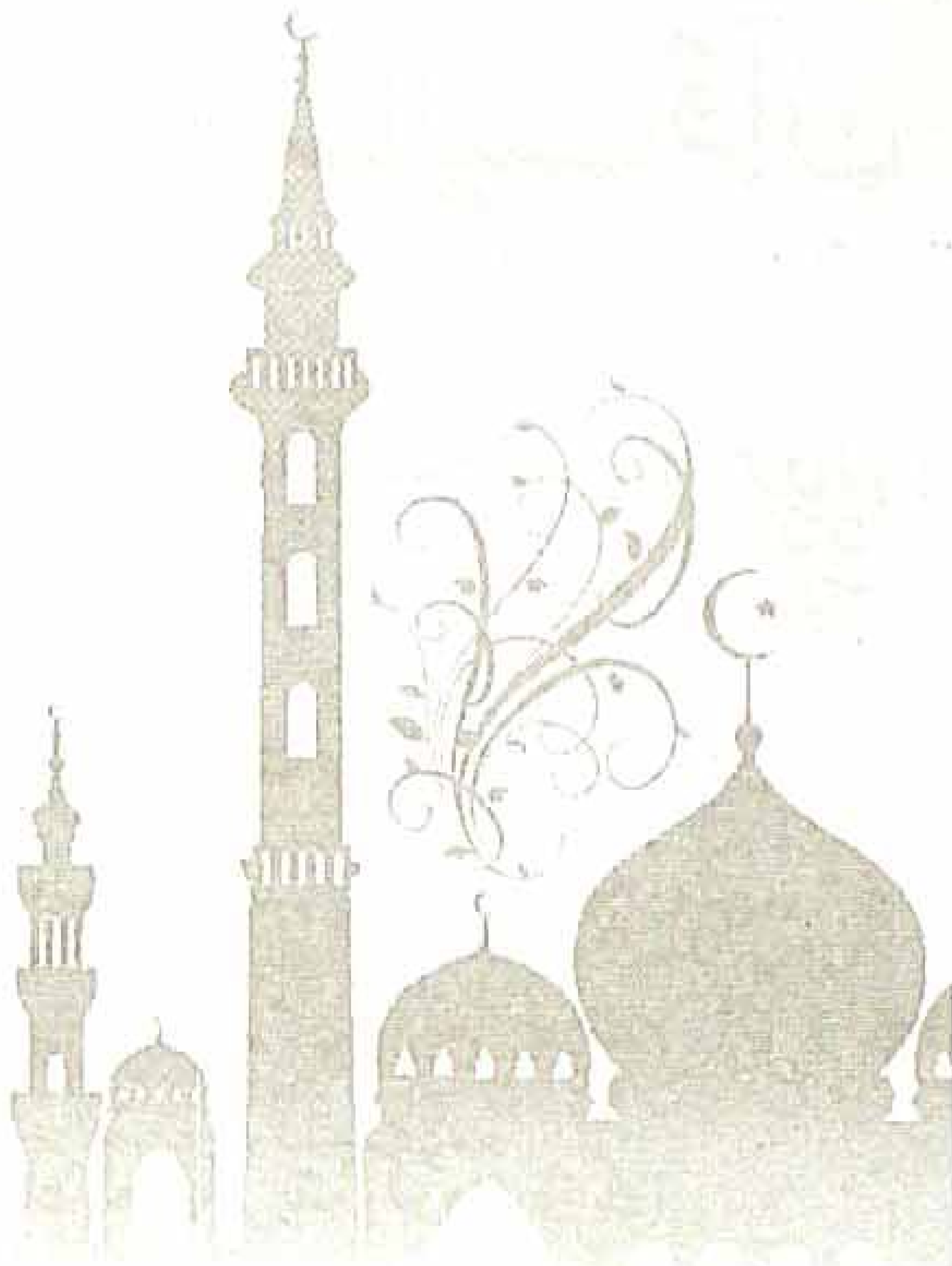

اسالیبِ قرآن

بابِ ہشتم

- اسالیبِ قرآن
- فصل
- تنوعِ خطاب
- اِلتفات
- اِعتراض
- تضمین
- حذف
- حذفِ فعل
- مَعطوف علیہ کا حذف
- مقابل کا حذف
- اجمال کے بعد تفصیل
- مخاطب کو متوجہ اور مُتنبہ کرنے والے اسالیب

Marfat.com

اسالیبِ قرآن

قرآن مجید کے متعلق جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے اور عربی زبان بھی عام طور پر اہل عرب کی نہیں بلکہ خاص اس قبیلہ قریش کی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ پیدا ہوئے اور یہ اس زمانہ کی عربی ہے جس زمانہ میں قرآن کا نزول ہوا۔ اس حقیقت کو خود قرآن مجید نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراهیم: 4)

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کردے۔''

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٥٨﴾ (الدخان: 58)

''پس ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔''

لہٰذا قرآن مجید کے کسی بھی طالب علم کے لیے یہ بات ضروری قرار پاتی ہے کہ وہ اس سے استفادے کے لیے چودہ سو سال قبل کی وہ عربی سیکھے جو قریش کے ہاں مستند سمجھی جاتی تھی، وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں لے جائے۔ الفاظ کے معانی ہوں یا جملوں کا دروبست، ان کا فہم وہ اس ماحول سے حاصل کرے۔ اس بارے میں بعد کے ادوار کی وہ عربی مستند نہیں سمجھی جاسکتی جس میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بیان واسلوب کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ابھی تک ہو رہی ہیں جب کہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں باقی ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا اور جب تک دنیا قائم ہے اسے اسی شکل میں باقی رہنا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے پہلے الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے لہٰذا ایک طالب علم کی جستجو یہ ہوتی ہے کہ زیرِ غور لفظ کے معنی کیا ہیں۔ یہ فعل ہے، اسم ہے یا حرف۔ اس کی اصل کیا ہے اور اس اصل سے یہ کس طرح تبدیل ہو کر بنا ہے۔ اس تبدیلی سے معنی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ مشتق ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ اہل لغت اس کے کیا معنی بیان کرتے ہیں۔ قدیم عرب ادیبوں اور شعراء نے اس سے کس مفہوم کو ادا کرنے میں مدد لی ہے اور خود قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اسے کن کن مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔ چناں چہ قرآن مجید کا ایک طالب علم اپنی اس تحقیق کے لیے کلام عرب کا مطالعہ کرتا ہے، عربی لغات کی طرف رجوع کرتا ہے اور قرآن مجید کے نظائر کو جمع کرتا ہے۔ اس سے اس کو فی الجملہ لفظ کی اصل اور اس کے معانی کو سمجھنے کی راہ ملتی ہے۔

لفظ کی تحقیق کے بعد اس جملے کو سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے جس میں وہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جملے میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں پائے جانے والے الفاظ کا اعراب کیا ہے، کلام کی ترکیب کیا ہے۔ جملے کے دروبست میں الفاظ کیا

Marfat.com

مفہوم دے رہے ہیں۔ اس تحقیق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متعلم عربی زبان کی گرائمر سے واقف ہو۔ صرف ونحو سیکھنے میں اس کو اتنی مہارت ہو چکی ہو کہ وہ جملے کی ساخت کو سمجھ لیتا ہو۔ اور ترکیب کلام کے معانی تک اس کی رسائی حاصل ہو جاتی ہو۔

زبانوں کے سیکھنے میں عام طور پر الفاظ کے معانی اور جملوں کی ساخت سے واقف ہونا کافی ہوتا ہے لیکن معیاری ادب میں بعض اسالیب ایسے پائے جاتے ہیں جو محض گرائمر کی گرفت میں نہیں آتے اور ان کے بغیر کلام کا زور سمجھ میں نہیں آتا۔ قرآن مجید بالاتفاق عربی زبان کی سب سے زیادہ فصیح وبلیغ کتاب ہے۔ اس کی زبان کا معیار اتنا بلند ہے کہ آج تک کوئی شخص اس جیسا ادب پیدا نہیں کر سکا۔ قرآن مجید نے نزول قرآن کے زمانے کے اپنے مخالفین کو یہ چیلنج کیا تھا کہ اس کی ٹکر کا کلام پیش کریں۔ لیکن وہ باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکے۔ یہ چیلنج آج بھی ہر اس شخص کے سامنے ہے جو قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شک رکھتا ہو، وہ بھی اس معاملے میں اسی طرح ناکام ہے جس طرح چودہ سو سال پہلے کا انسان تھا۔ لہٰذا قرآن مجید کی زبان کو بالکل سپاٹ سمجھ لینا محض نادانی ہے۔ اس کتاب میں جہاں ایک ایک لفظ میں جہان معنی آباد ہے وہیں اس کے اسالیب کلام میں بڑا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر ان اسالیب سے واقف نہ ہو تو وہ الفاظ اور جملوں پر سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے اور اس کی رسائی ان معانی تک نہیں ہو سکتی جو فی الواقع ان جملوں کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جملہ حسرت کے ساتھ ادا کیا جائے یا اس کا سبب متکلم کا غیظ وغضب بنا ہو یا اس میں خوشی کا اظہار ہو تو اگر قاری معمولی گرائمر کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو تو وہ اس کے موقع ومحل سے بالکل واقف نہ ہو سکے گا۔ اس طرح بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ اگر ایک قاری یہ بات نہ سمجھ پائے کہ ایک خطاب کس شخصیت یا کس گروہ سے ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک ایسی بات کا مخاطب جو کفار سے کہی گئی ہو، مسلمانوں کو سمجھ لے اور اس طرح قرآن مجید کے مدعا کو بالکل الٹ کر رکھ دے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کا ہر طالب علم اس کے اسالیب کا فہم حاصل کرے اور ان میں اس قدر مہارت حاصل کر لے وہ بہ آسانی کلام کے مدعا کو سمجھتا جائے۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے فہم قرآن کی راہ ہموار کرنے کے لیے جس طرح اصول تاویل قرآن پر رسالے لکھے، اسی طرح بعض اہم الفاظ کی شرح میں مفردات القرآن، گرائمر میں اسباق النحو اور قرآنی اسالیب کے لیے اسالیب القرآن جیسی کتب تصنیف کیں۔ موخر الذکر کتاب دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (اعظم گڑھ) نے 1389ھ میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں مولانا فراہی نے 32 عنوانات قائم کر کے قرآن مجید کے اسالیب کو واضح فرمایا ہے۔ ہر اسلوب کی مثالیں بھی فراہم کی ہیں لیکن یہ کتاب مولانا کی بعض دوسری تصانیف کی طرح مرتب کتاب نہیں ہے بلکہ اشارات ہیں جن پر غور کر کے ایک شخص اپنے لیے فہم قرآن کی راہ نکال سکتا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مولانا کے فکر کو مرتب کیا جائے اور ہر اسلوب کے مزید نظائر فراہم کر کے کتاب کو آسان اور قابل فہم بنایا جائے۔ مولانا کی اصل کتاب عربی میں ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس کے مباحث کو

Marfat.com

واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہمارے اردو دان قارئین بھی مولانا کی تحقیق سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ❶

قِران:

قِران سے مراد دو کلمات یا دو جملوں کا ساتھ ساتھ آنا ہے، خواہ ان کے درمیان کوئی حرف عطف آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ مثال کے طور پر آیت بِسْمِ اللّٰهِ میں صفات اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم ایک ساتھ آئی ہیں۔ یہ دونوں کلمات ایک دوسرے کے قرین کہلائیں گے۔

﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ (البقرہ: 196)

''اور حج وعمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔''

میں الحج اور العمرۃ کے کلمات قرین ہیں لیکن ان کے درمیان حرف عطف آیا ہے جب کہ اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم حرف عطف کے بغیر ہیں۔

﴿اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۸﴾ؕ﴾ (المائدہ: 98)

''جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی۔''

میں دو جملے قرین ہیں۔ پہلے ہم اس قِران کو زیر بحث لائیں گے جو حرف عطف کے بغیر ہو۔

قِران بلا حرفِ عطف:

حرف عطف کے بغیر قِران کا اسلوب اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ تمام قرینوں کا حکم بیک وقت پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ میں صفات رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ، مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ قرین ہیں اور بغیر عطف کے ہیں لہٰذا یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایسی صفات ہیں جو اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ جہانوں کا رب بھی ہے، رحمان ورحیم بھی ہے اور وہی روز جزا کا مالک بھی ہے۔

سورہ النحل میں ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ﴾ (النحل: 120)

''بے شک ابراہیم ایک الگ امت تھے، اللہ کے فرمانبردار اور اس کی طرف یکسو۔''

اس میں اُمَّةً ، قَانِتًا لِّلّٰهِ اور حَنِیْفًا کے کلماتِ قرین بلا حرف عطف ہیں۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں ایک امت تھے۔ وہ اللہ کے فرمانبردار اور اس کی عبادت میں یکسو تھے۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں ہے:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ۙ﴾ (البقرہ: 18)

---

❶ علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ ''حیات رسول امی'' کی اشاعت کے بعد ''اسالیب القرآن'' کو مرتب کرنے کا کام شروع کر چکے تھے۔ اس دوران وہ یکم اکتوبر 2003ء کو رحلت فرما گئے، اس وجہ سے تمام عنوانات مکمل نہ ہو سکے۔ (حسان عارف)

Marfat.com

''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔''

میں ان لوگوں کی تمثیل دی ہے جو بیک وقت بہرے بھی ہیں، گونگے بھی اور اندھے بھی۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی خیرخواہ کی پکار سن کر یا اس سے بات کر کے یا اس کی دکھائی ہوئی علامت دیکھ کر اپنی غلطی پر متوجہ ہوں اور سیدھی راہ پر آجائیں۔

سورہ فتح میں ہے:

﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (الفتح: 29)

''وہ کفار پر سخت، آپس میں رحم دل ہیں۔''

کا مفہوم یہ ہوگا کہ رسول اللہ کے صحابہ کرام، کفار کے لیے تو نہایت سخت جان لیکن آپس میں نہایت نرم خو ہیں۔ یہ دونوں صفتیں ان میں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات عام طور پر قرآن کے اسلوب میں آئی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات تو اوپر کی بحث سے معلوم ہوگئی کہ یہ صفات اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں۔ مزید غور کرنے سے اس قرآن کے بعض اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں، مثلاً:

یہ صفات محض برائے بیت نہیں آئی ہیں بلکہ ان کا تعلق سابق مضمون کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ اس مضمون کے اثبات کے لیے دلیل کے طور پر یا اس سے پیدا ہونے والے اشکال کو رفع کرنے کے لیے آتی ہیں۔ کہیں یہ زائد از ضرورت نہیں ہیں حتی کہ الرحمن اور الرحیم اگرچہ ایک ہی مادہ رحم سے ہیں لیکن ان کے وزن فعلان اور فعیل کے اختلاف نے ان کے معانی میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ فعلان کا وزن شدت، وفور اور جوش پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کے وزن سے تسلسل اور استقلال کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ گویا الرحمن الرحیم کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں صفت رحمت کا وفور اور جوش بھی ہے اور اس میں تسلسل بھی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی نہیں ہوتی۔

بعض اوقات بنیادی صفت اگرچہ ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں اس کی یہ شکلیں نمایاں کر دی جاتی ہیں مثلاً ''عَفُوًّا غَفُوْرًا'' میں عفو و درگزر اور مغفرت ایک ہی صفت کے دو پرتو ہیں۔ ''رَءُوْفٌ رَحِيْمٌ'' میں رافت و رحمت بھی ایک ہی صفت کے دو رُخ ہیں۔ قرآن کے ذریعے یہ مختلف پرتو اور رُخ نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے ایک قاری سمجھ جاتا ہے کہ فلاں صفت کا بروز [1] کن کن شکلوں میں ہوتا ہے۔

بعض اوقات دو صفات قرآن کی صورت میں ایسی آجاتی ہیں جو اگرچہ مختلف ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں کسی کلی معنی میں وہ مشترک ہوتی ہیں مثلاً ''سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ'' میں سننے اور دیکھنے کی دو صفات کا تذکرہ ہے لیکن غور کیجیے تو

[1] بروز: اظہار

Marfat.com

معلوم ہوگا کہ سننا اور دیکھنا علم کے ذرائع میں سے ہیں گویا صفت علم کا حوالہ دو ذرائع علم سے دیا گیا ہے۔سورہ مومن میں صفات ﴿مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ اور سورہ نساء میں ﴿مُخْتَالاً فَخُوْرًا﴾ اسی قبیل سے ہیں۔

کہیں کہیں قِران کی صورت میں ایک صفت پہلی صفت کی توضیح یا تاکید کے لیے آتی ہے مثلاً: ﴿عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ میں صفت عزیز کے حوالہ سے تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اور ذو انتقام میں اسی صفت کا وہ خاص پہلو بیان کیا جس پر آیت کے سیاق وسباق میں زور دینا مقصود ہے، یعنی یہ کہ وہ انتقام بھی لینا جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ لوگوں کو آخرت میں اس ذات سے واسطہ پڑنے والا ہے جو اعمال کا بدلہ دے گی اور کوئی اس سے اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکے گا۔قِران کی یہی شکل ﴿قَوِیٌّ عَزِيْزٌ﴾ اور ﴿قَوِیٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ میں بھی ہے۔

بعض جگہ قِران میں دو متقابل صفات جمع کر دی جاتی ہیں تا کہ قاری ایک صفت پر قانع ہو کر یک رُخا رویہ نہ اپنا لے۔مثلاً ﴿اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ میں صفت احد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور سب سے الگ ہے۔اس کے ساتھ صفت صمد ملادی جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ذات تمام مخلوق کے ساتھ اور سب کا سہارا بنی ہوئی ہے۔اس طرح صفات کا ایسا جامع تصور سامنے آگیا جس سے بندے غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے۔اسی طرح متقابل صفات ﴿هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ میں بیان ہوئی ہیں۔صفت رزاقیت بندوں پر انعام واکرام کی طرف توجہ دلاتی ہے، تو صفت ﴿ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [1] سے خدا کی گرفت کے سخت ہونے کا مضمون ملتا ہے۔یہ دونوں مضامین مل کر بندے کا رویہ درست رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔

کہیں دوسری صفت متقابل نہیں ہوتی لیکن پہلی صفت کے بارے میں پیدا ہونے والی کسی غلط فہمی کو رفع کرتی ہے مثلاً ﴿عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ میں صفت حکیم اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہونے کے سبب سے ہمیشہ معاملہ سخت گیری کا کرتا ہوگا۔صفت حکیم کے حوالے سے یہ واضح کر دیا کہ اس کا ہر پہلو حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ سخت گیری وہ اس جگہ کرتا ہے جہاں اس کا قانون اس کا تقاضا کرتا ہے یہی مفہوم ﴿غَنِیٌّ حَمِيْدٌ﴾ کے قِران میں ہے۔اللہ تعالیٰ غنی یعنی سب سے بے نیاز و بے پروا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے مخلوق کو نظر انداز کر دیا ہے۔وہ حمید یعنی سزاوار حمد کاموں [2] کا منبع بھی ہے۔اس لیے خلق پر اس کا فیض برابر جاری رہتا ہے۔

جب ایک صفت کے ساتھ متعدد مختلف صفات کا قِران ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ تمام صفات کسی ایک جامع مضمون میں مشترک ہیں۔مثلا العزیز الغفار، العزیز الرحیم، العزیز الحکیم اور العزیز العلیم میں صفات الغفار، الرحیم، الحکیم اور العلیم صفت العزیز کے مقابل آئی ہیں۔ان سب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ سب فی الحقیقت ایک ہی صفت کے مختلف پہلو ہیں۔رحمت ومغفرت ایک ہی صفت

---

[1] ذوالقوۃ المتین: سخت پکڑ والا۔

[2] سزاوارِ حمد کام: تعریف کے لائق کام۔

Marfat.com

کے دو رُخ ہیں۔ حکمت علم سے آتی ہے اور اس کا تعلق رحمت سے بھی ہے گویا یہ تمام صفات ایک ہی منبع سے پھوٹتی ہیں۔ دوسری طرف علم بھی قدرت کا تقاضا ہے اور قدرت کا اظہار صفت العزیز سے ہوتا ہے۔ اس طرح قِران مختلف صفات کی وحدانیت کی دلیل بھی بن جاتا ہے۔

قِران بحرفِ عطف:

حروف عطف واؤ، فاء، ثُمَّ، حَتّٰی، اَوْ، اَمْ، بَلْ اور لٰکِنْ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے استعمال کے الگ الگ فوائد ہیں۔ دوسرے حروف کی نسبت واؤ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ دو لفظوں یا جملوں کو واؤ کے ذریعے عطف کرنے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کا حکم جمع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا اعراب بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ معطوف علیہ اور معطوف [1] اسم بھی ہو سکتے ہیں اور فعل بھی۔ ذیل میں ہم ان کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

عطف اسم ظاہر کا اسم ظاہر پر ہو سکتا ہے جیسے

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (البقرہ: 219)

''وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔''

یا

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ﴾ (عبس: 34-35)

''قیامت کے روز آدمی بھاگنا چاہے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے۔''

ان آیات میں خمر و میسر اور اخیہ و امہ ظاہر اسم ہیں۔

کبھی عطف ضمیر کا ضمیر پر ہوتا ہے مثلاً جیسے کہا جائے:

((اَنَا وَاَنْتَ صَدِيْقَانِ)) ''میں اور تو دونوں دوست ہیں۔''

یا

﴿اِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى﴾ (سبا: 24)

''بے شک ہم اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے۔''

پہلے جملے میں دونوں ضمیریں حالت رفع میں ہیں جبکہ سورہ سبا کی آیت میں یہ دونوں منصوب ہیں۔

اسم ظاہر اور ضمیر بھی حرفِ عطف کے ذریعے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

﴿اذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ﴾ (المائدہ: 24)

---

[1] معطوف علیہ: جس پر عطف آئے۔ معطوف: جو عطف کے بعد آئے۔ مثلاً سورہ البقرہ کی آیت میں اَلْخَمْر معطوف علیہ ہے اور الْمَيْسِر معطوف ہے۔

Marfat.com

''تو اور تیرا خداوند دونوں جاؤ۔''

معطوف اور معطوف علیہ کے مابین کبھی کوئی جملہ حائل ہو جاتا ہے لیکن اعراب کی یکسانی کے باعث ان دونوں کو پہچانا جاسکتا ہے۔ مثلاً آیت

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (النساء: 1)

''ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم دگر طالبِ مدد ہوتے ہو اور ڈرو رشتوں کے قطع تعلق سے۔''

میں اللّٰہ اور الارحام معطوف علیہ اور معطوف ہیں۔ درمیان میں ایک جملہ جو اللہ کی صفت ہے حائل ہو گیا ہے۔

اسی طرح آیت:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا﴾ (الانعام: 148)

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا۔''

میں معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان لا حائل ہو گیا ہے۔ فعل کا عطف عموماً فعل پر ہوتا ہے مثلاً

﴿اِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ﴾ (محمد: 36)

''اگر تم ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تمھارے اجر تمھیں دے گا۔''

لیکن قرآن مجید میں بعض ایسے مقام بھی ہیں جہاں اسم کا عطف فعل پر ہے۔ نیز دو اسموں میں معطوف علیہ اور معطوف کا اعراب یکساں نہیں۔ اس کی ایک معروف مثال سورہ بقرہ میں ہے۔ فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ (البقرہ: 177)

یہاں ایمان، انفاق، اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا ہے۔ اس پر الموفون کو عطف کر دیا ہے جو ذوالفعل کی شکل میں ہے۔ اس کا معطوف الصٰبرین ہے جو صفت کی شکل میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ حالت نصب میں ہے جب کہ الموفون حالتِ رفع میں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فعل کے صیغے کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں جب کہ ذوالفعل اور صفت کے صیغے مستقل خصلت اور کردار پر دلیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح مرفوع اسموں کے ساتھ جب منصوب اسم کو عطف کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہے۔ اس کو اہل نحو علیٰ السبیل المدح یا علیٰ سبیل الاختصاص کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

''بلکہ (خدا کے ساتھ) وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر

Marfat.com

صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال کو، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ دیں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔''

بعض جملوں میں معطوف اور معطوف علیہ کو متعین کرنا درمیان میں حائل الفاظ کی بنا پر مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وضو کی آیت میں ہے:

﴿اغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

(المائدہ: 6)

اس آیت میں وجوہ، ایدی اور ارجل ❶ کا نصب کا اعراب یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تینوں الفاظ حرفِ عطف سے مربوط ہیں اور ﴿اِغْسِلُوا﴾ کے حکم میں داخل ہیں جب کہ رء وس کا لفظ مجرور ہونے کے باعث ان سے الگ ہے اور ﴿اِمْسَحُوا﴾ کے حکم میں داخل ہے۔ لہٰذا وضو کرتے ہوئے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کو دھونا ہوگا اور سر کا مسح کرنا ہوگا۔ جن لوگوں نے ارجل کا عطف قرب کے باعث رءوس پر سمجھ لیا، انھوں نے وضو میں پاؤں دھونا ضروری نہیں سمجھا۔ اصل میں آیت وضو کی ترتیب کے بارے میں بھی ہدایت دیتی ہے۔ چوں کہ پاؤں دھونا آخری عمل ہے، اس لیے ترتیب میں اس کو آخر میں لایا گیا۔ بیچ میں سر کے مسح کا حکم حائل ہونے کے باعث لوگوں کو ارجل کے اعراب کے باب میں غلط فہمی ہوئی۔ اعراب کا خیال رکھتے ہوئے آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا:

''اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ۔''

اشہر حرم ❷ کے ضمن میں فرمایا ہے:

﴿صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾

(البقرہ: 217)

''اللہ کی راہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔''

اس آیت میں بھی معطوف علیہ و معطوف کے درمیان حائل جملوں کے باعث مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے۔ لیکن اعراب کا بغور مطالعہ کرنے سے اس بات کا تعین ہوسکتا ہے کہ المسجد الحرام کا تعلق ﴿صَدٌّ﴾ سے ہے اور صد، کفر اور اخراج کے الفاظ حرفِ عطف سے ملے ہوئے ہیں جب کہ بہ میں ضمیر کا تعلق اللہ سے اور منہ میں ضمیر کا

---

❶ وجوہ: وجہ (منہ، چہرہ) کی جمع۔ ایدی: ید (ہاتھ) کی جمع۔ ارجل: رجل (پاؤں) کی جمع

❷ اشہر حرم: حرمت کے مہینے (ذی قعد، ذی الحج، محرم اور رجب)

Marfat.com

تعلق المسجد الحرام سے ہے۔

جہاں تک جملوں کے عطف کا سوال ہے، دیکھا گیا ہے کہ ان جملوں میں عطف ہوتا ہے جو لفظاً یا معناً خبریہ یا انشائیہ ہونے میں متفق ہوتے ہیں اور ان میں کامل مناسبت پائی جاتی ہے، مثلاً جن میں مبتدا یا خبر کی یکسانی پائی جاتی ہے یا فعلیہ جملوں میں ماضی، مضارع اور امر و نہی کا اشتراک ہوتا ہے یا مقابل مضمون پایا جاتا ہے۔ اسمیہ جملوں کی نہایت خوب صورت مثال آیات

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾﴾ (الانفطار: 13-14)

''بے شک نیکوکار عیش میں ہوں گے اور نابکار دوزخ میں۔''

میں ہے۔ یہاں الفاظ کا آہنگ، خبر کی نوعیت اور ظرفیت ❶ کی صورت بالکل ایک جیسی ہے۔ فعل ماضی کے جملوں میں

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ (الاسرا: 81)

''حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا۔''

اور

﴿إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا﴾ (یوسف: 17)

''ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا۔''

میں جملوں کے متضاد یا موافق طور پر مربوط ہونے کی عمدہ مثالیں ہیں۔ فعل مضارع کی مثال کے طور پر آیت

﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ﴾

(آل عمران: 26)

''تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے، اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے۔''

اور آیت ﴿مَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ (یونس: 31)

''کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔''

کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں میں مضمون کا متضاد ہونا نمایاں ہے۔

انشائیہ جملوں کے عطف کی بیسیوں مثالیں قرآن مجید سے دی جا سکتی ہیں۔ یہاں محض مثال کے لیے ہم چند آیات نقل کرتے ہیں:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (البقرہ: 43)

---

❶ ظرفیت: الفاظ کا اسم ظرف ہونا، جیسے سورۃ الانفطار کی آیت میں ''نعیم'' (نعمتوں یا عیش کی جگہ، جنت) اور ''جحیم'' (دوزخ) اسم ظرف مکاں ہیں۔

Marfat.com

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

﴿امْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ﴾ (الملک: 15)

''تم اس کے مونڈھوں میں چلو پھرو اور اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق میں سے برتو۔''

﴿فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (الشوریٰ: 15)

''پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے۔''

﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا﴾ (التوبہ: 82)

''پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ۔''

﴿لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (الاسرا: 29)

''نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اس کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دو۔''

عام طور پر معطوف الیہ اور معطوف فعل کی ایک ہی شکل میں ہوتے ہیں یعنی فعل ماضی کے ساتھ فعل ماضی، مضارع کے ساتھ مضارع اور امر و نہی کے ساتھ امر و نہی، لیکن قرآن مجید میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں۔ جب مرکب عطفی میں مضارع اور امر کو یا دوسرے الفاظ میں خبر اور انشاء کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ مرکب کے دونوں حصوں میں کامل مناسبت موجود ہے اور مضارع حقیقت میں امر ہی کے مفہوم میں ہے۔ مضارع کی شکل اس میں صرف تشویق و ترغیب کا مضمون پیدا کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرہ: 83)

''تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین کے ساتھ احسان کرو گے، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

آیت ﴿إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝﴾ (ہود: 54)

''میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے بالکل بری ہوں۔''

میں معطوف علیہ خبریہ جملہ اور معطوف انشائیہ جملہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے دونوں جملے خبریہ ہیں۔ یہی صورت

﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝﴾ (الانشرح: 1-2)

''کیا ہم نے تمھارا سینہ کھول نہیں دیا اور تمھارے بوجھ کو تمھارے اوپر سے اتار نہیں دیا۔''

کی ہے۔ اس میں بظاہر پہلا جملہ انشائیہ اور دوسرا خبریہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے دوسرا جملہ پہلے جملے کے تابع ہے اس لیے معطوف علیہ اور معطوف میں کامل مناسبت ہے۔ اس اسلوب کی حامل مزید آیات سورہ نبا اور الضحیٰ میں آئی

Marfat.com

ہیں۔ اس کی ایک مثال آیت

﴿اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ﴾

(الاعراف: 169)

''کیا ان سے کتاب کے بارے میں یہ میثاق نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ جوڑیں اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے اس کو اچھی طرح پڑھا بھی۔''

میں موجود ہے۔ اس میں دونوں جملوں کو خبر کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اور ﴿دَرَسُوْا﴾ کو ﴿اَلَمْ یُؤْخَذْ﴾ کے تابع رکھ کر انشائیہ جملہ کی طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

دو جملوں کا عطف بسا اوقات کسی کلی معنی میں دونوں کے اشتراک پر دلیل ہوتا ہے مثلاً سورۃ الرحمٰن میں فرمایا:

﴿اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝﴾

(الرحمن: 5-6)

''سورج اور چاند ایک حساب سے گردش کرتے ہیں اور ستارے اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں۔''

ان آیات کے قِران سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح نجم و شجر اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہیں اسی طرح شمس و قمر بھی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور جس طرح سورج اور چاند اس کے آگے مسخر ہیں اسی طرح نجم و شجر بھی مسخر ہیں۔ گویا محض قِران سے شمس و قمر اور نجم و شجر جیسی بظاہر ایک دوسری سے غیر متعلق چیزوں میں ان کے مسخر ہونے اور خدا کی عبادت میں لگے ہونے کا مشترک و جامع مضمون ظاہر کر دیا۔ سورہ حج کی آیت 18 میں اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے۔

ضروری نہیں کہ حرفِ عطف ہمیشہ واؤ ہو۔ فا بھی بطور حرفِ عطف استعمال ہوا ہے یہ حرف ترتیب اور تعقیب [1] کا فائدہ دیتا ہے یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معطوف علیہ کا عمل پہلے ہوا اور معطوف کا عمل اس کے بعد ہوا، مثلاً حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ہے:

﴿وَ دَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ‫ۗ‬ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ‫ۗ‬﴾

(القصص: 15)

اس آیت میں ''فَوَجَدَ'' اور ''فَاسْتَغَاثَهُ'' ''فَوَكَزَهٗ'' اور ''فَقَضٰى'' میں 'فا' کا استعمال یہ واضح کرتا ہے کہ یہ واقعات یکے بعد دیگرے پیش آئے یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں، پھر یہ ہوا کہ ایک آدمی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا۔ اس کے بعد انھوں نے زیادتی کرنے والے کو مکا رسید کر دیا تو وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آیت کا مکمل ترجمہ یوں ہے:

''اور ایک دن لوگوں کی بے خبری میں وہ شہر میں داخل ہوا تو اس میں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک اس

[1] تعقیب: عقب میں (پیچھے) آنا۔

Marfat.com

کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں کے گروہ میں سے۔ تو جو اس کے گروہ میں سے تھا اس نے اس سے اس شخص کے مقابلے میں مدد کی درخواست کی جو اس کے مخالفوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔"

قرآن مجید کے بعض قسمیہ جملوں میں بھی "فا" کا استعمال ہوا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ معطوف میں کسی نئی چیز کا بیان نہیں بلکہ وہ صرف معطوف علیہ ہی کی کسی متنوع صورت کا بیان ہے۔ مثلاً ہوا چلتی ہے تو کبھی وہ بادِ نسیم کے جھونکے لاتی ہے، کبھی وہ تندی اختیار کر لیتی اور خس وخاشاک کو اڑاتی ہوئی چلتی ہے، کبھی وہ بادلوں کو اٹھا کر ان کو ہانکتی ہوئی دور دراز علاقوں میں لے جاتی ہے۔ ہوا کے ان مختلف رُوپوں کو سورہ ذاریات میں "فـا" ہی کے عمل سے بیان کیا گیا ہے فرمایا:

﴿وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴾ (الذاریات: 1-5)

"شاہد ہیں تند ہوائیں! جو اڑاتی ہیں غبار، پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ، پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ، پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ، کہ جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے۔"

'فا' کی طرح حرفِ عطف "ثُمَّ" بھی ترتیب وتعقیب کے معنی دیتا ہے لیکن اس میں دوسرا فعل قدرے وقفہ کے بعد پیش آتا ہے۔ مثلاً انسان کی پیدائش کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ﴾ (المومن: 67)

"وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے، پھر وہ تم کو وجود میں لاتا ہے ایک بچہ کی صورت میں، پھر وہ تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو، پھر وہ تم کو مہلت دیتا ہے کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔"

ظاہر ہے کہ ان مراحل میں سے ہر مرحلہ کچھ عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ یہ افعال پے در پے نہیں ہوتے۔ ان کے پیش آنے میں جو تاخیر ہوتی ہے وہ حرفِ عطف فا کے بجائے ثم استعمال کرنے سے ظاہر کی گئی ہے۔

صراطِ مستقیم

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کو صراطِ مستقیم کہا ہے اور اسے اللہ کے مخلص بندوں کے لیے رأفت و رحمت اور ابتلاء وآزمائش بنایا ہے۔ (حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ بقرہ: 138)

Marfat.com

فصل

اوپر کے مباحث میں دو جملوں کی ترکیب کے وہ قواعد بیان کیے گئے جن میں حرفِ عطف استعمال ہوتا ہے یا نہیں ہوتا لیکن جملوں میں وصل ہوتا ہے۔ وصل کا انحصار دونوں جملوں کی یکسانی اور ہم آہنگی پر ہوتا ہے۔ جو ان میں صورت یا معنی کے لحاظ سے پائی جاتی ہے۔ دو جملوں کے درمیان جب حرفِ عطف نہ لایا جائے تو یہ صورت فصل کہلاتی ہے۔ اس کے دو خاص اور ایک عام مواقع ہیں۔

فصل کا پہلا خاص موقع وہ ہوتا ہے جب دو جملوں میں کامل وحدت اور معنی کی ایسی یکسانی پائی جائے کہ ایک جملہ دوسرے جملے کی جگہ لے سکے۔ یہ شکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل یا اس کی وضاحت یا اس کی تاکید ہوتا ہے۔ اس کو مثالوں سے واضح کرنا مفید رہے گا۔ حسبِ ذیل آیات پر غور کیجیے۔

❀ ... ﴿اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾﴾ (الشعراء: 132-133)

''اس نے ان چیزوں سے تمھیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو، اس نے تمھاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے۔''

اس آیت میں دونوں جملے جو ﴿اَمَدَّكُمْ﴾ سے شروع ہوتے ہیں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے اہل ہیں یعنی دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل ہے اس لیے اس پر حرف عطف نہیں آیا۔

❀ ... ﴿قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٨١﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾

(المومنون: 81-82)

''انھوں نے بھی وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی تھی۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سرِ نو اٹھائے جائیں گے!''

یہاں ﴿قَالُوْا﴾ سے شروع ہونے والا دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل ہے اس لیے دونوں جملوں میں فصل ہے۔

❀ ... ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾ (البقرہ: 49)

''وہ تمھیں برے عذاب چکھاتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے۔''

اس آیت میں ﴿يُذَبِّحُوْنَ﴾ سے شروع ہونے والا جملہ اس عذاب کی نوعیت کی وضاحت کر رہا ہے جو پہلے جملے میں مذکور ہے۔ اس طرح کی وضاحت بھی کلام میں فصل کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ آیت سورہ ابراہیم میں بھی آئی ہے اور ﴿يُذَبِّحُوْنَ﴾ سے پہلے حرفِ عطف ہے جس کا تقاضا وہاں یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ فرعون متنوع طریقوں سے بنی اسرائیل کو عذاب میں مبتلا کرتا تھا۔ ان میں سے خاص طریقہ کا عذاب وہ تھا جس میں وہ ان کے لڑکوں کو قتل کر کے

Marfat.com

اور لڑکیوں کو زندہ رکھ کر مبتلا کرتا تھا۔

❀ ... ﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝۱۲۰﴾ (طٰہٰ: 120)

''پھر شیطان نے اس کو ورغلایا۔ کہا کہ اے آدم، کیا میں تمھیں زندگیِ دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی [1] نہ آئے؟''

یہاں ''قَالَ'' سے آگے کے جملے نے شیطان کے اس وسوسہ کو کھول دیا ہے جس کی طرف پہلے جملے میں اشارہ کیا گیا تھا۔ یعنی شیطان نے آدم کو جو فریب دیا وہ یہ تھا کہ اس نے ان کو بہتر مستقبل کا لالچ دے کر ورغلایا۔

❀ ... ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ (النجم: 3-4)

''وہ اپنے جی سے نہیں بولتا، یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔''

دوسری جگہ آتا ہے:

❀ ... ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱﴾ (یوسف: 31)

''یہ آدمی نہیں، یہ تو کوئی فرشتہ قدسی ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں اِنْ سے شروع ہونے والا دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں پہلے جملے ہی کے مضمون کو دوسرے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کمال یکسانی کے باعث دونوں جملوں میں فصل ہے یعنی حرفِ عطف نہیں آیا۔

❀ ... ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ﴾

(لقمان: 7)

''اور جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض [2] کرتا ہے گویا ان کو سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کانوں میں بہرہ پن ہے۔''

اس آیت میں ''كَاَنَّ'' (گویا) سے آگے کا جملہ بیچ کے الفاظ ﴿كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا﴾ کی تائید مزید کے لیے آیا ہے۔ یہ کامل وحدت فصل کی مقتضی ہوتی ہے۔

فصل کا دوسرا خاص موقع وہ ہوتا ہے جب دو جملوں میں مذکورہ نوعیت کا کامل اتحاد تو نہ ہو لیکن اسی سے مشابہ کوئی اور ربط پایا جائے۔ اس مشابہت کی ایک عام شکل یہ ہے کہ پہلے جملے سے کوئی سوال مفہوم ہوتا ہو جس کا جواب دوسرے جملے میں فراہم کیا جائے، مثلاً سورہ یوسف کی آیت ہے:

﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ﴾ (یوسف: 53)

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا، نفس تو برائیوں ہی کی راہ سُجھانے والا ہے۔''

---

[1] کہنگی: کُہنہ (پرانا) ہونا۔ [2] اعراض: منہ پھیر لینا۔

Marfat.com

یہاں آیت کے پہلے حصے سے یہ سوال مترشح ہوتا ہے کہ جب الزام زنانِ مصر پر درست ثابت ہوگیا تو اب یوسف علیہ السلام اپنی ذات کو کیوں بری الذمہ قرار نہیں دیتے۔ آیت کا دوسرا حصہ اس کا سبب بیان کر رہا ہے کہ نفس کو کیسے بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا تو کام ہی برائی کا مشورہ دینا ہے۔

﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ﴾ (الذاریات: 28)

''تو اس نے ان سے ایک قسم کا اندیشہ محسوس کیا۔ انھوں نے کہا: تم اندیشہ نہ کرو۔''

اس آیت میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں جو خوف پیدا ہوا وہ اس امر کا متقاضی تھا کہ ان کے مہمان یہ بتائیں کہ وہ کون ہیں اور ان کی آمد کا سبب کیا ہے۔ جملہ ثانی اس سوال کا جواب مہیا کرتا ہے لہٰذا دونوں جملوں میں فصل ہے۔

فصل کا تیسرا اور عام موقع جس سے قرآن مجید کے ایک طالب علم کو کثرت سے سابقہ پڑتا ہے، وہ ہے جس میں یا تو سورہ کا ایک بالکل نیا مضمون شروع ہو رہا ہو یا آیات میں اس طرح کا ربط ہو جس طرح کا ربط دعویٰ اور اس کی دلیل میں، سوال اور اس کے جواب میں۔ سبب اور اس کے نتیجے میں اور عمل اور اس کے انجام میں ہوتا ہے یا جب دو آیتیں ایک بات کے دو مختلف پہلوؤں کو سامنے لا رہی ہوں۔ اس طرح کے موقع پر آیات کے سیاق وسباق پر غور کر کے متعین کرنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین ربط کی نوعیت کیا ہے۔

فصل کی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہر شخص خود فراہم کرسکتا ہے۔ محض مثال کے لیے ہم سورہ اللھب کا حوالہ دیتے ہیں:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّ امْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥﴾ (اللھب: 1-5)

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گیا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی، ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔''

یہاں پہلی آیت سے ایک مضمون کا آغاز ہو رہا ہے لہٰذا حرفِ عطف کی ضرورت نہیں۔ اس میں ابولہب کے اقتدار کے زوال اور اس کی اپنی ذات کے خاتمے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ دوسری آیت میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ ابولہب نے اپنی زندگی کا مقصد جوجمع مال کا بنایا اور اس کی خاطر وہ خبثِ باطن کے ساتھ بظاہر بیت اللہ کی خدمت بھی کرتا رہا، یہ چیزیں اس کو کوئی تحفظ نہ دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا نیا مضمون ہے کہ جو پہلی آیت کی جگہ لینے کا اہل نہیں۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں فصل ہے۔ تیسری آیت میں ابولہب کا وہ انجام بتایا ہے جس سے وہ آخرت میں دوچار ہونے والا ہے۔ یہ مضمون بھی نیا ہونے کے باعث فصل کا متقاضی ہے۔ البتہ تیسری اور چوتھی آیت میں یہ اشتراک موجود ہے کہ چوتھی آیت ابولہب کی بیوی کو ابولہب ہی کے انجام میں شریک کر رہی ہے اس لیے یہاں حرفِ عطف موجود ہے۔

معنوی فصل:

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ کلام ایک خط مستقیم میں چلتا چلتا یک لخت ایک مختلف

Marfat.com

رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ پہلے ایک ہی بات کے کئی پہلو یکے بعد دیگرے سامنے آرہے ہوتے ہیں لیکن ایک مقام پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے اس کا رخ موڑ دیا ہو۔ مزید آگے بڑھیں تو پھر پہلے مضمون سے کڑیاں ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ مقام جہاں سے مضمون مختلف رخ اختیار کرتا ہے، معنوی فصل کا موقع ہوتا ہے۔ اس پر سیاق وسباق کی روشنی میں غور کر کے متعین کرنا پڑتا ہے کہ کلام کی تبدیلی کے اسباب کیا ہیں۔ معنوی فصل کے چند اہم اسباب حسب ذیل ہیں:

1۔ کلام کا ایک مخاطب سے دوسرے مخاطب کی طرف مڑ جانا۔ ظاہر ہے کہ بات ہمیشہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق اور اس کی ضرورت کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے مخاطبین مشرک بھی ہیں اہل کتاب بھی۔ اس کا خطاب کبھی مسلمانوں سے بحیثیت مجموعی ہوتا ہے اور کبھی ان کے کسی خاص طبقہ سے۔ کبھی خطاب کا رخ نبی ﷺ کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک موضوع پر کلام کرتا ہے تو ان میں سے ہر مخاطب کو وہ بقدر ضرورت مخاطب کرتا ہے۔ ایک ایسا قاری جو کلام کے اس تنوع کو نہ سمجھتا ہو وہ تبدیلی خطاب سے پریشان ہو کر رہ جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ قرآن میں ربط نہیں۔ حالاں کہ یہ موقع معنوی فصل کا ہوتا ہے۔ اس کو ہم آگے التفات کے اسلوب کے تحت بیان کریں گے۔

2۔ کلام میں جملہ معترضہ کا داخل ہونا۔ ایسا جملہ سلسلۂ کلام کو منقطع کر کے برسرِ موقع کسی حقیقت کی یاد دہانی، کسی غلط دعویٰ کی تردید یا بات سننے والے کے ذہن میں پیدا ہونے والے شک کو دُور کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہم آگے جملہ معترضہ کے عنوان کے تحت ہوں گے۔

3۔ عربی زبان میں بسا اوقات کلام کا کچھ حصہ حذف کر دیا جاتا ہے کیوں کہ وہ سیاق وسباق کی مدد سے ایک ذہین قاری پر خود بخود واضح ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کو کلام میں کھولنا فصاحت و بلاغت کے خلاف ہوتا ہے۔ جو شخص عربی کے اس اسلوب کو نہ جانتا ہو وہ حذف کے مواقع پر کلام کو غیر مربوط اور غیر متصل سمجھنے لگتا ہے۔ حذف کے اسلوب پر بھی ہم آگے روشنی ڈالیں گے۔

4۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو مضمونوں کو کسی ایسی باہمی مناسبت کی بنا پر جمع کر دیا جاتا ہے جس کی طرف عام آدمی کا ذہن فوراً منتقل نہیں ہوتا اور وہ کلام کو بے ہنگم سمجھتا ہے لیکن ایک ذہین آدمی سیاق وسباق کی روشنی میں اس مناسبت کو سمجھ جاتا ہے۔ یہ موقع بھی معنوی فصل کا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

سورۂ آل عمران میں غزوہ احد پر تبصرہ کے دوران یک لخت سود کی ممانعت کا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ آیت 130 میں فرمایا ہے کہ مسلمانو! بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ۔ اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ اسی ضمن میں چند باتیں کرنے کے بعد پھر وہی جنگ احد پر تبصرہ شروع کر دیا ہے۔ اب کہاں غزوہ میں مسلمانوں کی کارکردگی اور کہاں سود در سود کا مضمون۔ بظاہر دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس مقام پر جنگ کے مقاصد کے لیے مسلمانوں میں جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ پیدا کرنے پر زور دینا چاہتا ہے اور مثبت طور پر اس کی ہدایات دینے کے بجائے منفی طور پر بات کو یوں شروع کیا ہے کہ حُبِ مال دل سے نکالو۔ سود کے مفاسد سے بچو اور انفاق کی طرف آؤ۔ گویا سیاق وسباق اصل بات کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے بالکل کافی ہے لیکن غزوہ اور سود کی مناسبت ذرا سے تدبر کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔

Marfat.com

تنوّع خطاب

قرآن مجید میں خطاب کا رُخ اتنی تیزی سے بدلتا ہے کہ یہ متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے، مثلاً بظاہر اس کے مخاطب عام مسلمان ہوتے ہیں لیکن اصل خطاب ان کے اندر گھسے ہوئے منافقین سے ہوتا ہے یا خطاب بظاہر عام انسانوں سے کیا جاتا ہے لیکن اس کا رُخ یہود کی طرف ہوتا ہے۔ جہتِ خطاب کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں بعض آیات کی تاویل میں یہ حادثہ بھی پیش آ گیا ہے کہ جو خطاب مشرکین سے ہے اس میں روئے سخن نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف سمجھ لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے مواقع پر اہلِ تاویل بعض ناگفتنی باتیں ❶ کہہ جاتے ہیں۔

خطاب میں جہاں جہاں واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے وہاں عام طور پر لوگوں کا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ خطاب کا رُخ نبی ﷺ کی طرف ہے کیوں کہ آپ ﷺ ہی وحی کے اولین مخاطب تھے۔

لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ ہر جگہ نہیں کہی جا سکتی۔ بعض مقامات پر تو بلاشبہ خطاب آنحضرت ﷺ سے آپ کی شخصی حیثیت میں ہے لیکن دوسرے مقامات پر آپ کو مخاطب کر کے کوئی بات صرف اس لیے کہہ دی جاتی ہے کہ آپ امت کے امام اور اس کی زبان ہیں، حقیقی مخاطب وہاں آپ کی امت ہوتی ہے، خواہ وہ سب کی سب مراد ہو یا اس کا کوئی خاص طبقہ۔ کہیں کہیں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہوا ہے لیکن وہاں کسی طور پر بھی نبی ﷺ اصل مخاطب نہیں، بلکہ مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔

قرآن مجید کے اس اسلوب کو واضح کرنے کے لیے ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

❀ ... ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ﴾ (المائدہ: 67)

"اے رسول! تمھاری طرف جو چیز تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔"

❀ ... ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴾ (المدثر: 1-3)

"اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب ہی کی کبریائی کی منادی کر۔"

❀ ... ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ

---

❶ ناگفتنی باتیں: نہ کہنے کی باتیں۔

Marfat.com

﴿أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ (الاحزاب : 50)

''اے نبی، ہم نے تمھاری ان بیویوں کوتمھارے لیے جائز کیا جن کے مہرتم دے چکے ہواور تمھاری ان مملوکات [1] کو بھی تمھارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بطور غنیمت عطا فرمائیں۔''

❀ ... ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝٧٩﴾

(الاسراء: 79)

''اور شب میں تہجد پڑھو، یہ تمھارے لیے نفل (مزید برآں) ہے۔ توقع رکھو کہ تم کو تمھارا رب محمود اٹھانا اٹھائے۔''

ان آیات کو پڑھیے تو پہلی نظر ہی میں آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہاں نبی ﷺ اپنی ذاتی حیثیت سے مخاطب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے قرائن موجود ہیں کہ آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

جہاں آیات میں خطاب واحد ہے لیکن نبی ﷺ بطور وکیل امت مخاطب ہیں، وہاں بھی کوئی نہ کوئی قرینہ ایسا موجود ہے جس سے خطاب کا اصل رُخ متعین ہوسکتا ہے۔ عام طور پر کلام کے تدریجی ارتقاء ہی سے ایسے قرائن یا شواہد روشن ہوجاتے ہیں جو اس بات کا پتہ دے دیتے ہیں کہ مخاطب عامۃ المسلمین ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝٢٣﴾ (الاسراء: 23)

''اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو۔''

اس آیت میں ربك ، عندك اور امر و نہی کی ضمیریں واحد استعمال ہوئی ہیں، لیکن یہ حقیقت کسی شخص پر مخفی نہیں ہوسکتی کہ نزول آیات کے وقت آنحضرت ﷺ کے والدین زندہ نہ تھے کہ آپ کو ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی جاتی۔ لہٰذا یہ خطاب آپ سے شخصی حیثیت میں نہیں ہوسکتا۔ یہاں افرادِ امت مخاطب ہیں اور اس کا قرینہ "لَا تَعْبُدُوْا" کے صیغہ جمع میں موجود ہے۔

❀ ... ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝٤٥﴾ (العنکبوت : 45)

''جو کتاب تم پر وحی کی جارہی ہے اس کو پڑھو اور نماز کا اہتمام کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

اس آیت میں خطاب آنحضرت ﷺ سے بحیثیت وکیل امت ہے کیوں کہ افراد کی تربیت کی ذمے داری جس

---

[1] مملوکات: مملوکہ (لونڈی، کنیز) کی جمع۔

Marfat.com

طرح آپ پر تھی اسی طرح تمام مسلمانوں پر بھی تھی۔ تَصْنَعُوْنَ میں جمع کے صیغہ نے خطاب کا اصل رُخ متعین کرنے کے لیے ایک قرینہ فراہم کر دیا ہے۔

❀ ... ﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ مَا عَلَى الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝﴾ (الانعام: 68-69)

''اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں اور اگر شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اور جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں۔''

یہاں آیت کا آغاز واحد کے صیغوں سے ہوا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مخاطب ہیں لیکن کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اصل مخاطب مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس کے لیے یَتَّقُوْنَ میں جمع کا صیغہ قرینہ فراہم کرتا ہے۔ اس کی مزید دلیل سورہ النساء کی آیت 140 فراہم کرتی ہے جس میں سورہ الانعام کی انہی آیات کی یاد دہانی کراتے ہوئے

﴿لَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ﴾ (النساء: 140)

''تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تا آنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔''

کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان میں جمع کا صیغہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ سورہ الانعام کی آیت میں واحد کا خطاب نبی ﷺ سے بطور وکیل امت تھا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان کافروں کو اللہ کی آیات کی یاد دہانی کراتے رہیں لیکن اگر وہ بحث میں الجھ جائیں تو ان سے کنارہ کشی کریں۔ جب ظالموں کے حساب کا وقت آئے گا تو ان کے کفر کا محاسبہ مسلمانوں سے نہیں کیا جائے گا کیوں کہ مسلمانوں پر صرف یاد دہانی کی ذمے داری ڈالی گئی ہے۔ یاد دہانی کے بعد اگر وہ کفار سے کنارہ کشی اختیار کریں گے تو ان کی بداعمالی کے وبال سے بری الذمہ قرار دیے جائیں گے۔

❀ ... ﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِیْبَةٌ یَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ یَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ۝ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (التوبہ: 50-51)

''اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا تھا اور مگن ہو کر لوٹتے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کے لیے بھروسا کرنا زیبا ہے۔''

Marfat.com

ان آیات میں بھی مخاطب بظاہر نبی ﷺ ہیں لیکن روئے سخن فی الحقیقت مومنین کی طرف ہے جس کی نشاندہی کلام کے دوسرے حصے میں جمع کی ضمیروں سے ہوگئی ہے۔ ایسی آیات میں آنحضرت ﷺ کو اس لیے مخاطب کیا جاتا ہے کہ آپ امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہیں۔

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں نبی ﷺ کو بظاہر نہایت سخت الفاظ میں کسی بارے میں تنبیہہ کی گئی ہے۔ اس طرح کے مواقع پر ایک عام قاری ششدر رہ جاتا ہے کہ عتاب اس قدر سخت کیوں ہوا۔ وہ قرآن کے اس اسلوب سے واقف نہیں ہوتا کہ کلام کا اصل رخ کسی ایسے گروہ کی طرف ہوتا ہے جو لائق خطاب نہیں رہ گیا۔ ان سے جو بات کہنی مقصود ہوتی ہے، وہ منہ پھیر کر ادھر کو، بڑھا کر ادھر کو ہاتھ، کے انداز میں اپنے نمائندہ سے کہہ دی جاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ﴾ (النساء: 105-107)

”ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔“

ان آیات میں خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے اور چوں کہ انداز عتاب کا ہے اس لیے ایک ناواقف آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ کو تنبیہہ کی گئی ہے۔ حقیقت میں عتاب کا رُخ مسلمانوں کے اس گروہ کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ ان کو خبردار کیا ہے کہ اس حرکت سے باز آجائیں، منافقین اب کسی ہمدردی کے مستحق نہیں رہے۔ کلام کا اصل رخ کلام کے تدریجی ارتقا سے واضح ہوگیا ہے کیوں کہ آگے جمع کا صیغہ استعمال کر کے فرمایا ہے:

﴿هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾﴾ (النساء: 109)

”یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمے دار بنے گا۔“

یہاں منافقین کے ہمدردوں کو مخاطب کر کے پوچھا ہے کہ یہاں تو تم ان کی طرف داری میں بول رہے ہو، قیامت کے روز ان کا خیر خواہ کون ہوگا۔

❀ ... ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ ٱتَّقِ ٱللَّهَ وَلَا تُطِعِ ٱلْكَٰفِرِينَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١﴾ وَٱتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٢﴾﴾ (الاحزاب: 1-2)

Marfat.com

"اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ بے شک اللہ علیم وحکیم ہے۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمھارے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے۔ بے شک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔"

ان آیات میں بظاہر نبی ﷺ کو تنبیہ کے انداز میں مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ خدانخواستہ اس بات کا کوئی اندیشہ تھا کہ آپ کفار ومنافقین کی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہوجائیں گے۔ حقیقت میں اس تنبیہ کا رُخ مخالفین کی طرف ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ یہ اشرار کتنا ہی زور لگائیں اور تمھارے لیے فتنے اٹھائیں، تم نہ ان کی باتوں پر ذرا کان دھرنا اور نہ ان کی کوئی پروا کرنا، جو احکام دیے جارہے ہیں ان پر بے دھڑک عمل کرنا۔

❀... ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝﴾

(ھود: 112-113)

"تو تم جمے رہو، جیسا کہ تمھیں حکم ملا ہے، اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا۔ بے شک وہ، جو کچھ تم کررہے ہو، اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جیو جنھوں نے ظلم کیا کہ تمھیں بھی دوزخ کی آگ پکڑے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی۔"

یہاں خطاب کا آغاز نبی ﷺ سے ہے لیکن کلام کے ارتقاء سے معلوم ہوجاتا ہے کہ روئے سخن آپ کے حوالے سے امت کی طرف ہے۔ رہا عتاب کا رُخ تو وہ ان لوگوں کی طرف ہے جو نبی ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ ان پر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ خدا کو تمھاری کوئی پروا نہیں، تم لائق التفات نہیں رہے کہ مسلمان برابر تمھاری دلداری کرتے رہیں۔

اس اسلوب میں یہ بلاغت ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی وبے پروائی کا اظہار ہوتا ہے جن کو سرزنش مقصود ہوتی ہے گویا وہ مخاطب کیے جانے کے لائق ہی نہیں رہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں واحد سے خطاب کے باعث لوگ بے سوچے سمجھے اس کو نبی ﷺ سے خطاب قرار دے دیتے ہیں حالاں کہ وہاں آنحضرت ﷺ نہ ذاتی حیثیت سے مخاطب ہوتے ہیں نہ بحیثیت وکیل امت آپ سے خطاب ہوتا ہے۔ فی الحقیقت یہ خطاب عام اور کلام کا رُخ مخاطب گروہ کے ہر فرد کی طرف ہوتا ہے، گویا وہاں ایک ایک فرد کی توجہ مبذول کرا کر کسی حقیقت سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس اسلوب پر جو آیات آئی ہیں ان میں سے بعض "اَلَمْ تَرَ، اَرَاَيْتَ، اَمْ حَسِبْتَ، مَا اَدْرٰكَ" جیسے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ان کی ضمیریں بظاہر واحد ہیں لیکن ان کا اطلاق عمومی ہے اور کلام کے سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀... ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ﴾ (لقمان: 31)

Marfat.com

''نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔''

یہاں کلام واحد کے صیغہ "اَلَمْ تَرَ" سے شروع ہوا لیکن اس سے مقصود چوں کہ جمع ہے اس لیے "لِیُرِیَکُم" میں جمع کی ضمیر آگئی۔

❀ ... ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۹﴾ۙ﴾ (ابراھم: 19)

''نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں چلتا کر دے اور تمھاری جگہ ایک نئی مخلوق بسائے۔''

اس آیت میں بھی ﴿یُذْهِبْكُمْ﴾ میں جمع کی ضمیر لا کر اس بات کا قرینہ فراہم کر دیا ہے کہ ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کے خطاب واحد کا اصل مقصود جمع ہی ہے۔

❀ ... ﴿اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ؕ﴿۱﴾﴾ (الفیل: 1)

''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟''

اس آیت پر غور کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ تاریخی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ واقعہ فیل کا مشاہدہ کرنے والوں میں نہیں تھے۔ آپ کی ولادت اس سال ہوئی جس سال یہ واقعہ پیش آیا۔ اس آیت کا انداز بھی زجر وتنبیہ [1] کا ہے جو اس بات کا قرینہ فراہم کرتا ہے کہ اس سے مخاطب وہ لوگ ہونے چاہئیں جنھوں نے واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے لیکن انھوں نے اس واقعے کے نتائج وعواقب پیش نظر رکھنے میں غفلت کی۔ قرآن مجید نے ان کو ان کی ذمے داری یاد دلانے کے لیے زجر کا انداز اختیار کیا ہے اور وہ لوگ فرداً فرداً اس آیت کے مخاطب ہیں۔

"اَمْ حَسِبْتَ، اَرَاَیْتَ" اور "مَا اَدْرٰكَ" والی آیتوں کو بھی "اَلَمْ تَرَ" سے شروع ہونے والی آیات پر قیاس کرنا چاہیے۔

بعض آیات میں فعل واحد استعمال ہوا ہے لیکن سیاق کلام واضح کر دیتا ہے کہ وہاں بھی خطاب عام ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ؕ﴿۷﴾﴾ (التین: 7)

''تو اب کیا ہے جس سے تم جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو؟''

اس آیت کے خطاب کو سمجھنے میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض اس کا مخاطب نبی ﷺ کو قرار دیتے ہیں حالاں کہ سیاق وسباق اور موقع استفہام کے لحاظ سے یہ تاویل صحیح نہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مخاطب انسان

[1] زجر وتنبیہ: ڈانٹ ڈپٹ اور وارننگ۔

Marfat.com

ہے۔ اس سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا یہاں ایک چیز بھی ایسی ہے جو وقوع جزا کے اعتقاد کو غلط ثابت کر رہی ہو؟

❀ ... ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾﴾ (الکھف: 18)

''اگر تمھاری نظر ان پر پڑ جاتی تو تم وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تمھارے اندر ان کی وحشت سما جاتی۔''

اس آیت سے پہلے اصحاب کہف کے اس غار کی منظر کشی کی گئی ہے جس میں انھوں نے پناہ لی تھی۔ وہاں نیند کی حالت میں ان کی ہیئت کذائی کا ذکر کرتے ہوئے اس آیت میں بتایا ہے کہ ہر دیکھنے والے فرد کے لیے یہ منظر بے حد خوفزدہ کرنے والا تھا۔ گویا واحد کا خطاب عام معنی میں ہے۔

❀ ... ﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾﴾ (النساء: 88)

''پس تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہو رہے ہو۔ اللہ نے تو انھیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے۔ کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔''

یہاں ''لَكُمْ'' اور ''تُرِيْدُوْنَ'' کی ضمیریں جمع ہیں۔ اس قرینہ کی موجودگی میں نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ آگے ''لَنْ تَجِدَ'' میں واحد کا خطاب نبی ﷺ سے نہیں بلکہ عام ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک مثال سورہ بقرہ کی آیات 104 تا 106 میں ہے۔ وہاں خطاب اہل ایمان سے ہے۔ ان کو چند مجلسی آداب کی تعلیم دینے اور مشرکین اور اہل کتاب کے دلوں میں ان کے خلاف جو کینہ پایا جاتا ہے اس سے خبردار کرنے کے بعد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾﴾ (البقرہ: 106)

''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟''

ظاہر ہے کہ اس آیت میں واحد سے جو خطاب کیا ہے اس سے مراد حقیقت میں جمع ہی ہے۔ چناں چہ اگلی ہی آیت میں ''مَا لَكُمْ'' میں پھر جمع کی ضمیر استعمال کر دی ہے۔

ایسے مواقع پر پہلے قرائن سے خطاب کا رُخ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر اس کی کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو حسن تاویل کو پیش نظر رکھ کر کلام کا رُخ معین کرنا چاہیے۔ اس بات کو اصولی طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو ایک لفظ مشترک پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے کئی معنی ہوتے ہیں لیکن کسی محل میں ہم اس کا وہی معنی اختیار کرتے ہیں جو سیاق کلام کی روشنی میں سب سے زیادہ موزوں و مناسب ہوتا ہے، دوسرے معانی کو ہم ترک کر دیتے ہیں۔ یہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہونا چاہیے جب کوئی خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو۔

Marfat.com

اِلتفات

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اس میں مضمون کی اس طرح کی بندش پائیں گے جو نثری مضامین کا خاصہ ہوتی ہے یعنی یہ کہ پہلے موضوع کا تعارف کرایا جائے گا، پھر اس کو زیر بحث لایا جائے گا، اس سے متعلق ضروری دلائل فراہم کیے جائیں گے اور آخر میں بحث کو سمیٹا جائے گا۔ لیکن جب وہ کسی سورہ کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو کلام میں اس طرح کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی بلکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کلام کا رخ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ ابھی رسول اللہ ﷺ مخاطب تھے کہ اگلی ہی آیت میں خطاب مومنین کے ساتھ ہو گیا۔ ابھی مشرکین یا اہل کتاب مخاطب تھے کہ چند ہی آیات کے بعد مسلمانوں کے کسی طبقے سے کلام شروع ہو گیا۔ یہ انداز نثری مضامین میں اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ اگر ملتا تو خطیبوں کے ہاں ملتا ہے۔ یہ عربی ادب اور قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے جس کو التفات کا نام دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی حیثیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک آسمانی خطیب ہے جو روئے زمین کے تمام انسانوں کو خطاب کر رہا ہے۔ خطیب کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اپنے سامعین کو پیش نظر رکھتا ہے۔ چوں کہ سامعین میں مختلف مزاج واستعداد اور سوچ رکھنے والے لوگ شامل ہوتے ہیں اس لیے وہ ہر ایک کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بات کرتا ہے۔ وہ کبھی دائیں جانب مڑتا ہے کبھی بائیں جانب، کبھی قریب والوں سے ہم کلام ہوتا ہے کبھی دور والوں کو مخاطب کرتا ہے تاکہ تمام سامعین کے ساتھ اس کا رابطہ رہے۔ ہر گروہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کا لہجہ بدلتا ہے اور اس کا پیغام ہر ایک کے لیے الگ ہوتا ہے۔ قرآن مجید ایک ایسا آسمانی خطیب ہے جس کے پیش نظر دنیا بھر کے انسانوں کی اصلاح ہے۔ اُسے حق کو واضح کرنا ہے، اس کے بارے میں انسانوں کے جس طبقے میں بھی کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کو رفع کرنا ہے اور ان کے رویوں پر نکتہ چینی کرنی ہے، اس لیے قرآن مجید کے لیے خطیبانہ اسلوب ہی موزوں تھا اور التفات اسی اسلوب کا مظہر ہے۔

جن لوگوں سے التفات کے اسلوب کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے انھوں نے قرآن مجید کو بے ربطی کا الزام دیا۔ اس الزام کو مغربی دانشوروں نے خوب اچھالا۔ انھوں نے قرآن کی نام نہاد بے ربطی کو اس کے "مؤلفین" کی کم علمی اور بے سلیقگی کا نتیجہ سمجھا اور اپنے زعم میں اس کی اصلاح کی تدبیریں کیں۔ نولڈیکی، ہوبرٹ گریم، داؤد، میور اور راڈویل نے اپنے اپنے فہم کے مطابق قرآن کی سورتوں کی ترتیب بدل کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہا اور محرف [1] نسخے شائع کیے۔

---

[1] مُحَرَّف: تحریف کیا گیا۔

Marfat.com

اس کے بعد رچرڈ بیل نے سورتوں کی کاٹ چھانٹ شروع کی۔ اپنے زعم میں اس نے ''غیر مربوط'' آیات کو دوسری ''موزوں'' سورتوں میں جگہ دی اور اس طرح قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کیا جو اس کی دانست میں زیادہ مربوط اور ایڈیٹنگ کا اچھا نمونہ تھا لیکن پہلی کوششوں کی طرح تحریف قرآن کی یہ نئی کوشش خود مستشرقین کی نگاہوں میں بھی کوئی وقعت نہ پاسکی اور قرآن کی یہ ''خدمت'' لاحاصل رہی۔ ہمارے نزدیک محرفین [1] کی مذکورہ کوششیں بڑی حد تک التفات کے اسلوب سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہیں حالاں کہ یہ اسلوب قرآن ہی کا نہیں عربی ادب کا اسلوب ہے اور اس کی مثالیں عرب خطباء کے کلام اور کعب بن زہیر، اعشیٰ اور دوسرے شعراء کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

اہل بلاغت کے ہاں التفات کا تصور:

اہل بلاغت عموماً جس چیز کو التفات میں شمار کرتے ہیں وہ ضمیروں کا وہ انتشار ہے جس کے تحت کلام متکلم سے مخاطب، مخاطب سے غائب اور غائب سے متکلم یا مخاطب کی طرف برابر بدلتا رہتا ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھنا مناسب ہوگا:

❀ ... ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾

(الفتح: 1-2)

''بے شک ہم نے تم کو ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمھارے تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے۔''

یہاں آیت کا آغاز ضمیر متکلم سے ہوا لیکن آگے ''لِنَغْفِرَ لَكَ'' کہنے کے بجائے ضمیر غائب استعمال کردی گئی تاکہ مغفرت کو ذات باری تعالیٰ کی صفات سے وابستہ کردیا جائے۔

❀ ... ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾ (الکوثر: 1-2)

''ہم نے تم کو بخشا کوثر، تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو۔''

یہاں کلام کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ پہلی آیت کی ضمیر متکلم کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے فَصَلِّ لَنَا کہا جاتا، لیکن لربك کے الفاظ استعمال کردیے گئے تاکہ رب کی ربوبیت کا حق واضح ہوجائے۔

❀ ... ﴿وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا﴾ (فصلت: 12)

''اور اس نے ہر آسمان میں اس کے متعلقہ فرائض وحی کردیے اور ہم نے آسمان زیریں کو چراغوں سے سنوارا۔''

یہاں کلام کا آغاز ضمیر غائب سے ہوا لیکن آگے ضمیر متکلم استعمال کی کیوں کہ افضال وعنایات اور اہتمام کے ذکر کے لیے یہی صیغہ موزوں تھا۔

❀ ... ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾

(بنی اسرائیل: 1)

[1] مُحرِّفِین: مُحرِّف (تحریف کرنے والا) کی جمع۔

Marfat.com

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب، مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک، جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک سمیع و بصیر وہی ہے۔"

یہاں آیت کے آغاز اور اختتام پر ضمیر غائب استعمال ہوئی ہے، جب کہ وسط میں ضمیر متکلم۔ اہل بلاغت کے نزدیک بات اگر ایک ہی انداز میں کہی جا رہی ہو تو سامع اس سے اکتا جاتا ہے۔ التفات کا اسلوب یہ بے زاری پیدا نہیں ہونے دیتا۔ نیز ضمیریں بدل کر لانے میں کچھ اور باتیں بھی ملحوظ ہوتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا کوئی حق اور اس کی صفات کا کوئی تقاضا بیان کرنا ہو تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اگر اس کی افضال وعنایات کا بیان ہو تو جمع متکلم کی ضمیر موزوں ہوتی ہے۔ غیظ و غضب کے اظہار کا موقع ہو تو کسی کو مخاطب کرنا بلیغ ہوتا ہے جب کہ نفرت کے اظہار کے لیے منہ پھیر کر بات کی جاتی ہے اور اس کے لیے غائب کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

التفات کا جامع تصور:

التفات کا یہ تصور جسے اہل بلاغت نے پیش نظر رکھا ہے نہایت محدود ہے۔ اس کا جامع تصور یہ ہے کہ اس اسلوب میں کلام کا رخ ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے استعمال کی شان یہ ہے کہ یہ اسلوب آیات سے لے کر آیات کے مجموعوں تک اور پھر سورتوں تک پھیل گیا ہے۔ اس کی وضاحت آگے کے مباحث سے ہو جائے گی۔

آیات میں التفات:

❁ ... ﴿يُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِىْ لِذَنْۢبِكِ ۖ﴾ (یوسف: 29)

"یوسف اس کو چھوڑ دو اور تو اے عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ۔"

یہ عزیز مصر کا وہ کلام نقل ہوا ہے جس میں اس کے مخاطب حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے اور اس کی بیوی بھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس نے یہ ہدایت کی وہ اس صورت حال کو اہمیت نہ دیں جس سے وہ دوچار ہوئے اور اپنی بیوی کو خطا کار سمجھتے ہوئے اس نے تنبیہ کی کہ وہ اپنی غلطی پر شرمسار ہو اور معافی مانگے۔

❁ ... ﴿قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِىْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (الشعرآء: 27-29)

"فرعون نے کہا، تمھارا یہ رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل خبطی ہے۔ موسیٰ نے کہا: مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید کر کے رہوں گا۔"

ان آیات کا موقع وہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے رب کی صفات بیان

Marfat.com

کررہے ہیں۔ فرعون اپنے درباریوں کی نگاہوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گرانے کے لیے یہ کہتا ہے کہ یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے، اس کی باتیں لائق توجہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس تبصرہ کے باوجود اپنی تقریر جاری رکھتے ہیں تو فرعون زچ ہوکر انھیں مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مجھے الٰہ مانو ورنہ میں تمھیں قید کردوں گا۔ خطاب کا رخ بدلنے ہی کا نام التفات ہے۔

❀ ... ﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾ (الفتح: 8-9)

''بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔''

پہلی آیت میں نبی ﷺ کا مرتبہ ومقام واضح فرمایا ہے اور اس میں خطاب خود انہی سے ہے۔ دوسری آیت میں اس مرتبہ ومقام کے تقاضے سے مسلمانوں کو آپ کے حقوق یاد دلائے ہیں۔ اس میں خطاب اہل ایمان سے ہوگیا ہے۔

❀ ... ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِىٓ إِلَيْهِمْ ۚ فَسْـَٔلُوٓا أَهْلَ ٱلذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ بِٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلزُّبُرِ ۗ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝﴾

(النحل: 43-44)

''اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے۔ تو لوگو، اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ اور ہم نے تم پر بھی یاددہانی اتاری تاکہ لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کردو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔''

یہاں کلام کے پہلے اور آخری حصے میں خطاب نبی ﷺ سے ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تمام سابق انبیاء کی طرح آپ بھی بشر ہیں جن کی طرف وحی نازل کی جارہی ہے۔ درمیان میں خطاب معترضین سے ہے کہ اگر تمھیں اس بات پر یقین نہیں آتا تو پہلے کے حاملین کتاب سے پوچھ دیکھو، وہ بھی بتائیں گے کہ ماضی میں نبی ہمیشہ بشر ہی آتے رہے ہیں۔ ان میں کوئی فرشتہ نہ تھا۔

آیات کے مجموعوں میں التفات:

التفات کے ایسے مواقع جن میں کئی کئی آیات کے مجموعے مختلف گروہوں کو مخاطب کرتے ہوں، سورتوں میں اس قدر کثرت سے ہیں کہ ذرا سے غور کے بعد ایک قاری ان پر متنبہ ہوجاتا ہے۔ سورہ بقرہ ہی کو لیجیے اس میں "یایھا الناس، یبنی اسرائیل" اور "یایھا الذین امنوا" سے آغاز کر کے مختلف گروہوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کو الگ الگ تعلیم دی ہے۔ بیچ بیچ میں جہاں ضرورت کا تقاضا ہوا ہے نبی ﷺ کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ سب التفات ہی کی مثالیں ہیں، تاہم اسلوب کو سمجھنے کے لیے چند ایسی آیات کی نشاندہی ضروری ہے جہاں مخاطب کی تبدیلی یک لخت واقع ہوئی ہے۔

❀...... التفات کی نہایت قریب الفہم مثال سورہ فاتحہ میں ہے۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کو مخاطب کر کے ان صفات کا حوالہ نہیں دیتے۔ اس کے بعد

Marfat.com

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ (الفاتحہ: 4)

''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے اس سے دعا کرتے ہیں۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ مدح کے مواقع پر غائب کا صیغہ موزوں سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس میں مخاطب کی تعظیم اور اس کے مرتبہ جلیلہ کا لحاظ زیادہ ہے لیکن دعا انابت اور اللہ کے سامنے اظہار عجز کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے حاضر کا صیغہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔

❀......سورہ مزمل کی ابتدائی چودہ آیات میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہدایات دی گئی ہیں جنھوں نے آپ کو فکر مند کر رکھا ہے، آپ کو قیام لیل، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور توکل واستقامت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد آیات 15 تا 19 میں قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے ان کو یہ تنبیہ کی ہے کہ ہمارے رسول کی تکذیب کرتے وقت اس انجام کو یاد رکھو جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کے باعث فرعون اور اس کی قوم کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ آگے آیت 20 میں پھر نبی ﷺ اور اہل ایمان مخاطب ہیں۔

❀......سورہ ہود میں قوم نوح کی ہلاکت اور حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی نجات کا واقعہ مفصل بیان ہوا ہے، اس کے بعد نبی ﷺ کی طرف التفات کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (ہود: 49)

''یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم کے لوگ ہی۔ تو ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔''

اسی طرح کے موقع کی دوسری مثالیں سورہ آل عمران میں آیت 44 اور سورہ القصص آیات 44 تا 46 میں ہیں۔

❀......سورہ آل عمران کی آیات 156 تا 158 میں مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ وہ کفار ومنافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی کے تمام اندوختوں [1] سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران: 159)

---

[1] اندوختے: اندوختہ (جمع کیا ہوا) کی جمع۔

Marfat.com

''یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمھارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات پر ان سے مشورہ لیتے رہو۔ پس جب تم فیصلہ کرو تو اللہ پر بھروسا کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسا کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کے اس کریمانہ طرز عمل کی تصویب ❶ ہے جو آپ نے منافقین کے ساتھ روا رکھا تھا اور آئندہ بھی اسی روش پر قائم رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

سورتوں میں التفات:

قرآن مجید کی ترتیب میں غور کیا جائے تو ان میں بعض سورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو التفات کے قاعدے سے آئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ الضحیٰ اور سورہ الانشراح دونوں میں نبی ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے افضال وعنایات کا حوالہ دیا گیا ہے اور خالصتاً آپ ﷺ کو مخاطب کر کے تسلی دی ہے کہ مشکلات سے گھبرائیے نہیں، فیروزمندی ❷ آپ کے لیے مقدر ہے۔ سورہ کوثر، کافرون اور نصر بھی التفات کی سورتیں ہیں جن میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے لیے نصرت غیبی ظاہر ہوگی، مکہ فتح ہوگا اور جس مشن پر آپ مامور ہیں اس سے سرخرو ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ التفات ہے۔

سورہ مزمل اور سورہ الاعلیٰ بھی فی الجملہ نبی ﷺ کے لیے التفات کی سورتیں ہیں اگرچہ ان میں قریش کو ضمناً مخاطب کیا گیا ہے۔

التفات کے موقع پر چوں کہ کلام کا رخ یک لخت بدل جاتا ہے، اس لیے لوگ عام طور پر وہاں کوئی جملہ حذف مان لیتے ہیں۔ مثلاً اگر خطاب اہل کتاب سے براہ راست ہو گیا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ خطاب بلا واسطہ کیسے ہو گیا۔ چناں چہ وہ لفظ قل محذوف مانتے ہیں تاکہ خطاب نبی ﷺ کے واسطہ سے ہو جائے، حالاں کہ قرآن میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن میں اہل کتاب سے خطاب قل سے شروع ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر کلام بواسطہ نبی ﷺ مقصود ہوتا ہے تو جملے سے پہلے لفظ قل لگایا جا سکتا تھا اگر نہیں لگایا گیا تو اس کو حذف مان کر اپنی طرف سے لگانا بلاغت کے خلاف ہوگا۔ مثلاً آیت:

﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيرٗا مِّمَّا كُنتُمۡ تُخۡفُونَ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ﴾

(المآئدة: 15)

''اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو۔''

---

❶ تصویب: کسی چیز یا عمل کو درست (صائب) ٹھہرانا۔

❷ فیروزمندی: کامیابی۔

Marfat.com

میں بلاغت اسی صورت میں قائم رہتی ہے جب یہ مانا جائے کہ اس میں التفات کے طریقہ پر یہود ونصاری کو مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی ہے۔اس سے پہلے لفظ قل حذف نہیں ہے۔

احوال قیامت کے ضمن میں وہاں پیش آنے والی صورت حال کو کئی جگہ قرآن نے حاضر کے صیغے میں بیان کیا ہے تاکہ صورت حال ممثل ❶ ہو کر سامنے آجائے۔ ان مواقع میں بھی لوگ کچھ حذف مان لیتے ہیں حالاں کہ یہ التفات کا موقع ہوتا ہے جس میں کوئی جملہ محذوف ماننا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر یوں فرمایا:

﴿وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿١٤﴾﴾ (بنی اسرائیل: 13-14)

"اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔"

اس آیت میں اِقْــرَاْ سے پہلے، انسان سے کہا جائے گا، کے الفاظ محذوف ماننا ضروری نہیں کیوں کہ یہاں التفاف کا اسلوب ملحوظ ہے اور انسان کو براہ راست مخاطب کر لیا گیا ہے۔ اس کی مزید مثالیں زخرف 70، الذاریات 14، طور 13، 14، 18، 19 میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اسلوب التفاف کے فوائد:

التفات کے اسلوب کا عام فائدہ سامع کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا اور اس کو چونکا کر اپنی بات سنانا ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ یہ رویہ اگر پختہ ہو کر ایک عادت بن جائے تو آدمی بسا اوقات اس چیز کو بھی نہیں دیکھتا جو اگرچہ قریب ہو لیکن اس سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ التفات کا اسلوب انسان کے اس جمود کو توڑتا اور اس کو غور وفکر کے لیے تیار کرتا ہے۔

اس اسلوب کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایک حقیقت اگر غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے تو اس کے ذکر کو زیادہ پُرتاثیر بنانے کے لیے اس کو حاضر کے صیغہ میں بھی بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ قاری اس کو اپنے سامنے دیکھنے لگے اور وہ اس کے قلب پر اثر نہ کرے۔ اوپر ہم نے احوال قیامت کی آیات کا جو حوالہ دیا ہے اس میں یہی فائدہ پیش نظر ہے۔ اس سے قبل کی ایک آیت یوں آئی ہے:

﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾﴾ (مریم: 71)

"تم میں سے ہر ایک کو بہرحال اس میں داخل ہونا ہے، یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔"

اس میں التفات ہے لیکن اسلوب کو نہ سمجھنے کے باعث اہل تاویل نے اس کو تمام انسانوں پر منطبق کر کے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ ہر انسان کو، خواہ وہ نیک ہو یا بد، جہنم پر سے گزرنا ہوگا۔ حالاں کہ اس سے پہلے منکرین قیامت کا

---

❶ مُمَثَّل ہونا: تمثیلی یا واقعاتی شکل میں سامنے آنا۔

Marfat.com

انجام زیر بحث ہے اور انہی کو حاضر کے صیغے میں ممثل کر کے خطاب کیا ہے۔ متقین کے حشر کی خبر آگے آیت 85 میں الگ سے دی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ عزت و احترام کے ساتھ رب کے حضور لے جائے جائیں گے۔

التفات کا اسلوب شدت عتاب اور غصہ کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے لیے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿٨٩﴾﴾ (مریم: 88-89)

''اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایک سنگین بات کہی ہے۔''

یہاں حاضر کا خطاب انہی لوگوں کے لیے ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں غائب کے صیغے سے ہوا ہے۔ شدت خطاب کے موقع پر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس کے متعلق بات کہی جا رہی ہے وہ اس کو سن بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت جب خداوند بنی اسرائیل پر ایمان لانے کا اقرار کیا تو اس موقع پر قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے:

﴿آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾﴾ (یونس: 91)

''کیا اب! حالاں کہ تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تُو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔''

اس آیت میں غائب کے صیغے کے بجائے حاضر کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اسی اصول پر نبی ﷺ نے غزوہ بدر کے مقتولین...... اصحاب قلیب ❶ کو مخاطب کیا تھا۔

جس طرح زجر اور غضب کے مضمون کے لیے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہے اسی طرح جہاں کسی کی تحقیر مقصود ہو یا جس کے متعلق بات کہی جا رہی ہے اس سے نفرت کا اظہار کرنا ہو تو مخاطب کسی دوسرے کو کر کے بات کہی جاتی ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿٥﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿٦﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿٧﴾﴾ (عبس: 5-7)

''جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالاں کہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔''

یہاں بظاہر عتاب آنحضرت ﷺ پر ہے لیکن اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان سے نفرت کے اظہار کے لیے ان سے رخ پھیر کر نبی ﷺ کو مخاطب کیا ہے۔

اسی طرح کے بعض مواقع میں خطاب واحد سے کرنے کے بجائے جماعت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال سورہ بقرہ کے چند رکوع ہیں جن میں غائب کے صیغے سے بنی اسرائیل کے چند احوال بیان کیے گئے ہیں، ان کی صورت حال کو تمثیلات سے واضح کیا گیا ہے، پھر یاایھا الناس کے عام صیغہ سے ان سے خطاب ہے اور آخر

❶ اصحابِ قلیب: اندھے کنویں والے۔ بدر میں ہلاک ہونے والے مشرکین کی لاشیں ایک اندھے کنویں (قلیب) میں پھینک دی گئی تھیں۔

Marfat.com

میں آیت 40 سے ان سے براہِ راست خطاب یبنی اسرائیل کے الفاظ سے ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کی طرف سے انکار یا ناگواری کے اظہار کا اندیشہ ہو۔ نبی ﷺ کے متعلق بھی روایات میں آتا ہے کہ آپ جب کسی فرد کو اس کی غلطی پر ٹوکنا چاہتے تو اس سے خطاب کرنے کے بجائے یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کام کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں بھی مذکورہ مصلحت ہی ملحوظ ہوتی تھی۔

اختلاف امت

اللہ تعالیٰ نے اختلاف کو کفر قرار دیا ہے اور اس کا انجام ذلت و رسوائی، بے بسی اور لاچارگی بتایا ہے اور اسے اپنی غضب ناکی کا سبب قرار دیا ہے، نیز واضح کر دیا ہے کہ اختلاف عدوان کے ہم معنی ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، تعلیقات، سورہ آل عمران: 102۔ 112)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہل کتاب کے اختلافات اور ان کے جمع مال کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے اور اہل ایمان کو اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید کے بعد شریعت کا پہلا مطالبہ رحم دلی اور انسانی ہمدردی کا ہے اور اختلاف شیطان کا پہلا حربہ ہے جس کے ذریعے وہ قوموں کو گمراہی کے کھڈ میں دھکیل دیتا ہے۔ سورہ آل عمران خاص طور پر اسی بات کی تعلیم کے لیے رکھی گئی ہے اور خلافت کے استحقاق کو اتحاد پر منحصر کیا گیا ہے جو اس تزکیہ سے عبارت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ اس باب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہوں پر خبر دی ہے کہ یہ پیغمبر لوگوں کو کتاب (یعنی احکام شریعت) اور حکمت (یعنی مکارم اخلاق) کی تعلیم دیتا ہے اور (تمام طرح کی آلائشوں سے پاک کر کے) اس کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں نفس واحدہ بنا دیتا ہے۔ اور تزکیہ ہی وہ چیز ہے جو پوری شریعت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں ہم کو ایسے سیاسی اور تمدنی احکام دیئے ہیں جو آپسی جھگڑوں کو ختم کرتے ہیں، صلح و آشتی پیدا کرتے ہیں اور ہمیں پاک صاف بناتے ہیں۔

اختلاف ایمان کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لیے جو شخص دین میں اختلاف پیدا کرتا ہے وہ توحید سے روگردانی کرتا ہے۔ آگے کئی آیتوں میں توحید پر ایمان رکھنے والوں کا حال بیان ہوا ہے۔

(حمید الدین فراہی، تفسیر سورۃ البقرہ: 41)

Marfat.com

اِعتراض

(عبارت میں جملہ معترضہ کا داخل ہونا)

مسلسل مربوط کلام کے درمیان میں فصل واقع ہوجانے کا ایک سبب اس میں جملہ معترضہ کا داخل ہو جانا ہے۔ بات کرنے والا کبھی کبھی اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی بات روک کر کسی دوسرے امر پر مخاطب کو متوجہ کرے اور پھر اپنی اصل بات کو مکمل کرے۔ بیچ کے اس اضافے کے بغیر بھی اس کا کلام معنوی طور پر مکمل ہوتا ہے اور مدعا اس اضافے کے بغیر بھی پورا ہو رہا ہوتا ہے۔ اس اضافہ کو اعتراض کا نام دیا جاتا ہے اور سلسلہ کلام کے بیچ میں داخل ہونے والے ایسے جملہ کو جملہ معترضہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب بکثرت استعمال ہوا ہے۔

معترضہ عبارت کبھی تو صرف ایک لفظ پر مشتمل ہوتی ہے، کبھی مکمل جملے پر اور کہیں کہیں طویل عبارتیں بھی اسی اسلوب کے تحت آئی ہیں۔ یہ اسلوب ایسے مقامات پر استعمال ہوتا ہے جہاں ماقبل کلام کا تقاضا ہوتا ہے کہ متکلم برسر موقع کسی خاص پہلو کو نمایاں کرے اور اس میں تاخیر بات کی اہمیت کو کم کرنے کا باعث بن سکتی ہو۔ جملہ معترضہ کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں جو موقع ومحل پر غور کرنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ذیل میں ہم اسلوب کی وضاحت کے لیے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں اور اس مقصد کی نشان دہی بھی کرتے ہیں جس کے لیے جملہ معترضہ عبارت میں داخل کیا گیا ہے:

(۱) تنزیہ کے لیے:

﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ۝﴾ (النحل: 57)

''اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں۔''

یہاں جملے میں سے سبحانہ کا لفظ نکال لیجیے تو باقی رہ جانے والا جملہ ہر اعتبار سے ایک مکمل کلام ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین اللہ کے لیے بیٹیاں مانتے ہیں لیکن ان کی اپنے لیے یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کو بیٹے حاصل ہوں۔ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت اس کی اعلیٰ صفات کے انکار کے مترادف ہے۔ اس سے فوری طور پر اظہارِ براءت اور صفات الٰہی کو اس نسبت سے محفوظ کرنے کے لیے لفظ ''سبحانہ'' کا اضافہ کیا گیا۔ اس کا مفہوم سلسلہ کلام کے مفہوم سے ہٹ کر ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی اولاد ٹھہرائے۔ اس طرح یہ جملہ معترضہ تنزیہ [1] کا فائدہ دے رہا ہے۔

---

[1] تنزیہ: منزہ (پاک) کرنا۔

Marfat.com

(ب) شرط کے لیے:

﴿لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ﴾ (الفتح: 27)

''بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے امن کے ساتھ۔''

یہاں بھی اصل کلام ''اِنْ شَاءَ اللّٰهُ'' کے اضافہ کے بغیر مکمل ہے یعنی تم ضرور بلاخوف وخطر مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ یہ معترضہ الفاظ اس وضاحت کے لیے ہیں کہ ہر کامیابی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ جب اللہ کے چاہنے کی شرط پوری ہوگی تو یہ داخلہ ممکن ہو جائے گا۔

(ج) عظمت واہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے:

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۝﴾

(الواقعہ: 75-77)

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے۔''

یہاں پہلا جملہ ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۝﴾ قسم پر مشتمل ہے جس کا مقسم علیہ [1] تیسرا جملہ ﴿اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۝﴾ ہے۔ مواقع النجوم یعنی ستاروں کے ٹوٹنے کے مقامات سے نظام کائنات میں جنات وشیاطین پر سنگ باری کی جاتی ہے تاکہ وہ قدوسیوں کے مقامات تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ یہ انتظام اس قدر موثر ہے کہ کوئی شیطان ان علاقوں میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتا جہاں اس کی آمد وشد پر پہرہ بٹھایا گیا ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے زمانے میں اس انتظام میں مزید شدت آگئی اور قرآن مجید کسی شیطانی تصرف کے بغیر رسول اللہ ﷺ تک پہنچایا گیا لہٰذا اس کی محفوظیت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ چوں کہ قسم کے الفاظ سے نظامِ کائنات کے اس اہم راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے اس لیے جملہ معترضہ میں اس کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کیا تاکہ مخاطب اس قسم پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائے۔ عام حالات میں قسم اور مقسم علیہ ساتھ ساتھ آتے ہیں۔

غور کیجیے تو اس جملہ معترضہ کے اندر ''لَوْ تَعْلَمُوْنَ'' کے الفاظ خود ایک جملہ معترضہ ہیں جس نے صفت اور موصوف میں فصل پیدا کر دیا ہے۔ یہ بھی شرط کا فائدہ دے رہے ہیں۔

(د) تائید حاصل کرنے کے لیے:

❀ ... ﴿قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِى الۡاَرۡضِ﴾ (یوسف: 73)

''خدا کی قسم! آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں۔''

یہاں ''لَقَدْ عَلِمْتُم'' کے الفاظ جملہ معترضہ کی نوعیت کے ہیں۔ اصل کلام ان کے بغیر مکمل ہے۔ اس اضافہ

---

[1] مُقسَم علیہ: جس پر قسم کھائی جائے۔

Marfat.com

سے برادران یوسف اپنی بات کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بات ہم حلفاً کہہ رہے ہیں تم اس کو اپنی معلومات کے مطابق بھی خوب سمجھتے ہو۔

❀ ... ﴿وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴۳﴾ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ﴾

(النحل : 43-44)

''اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے۔ تو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔''

یہاں ﴿فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴۳﴾﴾ جملہ معترضہ ہے۔ اس کے بعد سلسلہ کلام پہلے حصے سے مربوط ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ رسولوں کے بارے میں سنت الٰہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ رسالت کے منصب پر انسانوں میں سے آدمی ہی فائز کیے گئے اور ان کو نشانیاں اور صحیفے عطا کیے گئے۔ اس سنت الٰہی کے بارے میں اگر تم بے خبر ہو تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ وہ اس کی تائید کریں گے کیوں کہ ان کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔

(ہ) تسلی کے لیے:

❀ ... ﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۚ﴾

(الاعراف : 42)

''اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے...... ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے...... وہی جنت والے ہیں۔''

یہاں جملہ معترضہ ﴿لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ ۫﴾ پر مشتمل ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو اس بات کی تسلی دینا ہے کہ ایمان و عمل صالح کا بوجھ کوئی ایسا بوجھ نہیں جس کا اٹھانا انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی طاقت کے مطابق ہی ڈالی ہے۔

❀ ... ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ﴾

(الکہف : 30-31)

''بے شک جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے۔ تو ہم نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہیشگی کے باغ ہوں گے۔''

یہاں بھی سلسلہ کلام کو روک کر جملہ معترضہ میں تسلی کا مضمون شامل کیا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرنے والے پورے اعتماد سے اپنی روش پر قائم رہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اچھے اعمال والوں کی محنت کا ثمرہ ضائع نہیں ہونے دے گا۔

(و) اظہار تعجب کے لیے:

﴿وَ اتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ حُلِیِّهِمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّهٗ لَا

Marfat.com

﴿يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴾ (الاعراف: 148)

''اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا، ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی...... کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات کرسکتا ہے اور نہ ان کو کوئی راہ دکھا سکتا ہے...... اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر بڑا ظلم ڈھانے والے تھے۔''

یہاں ﴿أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ﴾ جملہ معترضہ ہے جس کا مقصد فوری اظہار تعجب وحسرت ہے کہ جس قوم پر خدا کی اس قدر افضال وعنایات تھیں وہ اتنی سی بات سمجھنے سے بھی قاصر رہی کہ جو چیز نہ بات کرنے پر قادر اور نہ رہنمائی دے سکتی، اس کی پرستش کا ان کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔

(ز) استثناء کے لیے:

﴿كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۞ كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ﴾ (التوبہ: 7-8)

''مشرکین کے کسی عہد کی ذمے داری اللہ اور اس کے رسول پر کس طرح باقی رہ سکتی ہے...... ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ہے تو جب تک وہ قائم رہیں تم بھی ان کے لیے معاہدے پر قائم رہو، اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے...... کس طرح باقی رہ سکتی ہے جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ کہیں تمھیں دبا پائیں تو نہ تمھارے بارے میں کسی قرابت کا پاس کریں نہ عہد کا۔''

یہاں ﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۞﴾ جملہ معترضہ ہے۔ آگے کا کلام معترضہ سے پہلے کے کلام کے ساتھ مربوط ہے۔ جملہ معترضہ کا فائدہ کلام سے استثناء کا ہے۔ فرمایا ہے کہ مشرکین کے عہد وپیمان کی ذمے داری اہل ایمان پر کیسے ہوسکتی ہے جب کہ ان کا زور جب چلتا ہے تو کسی قرابت یا عہد کا پاس نہیں کرتے۔ ہاں قریش سے تم نے جو عہد مسجد حرام کے پاس کیا وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ جب تک قریش اس کو نبھائیں اس وقت تک تم بھی اس کا احترام کرو۔

آگے آیت 11 میں ﴿إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ﴾ کے الفاظ بھی جملہ معترضہ ہیں۔

(ح) رفع شک کے لیے:

❀ ... ﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ﴾

(البقرہ: 102)

''اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے...... حالاں کہ

Marfat.com

سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا۔ یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے...... اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت، پر اتاری گئی تھی۔"

اس مقام پر ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہود کو وحی کی تعلیم سے رغبت نہ تھی۔ اس کے بجائے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد کے جادو کے شیطانی علم سے دلچسپی رکھتے تھے یا پھر اسی جیسے اثرات کی حامل اس تعلیم سے جو ہاروت اور ماروت دو فرشتے بابل میں دیا کرتے تھے۔ اس کلام سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شائد حضرت سلیمان علیہ السلام جادو کی اشاعت میں آلہ کار بنے تھے۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے برسرِ موقع جملہ معترضہ میں یہ وضاحت کردی کہ اس کفر کی اشاعت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ یہ جال شیطانوں ہی کا بچھایا ہوا تھا۔

❀ ... ﴿وَإِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ﴾ (النحل: 101)

"اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں ...... اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے...... تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو۔"

یہاں ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ اس سے قبل یہود کی اس وسوسہ اندازی کا حوالہ ہے کہ وہ پچھلی شریعت کی جگہ لینے والے قرآن کے نئے احکام کو اعتراض کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا من گھڑت کام ہے۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے جملہ معترضہ میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا احکام شریعت میں تبدیلی فرمانا بلا مقصد نہیں ہوتا بلکہ گہری حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

(ط) تنبیہ کے لیے:

❀ ... ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝﴾
(الروم: 17-18)

"پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو...... اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے...... اور عشاء کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔"

ان آیات میں اصل مضمون اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے حکم پر مشتمل ہے جس کے اوقات کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ بیچ میں ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کے جملہ معترضہ میں تنبیہ ہے جس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر اس حکم سے گریز کرو گے تو جان رکھو کہ خدا کا انحصار تمھارے اوپر نہیں ہے، اس کی حمد کا ترانہ تو آسمان و زمین کے گوشے گوشے میں گونج رہا ہے۔

❀ ... ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ

Marfat.com

فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾ (مریم : 34-36)

''یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم...... یہ اصل حقیقت بیان ہوئی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ خدا کے شایان نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے......اور بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔''

ان آیات سے پہلے حضرت عیسیٰ کی زبان سے ان کا وہ اعلان ذکر کیا ہے جو انھوں نے اپنی حیثیت کی وضاحت کے لیے دور طفلی میں کیا تھا۔ انہی کے کلام کا سلسلہ ﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾﴾ آیت میں جاری ہے۔ اس سلسلہ کو توڑ کر اوپر کی ابتدائی دو آیات میں برمحل یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ تھی حضرت مسیح کی اصل حیثیت جس کو نصاریٰ نے افسانہ بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ آیات جملہ معترضہ ہیں۔

❀ ... ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾﴾

(الکہف : 22)

''اب یہ کہیں گے یہ تین تھے، ان کا چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کہیں گے: یہ پانچ تھے، ان کا چھٹا ان کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو! اور کہیں گے: یہ سات تھے اور ان کا آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہہ دو: میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ ان کو بس تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں اور تم ان کے باب میں نہ بحث کرو مگر ٹالنے کے انداز میں اور ان کے باب میں ان میں سے کسی سے نہ پوچھو۔''

یہاں قل سے شروع ہونے والے جملہ معترضہ میں نبی ﷺ کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ معترضین کو اصحاب کہف کی حقیقت کے واضح ہو جانے اور اس سے سبق حاصل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ اب ان کی تعداد میں اختلاف کو زیر بحث لائیں گے۔ یاد رکھو کہ اس طرح یہ تمھیں بحث و مناظرہ میں الجھانا چاہتے ہیں۔ تم یہ غلطی نہ کرنا بلکہ سرسری طور پر جواب دے کر بات کو ٹال دینا۔

❀......ایک طویل معترضہ عبارت سورۃ اعراف میں وارد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ہے۔ ان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جب یہ تذکرہ آتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ستر بزرگوں کی موجودگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اللہ کی رحمت ان بنی اسرائیل کے شامل حال رہے گی جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اللہ کے احکام پر ایمان کے تقاضے پورے کریں گے تو اس موقع پر بنی اسرائیل کی تنبیہ کے لیے آیت نمبر 157 میں فرمایا کہ آج نزول قرآن کے زمانہ میں اس کردار کے مصداق وہ لوگ ہیں جو نبی امی ﷺ پر ایمان لا رہے ہیں اور ان کی مدد و نصرت کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آیت نمبر 158 میں نبی ﷺ کی زبان سے

Marfat.com

باقاعدہ اعلان کرایا گیا ہے کہ میرے اوپر ایمان لاؤ اور میری اتباع کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔ ان معترضہ آیات کے بعد سلسلہ کلام پھر جڑ گیا ہے۔

(ی) تردید کے لیے:

❀ ... ﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(الانعام: 100)

''اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے...... حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا...... اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔''

یہاں ''وَ خَلَقَهُمْ'' معترضہ ہے۔ مشرکین کا خدائی میں جنوں کو شریک کرنے کا دعویٰ اتنا گھناؤنا تھا کہ بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا نے تو جنات کو خود پیدا کیا۔ اس میں تردید کے ساتھ یہ دلیل بھی پنہاں ہے کہ مخلوق خالق کے ہم پلہ کیسے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ نہایت احمقانہ ہے۔

❀ ... ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾

(النساء: 155-158)

''پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں...... بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے...... اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتان عظیم لگانے اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا...... حالاں کہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں۔ بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انھوں نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

اس عبارت میں یہود کے جرائم کی فہرست کے بیچ میں دو مواقع پر جملہ معترضہ کے ذریعے ان کے نقطۂ نظر کی برسرِ موقع تردید کی گئی ہے۔ جب ان کے اس متکبرانہ قول کا ذکر آیا کہ ہمارے دل تو محفوظ ہیں۔ ان کے اندر کوئی غلط

Marfat.com

بات کیسے داخل ہو سکتی ہے تو فوری تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اصل سبب یہ نہیں بلکہ خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر رکھی ہے اس لیے کوئی حق بات ان میں اتر ہی نہیں سکتی۔ پھر جب ان کے اس دعویٰ کا ذکر آیا کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا تو فوری تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ قتل یا سولی کا وہ واقعہ جس نے ان کے ہاں شہرت پا رکھی ہے کہیں پیش نہیں آیا۔ یہ ایک فرضی افسانہ ہے۔ اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل یہود کے پاس نہیں ہے۔ اللہ نے تو اپنے رسول کو اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد پھر کلام ماقبل سے جڑ گیا ہے۔

جملہ معترضہ کی پہچان میں احتیاط:

یہ بات یاد رہے کہ جملہ معترضہ ایک سلسلہ کلام کو توڑ کر آتا ہے لیکن چوں کہ یہ اس کلام سے ہٹ کر ایک مفہوم کا حامل ہوتا ہے اس لیے اگر اس کو نکال دیا جائے تب بھی کلام کا دروبست [1] ٹھیک ہوتا اور عبارت مستقیم ہوتی ہے۔ اگر اس کو نکالنے سے عبارت میں خلل واقع ہو جاتا ہو تو یہ جملہ معترضہ نہ ہوگا، اگرچہ شکلاً ایسا نظر آتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک مقام پر عبارت یوں آئی ہے:

﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ (الانعام: 158)

”جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے نفس کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔“

اس آیت میں نَفْسًا موصوف ہے اور ﴿لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ کا جملہ اس کی صفت، عام حالات میں صفت اور موصوف متصل ہوتے ہیں، ان میں فصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں لفظ ”اِيْمَانُهَا“ بیچ میں آ گیا ہے۔ یہ شکلاً معترضہ کی طرح ہے لیکن جملہ کو اس کے بغیر پڑھیے تو اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہوتا۔ پس یہ معترضہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت میں مفعول (نَفْسًا) مقدم ہو گیا ہے اور اس کی صفت نہایت طویل جملے پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ فاعل ”اِيْمَانُهَا“ کو مفعول کے فوراً بعد رکھ دیا جائے تا کہ وہ اپنے فعل سے غیر ضروری طور پر بعید نہ ہو جائے۔ یہ ایک الگ اسلوب بیان ہے۔

اسی طرح بعض اوقات عبارت کسی کلام کی تضمین کے طور پر آ جاتی ہے۔ یہ بھی شکلاً جملہ معترضہ کی طرح ہوتی ہے مگر یہ ایک الگ اسلوب ہے جس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

---

[1] دروبست: بالکل، تمام، سب کچھ۔

Marfat.com

تضمین

کسی لفظ کے ساتھ کسی حرف یا کسی عبارت کے ساتھ عبارت کا اضافہ کر کے ان کے ظاہر مفہوم میں کچھ دوسرے معانی شامل کرنے کو تضمین کہتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے جس کی مثالیں معمولی غور وفکر کے بعد بکثرت تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ہم اس اسلوب کو چند مثالوں کی روشنی میں واضح کریں گے۔ تضمین کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ فعل سے اس کے صلہ کی عدم مناسبت کی صورت۔

ب۔ سلسلہ کلام کے اندر بعض آیات کے اضافہ کی صورت

ا۔ فعل سے اس کے صلہ کی عدم مناسبت کی صورت:

مادہ فعلیہ سے بننے والے بہت سے افعال کے بعد صلہ کا کوئی حرف استعمال نہیں ہوتا اور وہ اپنا مفہوم صحیح ادا کرتے ہیں۔ مثلاً آیت

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ﴾ ❶ (الحج: 77)

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو۔''

میں مادہ ر ک ع، س ج د اور ع ب د سے بننے والے فعل امر کے بعد کوئی حرف بطور صلہ نہیں آیا اور وہ اپنے مفہوم میں واضح ہیں۔

بعض افعال ایسے ہیں جن کے ساتھ صلہ استعمال ہوتا ہے اور فعل کے ساتھ اس کی مناسبت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ ''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔'' میں خَتَمَ کے بعد عَلٰی (پر) کا صلہ لفظ سے مطابقت رکھتا ہے کیوں کہ مہر کسی شے پر لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح ﴿أَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ﴾ ''اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑا'' میں اخذ کے ساتھ ب کا صلہ مفہوم سے ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتا ہے کیوں کہ خدا کی پکڑ کا سبب قوموں کے گناہ بنے۔ قرآن مجید میں کبھی فعل کے بعد کوئی ایسا حرف بطور صلہ آ گیا ہے جو اس فعل کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی مناسبت کسی دوسرے فعل کے ساتھ ہوتی ہے جو آیت میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس صورت حال میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ دوسرا فعل جملہ سے حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی طرف رہنمائی کے لیے اس کا صلہ باقی رہنے دیا گیا ہے۔ اس لیے جملہ میں موجود فعل کے اندر محذوف فعل کا مفہوم بھی شامل مانا جاتا ہے اور محذوف فعل کی

❶ یہ آیت سجدہ ہے۔

Marfat.com

نشاندہی کے لیے سیاق وسباق پر غور کیا جاتا ہے یہ تضمین کی پہلی شکل ہے جس کی چند نمایاں مثالیں حسب ذیل ہیں:

❀ ... ﴿فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ﴾ (البقرہ: 37)

یہاں فعل تَـابَ استعمال ہوا ہے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ اس کا معروف صلہ اِلٰـی (طرف) آتا ہے کیوں کہ رجوع کسی چیز کی طرف کیا جاتا ہے۔ آیت زیر بحث میں صلہ عَـلٰـی آیا ہے۔ اس میں اور فعل میں بے گانگی بالکل واضح ہے۔ عَلٰی کے صلہ کا لفظ رحم کے ساتھ آنا معروف ہے، گویا جملہ یوں ہوگا: فَتَابَ اِلَيْهِ وَ رَحِمَ عَلَيْهِ. اس تضمین کی تائید آیت کے آخر میں تواب کے ساتھ رحیم کی صفت آنے سے بھی ہوجاتی ہے۔ تضمین کا مضمون کھولنے کے بعد آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

''پھر آدم نے پائے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی طرف توجہ اور رحم فرمایا۔ بے شک وہ توجہ فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

❀ ... ﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ (المعارج: 1)

یہاں سَاَلَ (اس نے پوچھا) کے ساتھ ب کا صلہ بے گانہ ہے جب کہ یہ استعجل (اس نے جلدی مچائی) اور استهزء (اس نے مذاق اڑایا) کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ گویا اصل جملہ یوں ہے: سَاَلَ سَائِلٌ وَاسْتَعْجَلَ (یااِسْتَهْـزَءَ) بِـعَـذَابٍ وَّاقِعٍ جس کا ترجمہ یوں ہوگا: ایک سوال کرنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کی جلدی مچائی (یا اس کا مذاق اڑایا)۔'' مراد یہ ہے کہ عذاب کے بارے میں سائل کا سوال مذاق پر مبنی ہے۔ موقع کلام سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن نے یہاں ایک ایسی صورت حال ہی پر بحث کی ہے جس میں کفار عذاب آخرت کا مذاق اڑارہے تھے اور اس کا مطالبہ کررہے تھے کہ وہ جلدی کیوں نہیں آرہا ہے۔

❀ ... ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ﴾ (البقرہ: 29)

فعل استـوی (وہ سیدھا ہوا) کے ساتھ الـی کا صلہ بے گانہ ہے جب کہ یہ لفظ قصد کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اس تضمین کی وضاحت کے بعد آیت کے معنی ہوں گے:

''پھر وہ سیدھا ہوکر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔''

اس سیدھا ہونے اور متوجہ ہونے کا مفہوم وہ ہوگا جو ذات باری کی شان سے مطابقت رکھتا ہو۔

❀ ... ﴿اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ﴾ (المائدہ: 6)

یہاں بھی قـمتم (تم کھڑے ہو) کے بعد قَـصَدْتُـمْ (تم ارادہ کرو) متضمن ❶ ہے جس کے ساتھ الی کی مطابقت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کے ارادے سے اٹھو تو اپنے منہ دھولو......

❀ ... ﴿وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الۡغَرۡبِىِّ اِذۡ قَضَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسَى الۡاَمۡرَ﴾ (القصص: 44)

---

❶ مُتضمَّن: بطور تضمین لایا گیا۔

Marfat.com

فعل قضینا (ہم نے فیصلہ کیا) صلہ کے بغیر آتا ہے جب کہ یہاں الی کا صلہ موجود ہے جس کے ساتھ مطابقت رکھنے والا فعل ابلغنا (ہم نے آگاہ کیا) ہوسکتا ہے۔ گویا آیت کا ترجمہ یوں گا:

''تم (پہاڑ کے) جانب غربی میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔''

❀... ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ﴾ (النساء: 20)

یہاں الی کا حرف تقاضا کرتا ہے کہ تَاْكُلُوْٓا (تم کھاؤ) کے سوا یہ کسی اور فعل کا صلہ بنے۔ موقع ومحل سے یتیموں کے اموال اپنے مالوں کے ساتھ ملانے کا مفہوم نکلتا ہے۔ گویا جملہ یوں ہوگا:

((لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَضُمُّوْهَا اِلٰى اَمْوَالِكُمْ))

اور ترجمہ ہوگا: ''ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے ہڑپ نہ کرو۔''

❀... ﴿لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ﴾ (الفرقان: 29)

عن کا صلہ ''اضل'' (اس نے گمراہ کیا) کے بجائے ''صرف'' (اس نے پھیر دیا) سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے معنی جملہ میں متضمن ہیں، ترجمہ ہوگا:

''اس نے مجھے گمراہ کر کے اس یاددہانی سے برگشتہ [1] کر دیا بعد اس کے کہ وہ میرے پاس آچکی تھی۔''

❀... ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ (الاعراف: 36)

فعل استکبار (تکبر کرنا) صلہ کے بغیر آتا ہے۔ حرف عن (سے) کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ اعراض [2] کا مفہوم متضمن مانا جائے۔ اس لیے آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

''اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں۔''

❀... ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا﴾

(الاعراف: 103)

قرآن مجید میں کئی جگہ ''ظلموا انفسھم'' کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کا لفظ صلہ کے بغیر آتا ہے۔ اس کے بعد حرف ب کا تقاضا یہ ہے کہ کفروا (انھوں نے انکار کیا)، کذبوا (انھوں نے جھٹلایا)، جَحَدُوْا (انھوں نے جھگڑا کیا) جیسے افعال جن کے ساتھ ب کا صلہ آنا معلوم ہے، متضمن مانے جائیں۔ اس لیے آیت کے ترجمہ میں انکار اور جھٹلانے کا مفہوم شامل کرنا ضروری ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا:

''پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا۔''

---

[1] برگشتہ کرنا: رخ پھیر دینا، غافل کر دینا۔

[2] اعراض: منہ پھیر لینا۔

Marfat.com

❀ ... ﴿ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا ﴾ (الفرقان : 34)

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر فعل یُحْشَرُوْنَ (وہ اکٹھے کیے جائیں گے) بغیر صلہ کے یا الی کے ساتھ آیا ہے۔ جب کہ سورہ القمر میں یسحبون فی النار علی وجوھھم (وہ آگ میں مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں یحشرون کا لفظ یسحبون کے مفہوم پر متضمن ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا:

''جو لوگ اکٹھے کر کے جہنم کی طرف مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے وہ اپنے ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر ہوں گے۔''

ب۔ سلسلہ کلام کے اندر بعض آیات کے اضافہ کی صورت:

قرآن مجید کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ سلسلہ کلام میں بعض مقامات پر ایک یا زیادہ آیات کا اضافہ کر دیتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ سلسلہ کلام کا حصہ نہیں۔ غور کیا جائے تو اس اضافے کا مقصد سمجھ میں آ جاتا ہے کہ قرآن نے ایک کلام پر تضمین کر کے مفہوم کو آگے بڑھا دیا ہے۔ اس تضمین کے حسب ذیل مقاصد سمجھ میں آتے ہیں:

ا۔ کلام کو مطابق حال کرنا   ب۔ کلام کی تائید کرنے کے لیے اس کو مدلل کرنا

ج۔ کلام کی تکمیل کرنا   د۔ کلام کے کسی پہلو کی وضاحت کرنا

اب ہم مثالوں سے تضمین کی اس قسم کو واضح کریں گے:

ا۔ کلام کو مطابق حال کرنا:

قرآن مجید میں پچھلی قوموں کی تاریخ سے بہت سے واقعات سنائے گئے ہیں۔ یہ محض قصہ یا کہانی کے طور پر نہیں بلکہ قرآن کے بعض دعووں کی تائید کے لیے آئے ہیں۔ اسی طرح آخرت میں پیش آنے والے واقعات کی بھی قرآن نے تفصیل سے خبر دی ہے جو ظاہر ہے کہ قرآن کے مخاطبوں کو بعض حقائق کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ واقعہ یا قصہ کے بیان کو سننے والے بالعموم اس میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ اس کو اپنے اوپر منطبق کر کے اس سے سبق حاصل کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعات کے بیان میں کہیں کہیں سلسلہ کلام کو توڑ کر تضمین کے ذریعے واضح کر دیتا ہے کہ اس بات کو محض ماضی کی ایک حکایت یا مستقبل میں غیروں کے ساتھ پیش آنے والا معاملہ مت سمجھو بلکہ یہ تمھاری اپنی حکایت بھی ہے اور تم بھی اس صورت حال کا مصداق ہو۔ اس طرح کلام مطابق حال ہو جاتا ہے۔ اس اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: 44-45)

''پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر ...... ان پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جو آخرت کے منکر ہیں۔''

Marfat.com

اس مقام پر اہل جنت اور اہل دوزخ کے مابین مکالمہ نقل ہوا ہے جس میں ایک منادی مخل ہو کر ظالموں پر خدا کی پھٹکار کی خبر دے گا۔ اس موقع پر ایک آیت کی تضمین کے ذریعے بتایا ہے کہ جانتے ہو اس پھٹکار کے مستحق کون ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور آخرت کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ اس تضمین نے اس واقعہ کو مستقبل کی ایک خبر نہیں رہنے دیا بلکہ اس کا مصداق نبی ﷺ کی دعوت میں روڑے اٹکانے والے قریش سرداروں کو ٹھہرایا۔

❀ ... ﴿قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ﴾

(الاعراف : 50-51)

''وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں...... ان کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا۔''

ان آیات کا موقع بھی وہی ہے جس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔ اہل دوزخ جنتیوں سے پانی اور دوسری نعمتوں کا سوال کریں گے۔ اس کے جواب میں جنتی ان کو بتائیں گے کہ ان چیزوں سے دوزخیوں کو محروم رکھنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس موقع پر بھی تضمین کے ذریعے بتایا ہے کہ جانتے ہو یہ محروم لوگ کون ہوں گے...... یہی قریش لیڈر جو دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں اور دنیا کی زندگی پر فریفتہ ہیں۔ اس تضمین نے مستقبل کے ایک ماجرے کو حال پر منطبق کر کے قریش پر چسپاں کر دیا ہے۔

❀ ... ﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝ قَالَ ....﴾

(طٰہ : 51-57)

''اس (فرعون) نے پوچھا: تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ اس (موسیٰ) نے جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک رجسٹر میں ہے۔ نہ میرا رب بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے...... وہی رب جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی برسایا۔ پس ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کر دیں۔ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا...... اس نے کہا......''

یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مکالمے کے دوران میں ایک طویل تضمین کے ذریعے قریش کی توجہ اس

Marfat.com

امر کی طرف مبذول کرائی ہے کہ جس رب کے ساتھ تمھیں معاملہ پیش آنے والا ہے، اس کی نعمتوں سے تم بہرہ مند ہو رہے ہو۔ اس کی ربوبیت کی شانیں ہر جگہ ظاہر ہو رہی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید اور آخرت کے وقوع کے بارے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے متکلم کے صیغے استعمال کر کے ان کے تضمین ہونے کو کھول دیا ہے۔ تضمین کے خاتمے پر پھر وہی مکالمہ ہے جس کا سلسلہ توڑا گیا تھا۔ تضمین کے اسلوب سے اصولی مباحث، مستقبل کے ماجرے اور ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔

ب۔ کلام کو مدلل کرنا:

بسا اوقات کلام کسی اہم نکتے تک پہنچتا ہے جس کو مدلل طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قاری پر اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جائے۔ اصل کلام میں یہ پہلو دبا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح کے موقع پر تضمین کے ذریعے بات کو مدلل کر دیا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

﴿وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾﴾

(النمل: 24-26)

”میں نے اس (ملکہ سبا) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین کر دیے ہیں۔ اس نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے پس وہ راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں۔ (شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔“

اقتباس کے آغاز میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کے ایک کارکن ہدہد کی اس رپورٹ کا ایک حصہ ہے جو اس نے ملک سبا ❶ کی مذہبی حالت کے بارے میں دی تھی۔ اس نے بتایا کہ ملکہ سبا اور اس کے درباری آفتاب پرست ہیں اور توحید کی راہ سے شیطان نے ان کو روک رکھا ہے۔ اس موقع پر تضمین کے ذریعے شرک کی نفی اور توحید کے حق میں نہایت واضح دلیل بیان فرما دی کہ زمین و آسمان کے اندر کی تمام پوشیدہ چیزوں کو بے نقاب کرنے والا تو اللہ ہے۔ وہ لوگوں کے پوشیدہ اور علانیہ امور سے بھی واقف ہے تو غیر اللہ کی بندگی آخر کس بنا پر روا ہو سکتی ہے! بندگی کا حق صرف اللہ کا ہے جو عرش عظیم کا مالک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔

---

❶ یمن کا قدیم نام ”سبا“ تھا جبکہ ”ملکہ سبا“ کا نام کتابوں میں ”بلقیس“ آیا ہے۔ (حسان عارف)

Marfat.com

❀ ... ﴿وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۹﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۚ﴿۱۰﴾ وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾﴾

(الزخرف : 9-12)

''اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز وعلیم نے پیدا کیا ہے...... وہی جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے رکھے کہ تم راہ پاؤ، اور جس نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے حیات تازہ بخش دی ایک مردہ زمین کو۔ اسی طرح تم بھی قبروں سے نکالے جاؤ گے۔ اور جس نے تمام گوناگوں قسم کی چیزیں پیدا کیں اور تمھارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔''

یہاں عرب کے مشرکین کا تضاد فکر زیر بحث ہے کہ وہ عملی شرک میں مبتلا ہیں لیکن ان سے سوال کریں کہ یہ کائنات کس نے بنائی ہے تو جواب دیں گے کہ ایک زبردست اور حکمت والے خدا نے۔ اس پر تضمین کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ وہ کائنات پر اگر ٹھیک ٹھیک غور کریں تو اس میں خالق کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ آدمی پکار اٹھتا ہے کہ واقعی اللہ ایک ہے اور یہ کائنات ابدی نہیں بلکہ یہ نظام ختم ہو کر رہے گا اور لوگوں کو روز جزاوسزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان دلائل کے بعد شرک کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے!

❀...... اسی طرح کا ایک موقع سورہ العنکبوت کی آیات 18-23 میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم سے خطاب کو تضمین کے ذریعے مدلل کیا گیا ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں تم جو خلق کے مظاہر دیکھتے ہو پھر ان پر فنا آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ تو یہ مشاہدہ اس لیے کرایا جا رہا ہے کہ تم مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ تضمین کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

ج۔ کلام کی تکمیل کرنا:

❀ ... ﴿وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

(لقمان : 13-15)

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے...... اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت

Marfat.com

کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ (اے انسان) تُو میرا شکر گزار رہ اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھنا۔ اور پیروی ان کے طریقہ کی کرنا جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر (اے لوگو!) میری ہی طرف تمھارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔''

یہاں کلام کے آغاز میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت بیان کرنی شروع کی جس میں انہوں نے خدا کی شکر گزاری کی تلقین کی جس کے بعد والدین کا حق ہوتا ہے جسے حضرت لقمان نے خلاف ادب سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا اور ان کی نصیحت دوسری سمت میں نکل گئی۔ اس اہم خلا کو ان کی تقریر توڑ کر تضمین کے ذریعے بھر دیا تا کہ یہ اہم موعظمت مکمل ہو جائے۔

د۔ کلام کی وضاحت کرنا:

کبھی تضمین کے ذریعے برسر موقع کسی اہم لیکن مختصر بات کی مزید وضاحت کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سنن کو کھول کر بیان کر دیا جاتا ہے تا کہ بات ہر پہلو سے آشکارا ہو جائے۔

❀ ... ﴿وَ لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۝ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ۝﴾ (الشعراء: 87-91)

''اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے، اس دن مجھے رسوا نہ کرنا...... جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد...... بس وہ فائز المرام [1] ہوں گے جو تندرست اور پاک دل لے کر حاضر ہوں گے۔ اور جنت متقیوں کے لیے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی۔''

اس اقتباس کے آغاز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ایک حصہ نقل ہوا ہے جس میں انھوں نے یوم آخرت کی رسوائی سے پناہ مانگی ہے۔ اس پر تضمین کرتے ہوئے یوم آخرت کی خصوصیات کو کھول دیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ اس دن کامیابی انہی لوگوں کے لیے ہوگی جو دنیا میں اپنے دل کو شرک اور نفاق کی ہر آلائش سے محفوظ رکھے رہے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کی اس میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا جو بھٹکتے رہے۔ اگر چہ وہ دنیا میں کتنے ہی صاحب حیثیت کیوں نہ رہے ہوں۔

❀ ... ﴿اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۝ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ۝ وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی ۝﴾ (طه: 73-75)

---

[1] فائز المرام: مرام (مقصد) کو پانے والا۔

Marfat.com

''ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، بخشنے اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے...... بے شک جو شخص اپنے رب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا تو اس کے لیے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا۔ اور جو اس کے پاس باایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔''

ان آیات سے قبل قوم فرعون کے جادوگروں کے ایمان لانے کا واقعہ نقل ہوا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ انھوں نے فرعون کی دھمکیوں کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور دین کو پوری استقامت کے ساتھ اختیار کیا۔

انھوں نے اپنی سابقہ زندگی کی خطاؤں کی معافی کے لیے رب سے دعا کی۔ اس موقع پر برمحل وضاحت کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بخشش کا ضابطہ کیا ہے اور اس کے لیے تضمین کا اسلوب اختیار کیا گیا۔

آخرت

گزشتہ صحیفوں میں دنیوی عذاب سے زیادہ ڈرایا گیا ہے لیکن قرآن مجید نے زیادہ تر عذاب آخرت کی دھمکی دی ہے۔ چوں کہ آخرت کے ذکر کی سخت ضرورت تھی اس لیے صرف اس کی خبر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عذاب وثواب کی ایسی تصویر پیش کی گئی کہ لوگوں کے دلوں پر اس کا نقش کچھ اس طرح بیٹھ جائے کہ گویا وہ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور یہی کمال ابلاغ ہے۔

سابقہ مذہبی کتابوں میں آخرت کی پوری تصویر نہیں ملتی بلکہ دنیوی جزا وسزا ہی کا ان میں ذکر ہے۔ چناں چہ یہود نے اس کا انکار کر دیا جیسا کہ انجیل میں مذکور ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ تناسخ کا قائل ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس دنیا میں نعمت اور عذاب کی جو شکلیں دیکھیں ان سے اوپر ان کی نگاہ نہ جا سکی۔ چناں چہ جزا کا تصور ان کے ذہنوں میں اتنا کمزور ہو گیا کہ اس کی اہمیت سے وہ غافل اور بے پرواہ ہو گئے۔

اصل یہ ہے کہ آخرت پر ایمان بالکل فطری چیز ہے۔ اس وجہ سے کہ عدل انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس وجہ سے بھی کہ زمانے کے انقلابات کا وہ آئے دن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء کرام علیہ السلام کی طرف سے تنبیہ اور یاد دہانی اسی امر کی ہوتی ہے جس کی فطرت انسانی یا عقل سلیم تصدیق کرتی ہو اور جس پر واقعات شاہد ہوں۔ (حمید الدین فراہی رحمہ اللہ، القائد الٰی عیون العقائد، ص:195)

Marfat.com

حذف

کلام میں سے غیر ضروری الفاظ کو ساقط کر دینے کا اسلوب حذف کہلاتا ہے۔ غیر ضروری الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کے بغیر بھی کلام قابل فہم رہتا اور سننے والا اس سے متاثر ہوتا ہے۔ کسی بھی گفتگو یا کلام کا حقیقی مقصد یہی ہوتا ہے کہ سامع اس کے مدعا کو سمجھ جائے اور اس کا وہ اثر قبول کرے جو اس گفتگو یا کلام سے دینا مقصود ہے۔ کلام میں اگر ایسے الفاظ داخل ہوں جن کے بغیر بھی کلام کا یہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے تو ان کے باعث کلام بلا وجہ طویل اور بوجھل ہوجائے گا اور سننے والا اس کو آسانی سے بھلا دے گا۔ لہٰذا اچھے کلام کے لیے حذف نہایت ضروری ہوتا ہے۔

کلام کے سامعین اپنے فہم اور اثر پذیری کے لحاظ سے الگ الگ مرتبہ کے ہوتے ہیں۔ بعض قومیں اس معاملہ میں دوسری قوموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اس لیے مختلف زبانوں میں زبان کے اندر حذف کی مقدار میں خاصا فرق واقع ہوا ہے۔ ہم لوگ اردو میں بات کو طول دینے کے عادی ہیں لیکن عرب نہایت تیز فہم اور ان کے ذہن بیدار تھے اس لیے غیر ضروری طور پر طویل کلام ان کو بوجھل محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایسے کلام کو پسند کرتے جو مختصر لیکن مدعا کو حاصل کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ اگر کوئی خطیب کلام کے غیر ضروری حصے دور نہ کرتا تو اس کا کلام لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور اس کا سننا ان کی سامعہ [1] پر گراں گزرتا۔ جو خطیب بلا وجہ بات کو طول دیئے جاتا لوگ اس کو احمق سمجھتے یا پھر اس کے متعلق ان کا خیال ہوتا کہ وہ ان کو کند ذہن اور احمق سمجھ کر بات کر رہا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ان کو پسند نہ تھیں۔ اپنی اسی ذکاوت کے باعث عربوں نے اپنی زبان کی اہم خصوصیت یہ رکھی کہ حذف کا اسلوب اس میں نمایاں ہوا۔

عربی زبان میں حذف کئی پہلوؤں سے نمایاں ہوا ہے جن میں سے بعض بآسانی نگاہ میں آجاتے ہیں:

ا۔ جس طرح عبرانی زبان میں نقطوں اور حرکات کا تصور نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ پڑھی جاتی تھی، اسی طرح عربی زبان میں بھی نقطے لگانے اور حرکات ظاہر کرنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ عربوں نے اپنی کسی ضرورت کے لیے نقطے اور حرکات لگانے کا کام نہیں کیا بلکہ جب اسلام عجمیوں میں پھیلا اور ان کو قرآن مجید کی تلاوت میں دقت محسوس ہوئی تو ان کی سہولت کے لیے پہلے نقطے لگا کر حروف کو ایک دوسرے سے ممیّز کیا گیا اور پھر حرکات ایجاد کی گئیں جن کی مدد سے عجمی لوگ قرآن پڑھنے پر قادر ہوسکیں۔

ب۔ عرب جب حروف کو ملا کر کوئی مرکب لفظ لکھتے تو بیشتر حروف کی شکل کا کچھ حصہ حذف کر دیتے اور اس کے باقی

[1] سامعہ: قوتِ سامعہ یعنی سننے کی حس۔ سماعت۔

Marfat.com

حصہ ہی پر قناعت کرتے۔ مثال کے طور پر ''ع ص ر'' کو ملا کر لکھنے کی صورت میں ع اور ص کا محض سر لکھ لینا کافی سمجھا گیا اور اس کو عصر کی صورت میں لکھا گیا۔ اسی طرح "ا ل ت ی ن" میں سے کچھ حروف کا علامتی حصہ لے کر مرکب صورت میں اس کو عربوں نے "الـس" لکھا۔ بعد میں جب عجمیوں کے لیے نقاط فراہم کیے گئے تو یہ لفظ "التیــن" کے طور پر لکھا جانے لگا۔ عربی میں کتاب کو کتٰب اور رحمان کو رحمٰن لکھا گیا یعنی دونوں لفظوں میں الف کو حذف کر دیا گیا حالاں کہ وہ پڑھنے میں آتا ہے۔

ج۔ عربوں نے کلام کے دو حصوں کو جوڑنے والے حروف کی بالعموم ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثال کے طور پر اضافت یعنی ایک چیز کے دوسری چیز کے ساتھ تعلق کو بتانے کے لیے ہم اردو میں کا، کے یا کی میں سے کوئی حرف استعمال کرتے ہیں لیکن عربی میں یہ اضافت بغیر کسی زائد حرف کے ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً احمد کی کتاب۔ کتـابُ احمد، گھوڑے کے دو کان...... اذنـا فرس۔ اسی طرح جملے یا لفظ میں کسی ابہام کو دور کرنے کے لیے جو وضاحت کی جاتی ہے اور جس کو تمیز کہتے ہیں، عربی میں اس کے لیے اصل وضاحت سے زائد کوئی حروف نہیں بڑھائے جاتے جب کہ اردو میں اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ مثلاً اردو میں کہا جائے گا: سلیم نسب کے لحاظ سے شریف ہے۔ عربی میں کہیں گے: سـلیـمُ شریفٌ نسبًـا۔ ''نسب کے لحاظ سے'' کا مفہوم محض لفظ نسب کے اعراب سے ادا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی یہی کیفیت خبر، حال، ظرف وغیرہ کے استعمال میں بھی نظر آتی ہے۔ دوسری زبانیں اس خصوصیت سے تہی دامن ہیں۔ صرف عربی نے زبان کے ارتقا میں یہ رفعت حاصل کی ہے۔

د۔ عربوں نے جملوں کے دروبست میں سے اتنا حصہ نکال دیا جو قرینہ سے سمجھ میں آجاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کلام میں کبھی مبتدا غائب ہوتا ہے تو کبھی خبر، کہیں فعل بیان نہیں ہوتا کہ قاری موقع ومحل کی روشنی میں خود اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، کہیں شرطیہ جملے کا جواب غائب ہوتا ہے یا الفاظِ قسم کے بعد مقسوم علیہ کے الفاظ محذوف ہوتے ہیں۔ حذف کی یہ شکلیں اسی موقع پر اختیار کی جاتی ہیں جہاں سیاق وسباق اس حذف کے مقدر [1] معنی تک رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

ھ۔ اہل عرب کوئی قصہ بیان کرتے ہیں تو اس میں سے بھی غیر ضروری تفصیلات کو نکال دیتے ہیں۔ جب دلیل بیان کرتے ہیں تو اس کے ایسے مقدمات [1] کو حذف کر دیتے ہیں جن کو حذف کرنے کی جرأت دوسری قومیں کبھی نہیں کرتیں۔ عربی کی جن مشکلات کے باعث اہل عرب کے کلام کو سمجھنا عجمیوں کے لیے بہت مشکل ہوا، اس کا ایک سبب اسی طرح کے محذوفات ہیں۔

---

[1] مقدر: وہ لفظ جو عبارت میں نہ ہو مگر اس کے معنی لیے جائیں، محذوف۔

[1] مقدمات: مقدمہ (آگے والا حصہ) کی جمع۔

Marfat.com

قرآن مجید میں حذف کا اسلوب عام استعمال ہوا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس سے واقفیت حاصل کریں۔ اس اسلوب سے ناواقف آدمی کلام کے صحیح مفہوم تک رسائی نہیں پاتا اور اگر حذف سے واقف ہے لیکن اس کے مقدر معانی کے کھولنے میں غلطی کر دیتا ہے تو وہ کلام کے معانی ہی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا اس اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔

حذفِ مبتدا و خبر:

عربی میں سادہ ترین جملہ مبتدا و خبر (جن کو مسند الیہ اور مسند بھی کہتے ہیں) سے مل کر بنتا ہے۔ کلام میں اس ترکیب کے جملوں میں سے کبھی مبتدا کو اور کبھی خبر کو محذوف کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کلام کا محذوف حصہ اس قدر واضح ہوتا ہے کہ جملے کا دروبست خود اس کی غمازی کر رہا ہوتا ہے اور قاری بغیر کسی اشتباہ کے اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مبتدا کو حذف کر کے خبر پر اور خبر کو حذف کر کے مبتدا پر قاری کی پوری توجہ مرکوز کر دینا مطلوب ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں مبتدا یا خبر کے حذف کا اسلوب بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ .... منافقین کے ذکر میں بتایا ہے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ﴾ (النساء: 81)

''اور یہ کہتے ہیں کہ (ہمارا شیوہ) سرتسلیم خم ہے۔''

❀ ... ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ (الانعام: 96)

''(اللہ ہی) برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی۔''

❀ ... ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝١٩٦ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ﴾

(آل عمران: 196-197)

''ملک میں کافروں کی چلت پھرت تمھیں کسی مغالطے میں نہ ڈالے۔ (یہ چلت پھرت) چند دن کی چاندنی ہے۔''

❀ ... ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦﴾ (الھمزہ: 5-6)

''تم کیا جانو حطمہ کیا ہے۔ (یہ حطمہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔''

❀ .... حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ جب ملکہ نے ٹوکری کو دریا سے نکلوایا تو اس کے اندر ایک موہنا بچہ پا کر بے حد خوش ہوئی اور فرعون سے مخاطب ہوئی۔ فرمایا:

﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ﴾ (القصص: 9)

''اور فرعون کی بیوی نے کہا: (یہ بچہ) میری اور تمھاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔''

مندرجہ بالا تمام آیات میں مبتدا حذف ہے جس کا تعین موقع و محل سے ہو جاتا ہے۔ ترجمہ کے اندر قوسین میں

Marfat.com

اس کو کھول دیا گیا ہے۔

❀...... جنت کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّ ظِلُّهَا﴾ (الرعد: 35)

''اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی (دائمی ہوگا)۔''

❀......اسی طرح متقیوں کو جنت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ﴾ (ص: 55)

''یہ نعمتیں (تو متقیوں کے لیے ہوں گی) اور سرکشوں کے لیے نہایت برا ٹھکانہ ہوگا۔''

❀......حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں جادوگروں کو ایمان لانے پر قتل کی دھمکی کا بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد ہے:

﴿قَالُوْا لَا ضَیْرَ٘ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ﴾ (الشعراء: 50)

''انھوں نے جواب دیا (ہمیں قتل کا) کوئی ڈر نہیں۔ ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹیں گے۔''

مذکورہ تین مثالوں میں خبر محذوف ہے جو موقع و محل سے با آسانی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کو قوسین میں کھول دیا گیا ہے۔

❀... ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ اِ۟لْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ﴾ (الحج: 25)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا بدوی (تو انھوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا۔)''

اس جملہ میں خبر ایک طویل جملہ پر مشتمل ہے۔ اس طرح کے حذف کو سیاق وسباق پر اچھی طرح غور کر کے متعین کرنا پڑتا ہے۔ غور کے بغیر جملہ کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔

❀......حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے پاس کچھ اجنبی بطور مہمان آئے اور ان کو سلام کیا۔ اس کے بعد آتا ہے:

﴿قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ (الذاریات: 25)

''ابراہیم نے کہا (تم پر بھی) سلام ہو۔ پھر سوچا (یہ مہمان) اجنبی لوگ ہیں۔''

اس آیت کے واضح طور پر دو حصے ہیں۔ پہلے میں خبر محذوف ہے اور دوسرے میں مبتدا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ بسا اوقات آیات میں کوئی جملہ ایسا بھی آ گیا ہے جس کو مبتدائے محذوف کی خبر بھی قرار دے سکتے ہیں اور خبر محذوف کا مبتدا بھی۔ دونوں صورتوں میں کلام کے مدعا میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

Marfat.com

❀......منافقین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قسمیں کھا کھا کر تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ تمھارے ہمراہ ضرور جنگ کے لیے نکلیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿قُل لَّا تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ مَّعْرُوفَةٌ ۚ﴾ (النور: 53)

''ان سے کہو قسمیں مت کھاؤ۔ دستور کے مطابق اطاعت (مطلوب ہے)۔''

بعد کے جملے کا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے:

''صحیح طریقہ دستور کے مطابق اطاعت کرنا ہے۔''

اس طرح طاعة معروفة میں مبتدا بننے کی صلاحیت بھی ہے اور خبر بننے کی بھی۔

❀...... برادران یوسف نے جب اپنے والد ماجد کو یوسف کے قتل ہو جانے کی کہانی سنائی تو انھوں نے فرمایا:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ﴾ (یوسف: 18)

''یہ تو تمھارے جی کی گھڑی ہوئی ایک بات ہے، پس (میرا شیوہ) صبر جمیل ہے۔''

آیت کے آخری حصہ کا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے، ''لہٰذا صبر جمیل (بہتر عمل) ہے۔'' دونوں صورتوں میں مفہوم میں زیادہ فرق واقع نہیں ہوتا۔

حذفِ فاعل ومفعول:

قرآن مجید کی متعدد آیات میں فعل کے فاعل یا مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے مختلف اسباب اور مختلف فائدے ہوتے ہیں لیکن یہ حذف وہیں ہوتا ہے جہاں اس بات کا واضح امکان موجود ہوتا ہے کہ قاری فاعل یا مفعول کو خود متعین کر لے گا۔ اب ہم اس طرح کے حذف کی بعض مثالیں پیش کریں گے:

1۔ بعض اوقات سلسلہ کلام میں ایک چیز کا ذکر ہو کر قاری کے ذہن میں مرتسم [1] ہو چکا ہوتا ہے۔ اب اگر اس کا تذکرہ لفظوں میں نہ بھی کیا جائے تو قاری کا ذہن از خود اس کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں اس کو لفظوں میں لا کر قرآن کلام کو ثقیل نہیں بناتا بلکہ قاری کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

سلسلہ کلام میں اس چیز کا ذکر قریب بھی ہوسکتا ہے اور دور بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی مثال حسب ذیل ہے:

❀... ﴿فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ﴿١٧٧﴾﴾ (الصافات: 177)

''وہ جب ان کے صحنوں میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہوگی صبح ان لوگوں کی جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔''

آیت میں فعل نَزَلَ کا فاعل محذوف ہے لیکن اس کو آیت ماسبق کی روشنی میں متعین کیا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد عذاب ہے جس کے لیے کفار جلدی مچا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم رسول کی تکذیب کر رہے ہیں تو حسب وعدہ عذاب کیوں نہیں آرہا ہے۔ آیت میں ان کو خبردار کیا ہے کہ جب یہ عذاب آدھمکے گا تو یہ کوئی معمولی آفت نہیں ہوگی۔

---

[1] مُرتَسَم: اِرتسام (نقش کرنا) سے اسم فاعل، منقوش، نقش کیا گیا۔

Marfat.com

❀ ... ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿١٩﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾﴾

(القلم: 19-20)

''ابھی وہ سوئے پڑے ہی تھے کہ اس پر تیرے رب کی طرف سے گردش کا ایک جھونکا آیا تو وہ کٹی ہوئی فصل کے مانند ہوگیا۔''

یہاں فعل اَصْبَحَتْ (ہوگیا) کا فاعل الفاظ میں بیان نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلسلہ کلام کی پہلی کئی آیات میں ذکر اصحاب الجنة یعنی ایک باغ والوں کا ہے جو نہایت بے خوف اور مطمئن تھے کہ ان کا باغ موسمی تغیرات سے گزر کر اب تمام آفتوں سے محفوظ ہو چکا ہے اور اگلی صبح اس کا پھل توڑنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی کا مزا چکھانا چاہتا تھا اس لیے راتوں رات باغ پر آندھی بھیج کر اس باغ کو کٹی ہوئی فصل کے مانند کر دیا۔ سلسلہ کلام کی روشنی میں اصبحت کا فاعل الجنة یعنی باغ ہے۔ واقعہ پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں اس فاعل کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا۔

2۔ کبھی سلسلہ کلام میں کوئی قرینہ ایسا موجود ہوتا ہے جس کی روشنی میں کسی فعل کا فاعل بآسانی متعین کرنا ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

❀ ... ﴿اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾﴾

(ص: 31-32)

''ایک دن شام کو اس کے ملاحظہ کے لیے اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا کہ یہ تو مال کی محبت میں لگ کر میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہوگیا، یہاں تک کہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔''

اس آیت میں فعل ''توارت'' کا فاعل حذف ہوا ہے۔ اس کے تعین کا قرینہ اوپر کا لفظ ''عشی'' فراہم کرتا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق عصر اور مغرب کے درمیان کے وقت پر ہوتا ہے۔ جس واقعہ کا حوالہ آیت میں ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ گھوڑوں کے معائنے میں وہ کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ عصر کی نماز کا وقت نکل گیا اور سورج غروب ہوگیا۔ قرینہ کی موجودگی میں لفظ سورج کے اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

3۔ کبھی قرینہ الفاظ میں موجود نہیں ہوتا لیکن مضمون میں پایا جاتا ہے۔ سورہ یوسف کی آخری آیت ہے:

❀ ... ﴿مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾﴾

(یوسف: 111)

''یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔''

یہاں ذکر قرآن مجید کا ہو رہا ہے لیکن الفاظ میں اس کو بیان نہیں کیا۔ اس کا قرینہ اوپر کی آیات میں بھی الفاظ

Marfat.com

میں موجود نہیں ہے لیکن زیر بحث جو بات ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کے مخاطب وحی کی باتوں پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا وحی الٰہی سے رہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ چناں چہ آپ عذاب الٰہی سے جو ڈرا رہے ہیں تو یہ محض ایک من گھڑت دھمکی ہے۔ اس مضمون کی روشنی میں "ماکان" کا فاعل ''قرآن'' بآسانی متعین ہو جاتا ہے۔

4۔ کلام میں اس کی غایت درجہ وضاحت کے باعث بھی کسی لفظ کا بیان غیر ضروری ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر حذف کی چند مثالیں ملاحظ ہوں:

❀ ... ﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ﴿٢٦﴾ وَ قِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۙ﴿٢٧﴾ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ﴿٢٨﴾ وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ اِلْمَسَاقُ ؕ﴿٣٠﴾﴾ (القیمۃ : 26-30)

''ہرگز نہیں، جب کہ (جان) ہنسلی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا: اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا، اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے، اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی، اس دن تیرے رب ہی کی طرف جانا ہوگا۔''

ان آیات میں عیش دنیا کے متوالوں کو موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بے بسی کی یاد دہانی ہے۔ جان کنی کی تصویر اتنی واضح ہے کہ لفظ نفس (جان) کے استعمال کے بغیر بھی مفہوم ادا ہو رہا ہے۔ اس لیے فعل "بَلَغَتْ" (پہنچے گی) کا فاعل ''نفس'' محذوف ہے۔

❀ ...... ٹھیک یہی مضمون سورۃ الواقعہ میں بیان ہوا ہے:

﴿فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۙ﴿٨٣﴾﴾ (الواقعۃ : 83)

''(اگر اپنے خیال میں تم کسی کے محکوم نہیں) تو کیوں نہیں اس وقت جب کہ (جان) حلق میں پہنچتی ہے۔''

میں بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی "بلغت" کے فاعل ''نفس'' کو حذف کر دیا ہے۔

❀ ... ﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ﴾ (القصص : 23)

''اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے اس پر لوگوں کی بھیڑ دیکھی جو (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے تھے اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو (اپنے گلّے کو) روکے کھڑی تھیں۔''

یہاں فعل یَسْقُوْنَ اور تَذُوْدَانِ کا مفعول حذف ہے۔ جملے کی غایت [1] وضاحت اور قرائن کی بدولت اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

❀ ... ﴿وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ﴿٧٨﴾﴾ (الصافات : 129,108,78)

---

[1] غایت: خاصی، خاصا، انتہائی۔

Marfat.com

''ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں سے (ایک گروہ) چھوڑا۔''

یہاں بھی غایت وضاحت کے باعث فعل 'تَرَکْنَا' کا مفعول حذف ہو گیا ہے۔

5۔ کبھی کوئی لفظ ایک ہی جملہ یا دو متصل جملوں میں دوبارہ آجاتا ہے۔ اگر اس کا اظہار دونوں جگہ کر دیا جائے تو کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ کلام کو اس ثقالت سے بچانے کے لیے اس لفظ کو صرف اس جگہ ظاہر کیا جاتا ہے جہاں اس کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے مقام میں اس کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (البقرہ: 197)

''اور تقویٰ کا زادِ راہ لو کیوں کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے۔''

یہاں تَزَوَّدُوْا کا مفعول التَّقْوٰى ہے جو کلام میں حذف ہے۔ اگر اس کا اظہار کیا جاتا تو کلام ثقیل ہو جاتا۔ دوسری جگہ اس کے اظہار کے بغیر چارہ نہ تھا لہٰذا وہاں لفظ کو ظاہر کر دیا اور پہلے موقع پر حذف کر دیا۔ اس حذف کی طرف رہنمائی فَاِنَّ کے حرف سے ہو رہی ہے جو بیانِ علت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

❀ ... ﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (السجدہ: 14)

''تو اب چکھو (عذاب) اس جرم میں کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو نظر انداز کیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب دیکھو۔''

یہاں بھی تکرار سے بچنے کے لیے پہلے ذوقوا کا مفعول حذف کیا گیا ہے۔ ذوقوا کی تکرار سے عبرت کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

6۔ بسا اوقات ایک فعل کا مفعول پہلو دار ہوتا ہے۔ وہاں اگر کوئی لفظ لا کر مفعول متعین کر دیا جائے تو اس کا صرف ایک پہلو بیان ہو سکے گا اور عبارت کا مفہوم محدود ہو جائے گا حالاں کہ دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مفعول کو حذف کر دینے سے قاری کے فکر کے لیے ایک جولان گاہ فراہم کر دی جاتی ہے کہ وہ موقع کلام کے مطابق خود کئی مفعول سوچ لے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (الحجرات: 1)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے (اپنی رائے) مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

کس چیز کو مقدم نہ کرو یہ بات الفاظ میں ادا نہیں ہوئی۔ معلوم ہے کہ مقدم کرنا کئی پہلوؤں سے ہو سکتا ہے مثلاً اپنی شخصیت کو زیادہ اہمیت دینا، اپنے مفاد کو زیادہ عزیز رکھنا، اپنی رائے کو رسول اللہ کی رائے سے فائق سمجھنا وغیرہ۔ ان تمام پہلوؤں تک رہنمائی کی گنجائش باقی رکھنے کے لیے لَا تُقَدِّمُوْا کا مفعول حذف کر دیا گیا۔

Marfat.com

حذفِ مضاف:

مضاف کے حذف ہونے کا اسلوب قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس کی کئی شکلیں ہیں لیکن یہ حذف بھی ہوتا اسی جگہ ہے جہاں قرینہ موجود ہو اور اس کی وضاحت کے بغیر بھی قاری کا ذہن اس کی طرف منتقل ہو سکتا ہو۔ اس صورت میں کلام کو خواہ مخواہ بوجھل بنانے کے بجائے حذف کا فائدہ اٹھا کر کلام کو چست بنا دیا جاتا ہے۔

اب مثالیں ملاحظہ ہوں:

الف۔ بستیوں اور گروہوں سے پہلے لفظ اهل کا حذف:

❀ ... ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ (هود: 83)

''اور مدین (کے باشندوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (کو بھیجا)۔''

ظاہر ہے کہ پیغمبر کی بعثت کسی بستی کے در و دیوار کی طرف نہیں ہوتی بلکہ وہاں رہنے والے لوگوں کی طرف ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی غایت درجہ وضاحت کے باعث یہاں مدین کا مضاف اهل حذف کر دیا گیا ہے۔

❀ ... ﴿وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا﴾ (یوسف: 82)

''آپ اس بستی (کے لوگوں) سے پوچھ لیجیے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے (والوں) سے پوچھ لیجیے جس میں ہم آئے ہیں۔''

یہاں بھی اَلْقَرْيَةَ اور اَلْعِيْرَ دونوں سے پہلے ان کا مضاف اهل حذف ہو گیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر پوچھا جائے گا تو بستی کے باشندوں سے اور کسی قافلہ کے شرکاء سے پوچھا جائے گا۔ یہاں بھی مضاف غایت درجہ واضح ہے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ب۔ متعلقات کا حذف:

بسا اوقات اصلاً کسی شے کے متعلقات کا ذکر مقصود ہوتا ہے لیکن ان کے بجائے اس شے کا ذکر کر دینا کافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ قاری خود ہی کلام کے خلا کو بھر لیتا ہے۔ لہٰذا یہ متعلقات جو کلام میں اس شے کے مضاف کی جگہ پر ہوتے ہیں حذف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً:

❀ ... ﴿اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ (مریم: 4)

''اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا۔''

یہاں بڑھاپے سے سر نہیں بلکہ سر کے بال سفید ہو کر بھڑک اٹھنے کا بیان ہے لیکن ترکیب شعر الراس میں سے لفظ شعر (بال) کو حذف کر دیا گیا۔

❀ ... ﴿اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ (البقرة: 93)

''ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے (کی پرستش) ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔''

Marfat.com

یہود کے دلوں میں بچھڑے کا وجود رچ بس نہیں گیا تھا بلکہ سامری نے اس کا جو بت بنایا اس کی محبت یا اس کی پرستش بنی اسرائیل کے دلوں میں ڈال دی گئی تھی۔ لہٰذا یہاں العجل کا مضاف حُب یا عبادت حذف کر دیا گیا۔

❀ ... ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ﴾ (الحشر: 7)

''جو کچھ اللہ بستیوں والوں (کے مالوں) میں سے اپنے رسول کی طرف لوٹائے تو وہ اللہ کا ہے۔''

اس آیت میں مالِ فَے کی تقسیم کا حکم ہے۔ مال فے وہ مال ہے جو اہل ایمان کو اپنے دشمنوں سے اس صورت میں ہاتھ آتا ہے جب ان سے لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ فے میں باشندے ہاتھ نہیں آتے بلکہ ان کا مال ہاتھ آتا ہے لیکن آیت میں صرف اهل القرٰی آیا ہے۔ حقیقت میں اس لفظ سے پہلے لفظ "اموال" جو اہل القریٰ کا مضاف تھا، حذف کر دیا گیا ہے۔

❀ ... ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ (الکهف: 21)

''ہم ان (کے غار) پر ایک مسجد بنائیں گے۔''

اس آیت کا تعلق اصحاب کہف سے ہے۔ جب علاقے کے لوگ اصحاب کہف کی اصلیت سے آگاہ ہوئے تو ان کو ان سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے ان کے غار پر کوئی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں لوگوں میں بحث ہوئی کہ یادگار کون سی ہو۔ ان میں سے ایک گروہ نے یہ اعلان کیا کہ ان نیک لوگوں کے غار پر ہم ضرور ایک مسجد تعمیر کریں گے۔ آیت میں عَلَيْهِمْ (ان پر) سے مراد علی کھفھم (ان کے غار پر) ہے۔ کہف کا لفظ جو "ھم" کا مضاف ہے، حذف ہے۔

❀ ... ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۙ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ﴾ (بنی اسرائیل: 74-75)

''اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا (عذاب) چکھاتے۔''

یہاں اصل میں ضِعْفَ عَذَابِ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ عَذَابِ الْمَمَاتِ مراد ہے لیکن عذاب کا لفظ دونوں جگہ حذف ہوگیا ہے کیونکہ یہ قرینہ سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

❀ ... ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ (المائدة: 41)

''وہ کلام کو اس کے موقع و محل (کی وضاحت) کے بعد بھی اس کے محل سے ہٹا دیتے ہیں۔''

یہاں مواضع کا مضاف وضوح [1] حذف ہوگیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہود کے ایجنٹ شرارت کے لیے کلمات کو ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر بالکل دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب واضح کیا جا چکا ہے۔

[1] وُضوح: وضاحت۔

Marfat.com

ج۔ مضمون کی وسعت باقی رکھنے کے لیے حذف:

مضاف کو جب الفاظ میں بیان کر دیا جائے تو جملے کا ایک خاص مفہوم متعین ہو جاتا ہے اور مضاف کے طور پر آنے والے لفظ کی حدود ہی میں رہ کر اس کو سمجھا جاتا ہے۔ جہاں مفہوم وسیع ہو اور کسی ایک لفظ کی حدود میں نہ آتا ہو تو وہاں مضاف کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ قاری اپنے فکر کو کام میں لا کر اس کی وسعتوں کا خود احاطہ کرے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ (الحج: 78)

''اللہ (کی راہ) میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔''

یہاں لفظ اللہ کا مضاف محذوف ہے۔ دین یا سبیل یا کوئی بھی موزوں لفظ یہاں مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سب ہی یہاں مراد ہیں۔

❀ ... ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد: 7)

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔''

یہاں اللہ کا مضاف بیان نہیں ہوا حالانکہ یہاں مراد اس کے دین کی نصرت ہے جس کی شکلیں بے شمار ممکن ہو سکتی ہیں۔ اس وسعت کو قائم رکھنے کے لیے مضاف کو حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ (الاحزاب: 21)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے، ان کے لیے جو اللہ (کی ملاقات) اور روز آخرت (کے اجر) کی توقع رکھتے ہیں۔''

یہاں لفظ اللہ کا مضاف لقاء یا رحمہ [1] یا کوئی اور لفظ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح الیوم الآخر کا مضاف عاقبہ [2] یا جزا یا ثواب یا کوئی اور لفظ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دونوں جگہ مضاف کو حذف کر کے مضمون کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ تمام پہلو مراد لیے جا سکیں۔

د۔ کامل شخصیت سے تعارف کے لیے حذف:

قرآن مجید کے متعدد مقامات پر ایک شخصی کردار بیان ہوا ہے۔ مراد تو اس کی صفات کے کسی خاص پہلو یا کیفیت کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے لیکن اس کی بجائے پوری شخصیت ہی کو پیش کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کا پورا سراپا سامنے رہے لہٰذا مضاف جو صرف اس کے خاص پہلو کو ہی نمایاں کر سکتا، حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (الاحزاب: 19)

---

1. رحمہ: رحمت۔
2. عاقبہ: نتیجہ، انجام۔

Marfat.com

"ان کی آنکھیں اس شخص (کی آنکھوں) کی طرح گردش کر رہی ہیں جس پر سکراتِ موت [1] کی حالت طاری ہو۔"

یہاں ظاہر تو یہ کرنا مقصود ہے کہ خطرے کی صورت میں منافقین کی آنکھیں خوف زدگی کے عالم میں ایک ایسے شخص کی آنکھوں کی طرح گردش کرتی تھیں جس پر موت کی غشی طاری ہو چکی ہو لیکن مضاف...... دورانِ عین [2]......کو حذف کر کے ایک مرنے والے کی کیفیت کی تصویر کشی کر دی جس سے منافقین کی مماثلت بہت واضح ہو گئی۔

❀ ... ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾

(النساء: 114)

"ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ بجھائے یا لوگوں میں اصلاح کی دعوت دے۔"

یہاں "مَنْ اَمَرَ" سے پہلے اس کا ایک مضاف حذف ہے جو جملے کے ابتدائی حصے سے سمجھ میں آ جاتا ہے یعنی نجوی خیر (خیر والی سرگوشی)۔ اس کو محذوف کر کے گویا اس شخص کا کردار نمایاں کر دیا جو صدقہ، نیکی اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے میں مستعد رہتا ہے۔

❀ ... ﴿أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

(التوبۃ: 19)

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے انتظام کو ان لوگوں کے (عمل کے) ہم رتبہ کر دیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیے۔"

یہاں بھی "مَنْ آمَنَ" کا مضاف محذوف ہے۔ مراد اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے مومنین کے اعمال صالحہ ہیں۔

ٹھیک اسی طرح کی آیت سورہ بقرہ کی آیت 177 ہے۔ اس میں بِـرّ (نیکی یا وفاداری) کی وضاحت کے لیے ایک پورا کردار سامنے کر دیا گیا ہے کہ اس کردار کی وفاداری اور نیکی دیکھو۔ یہ ہے وہ بِـرّ جو خدا کے ہاں پسندیدہ ہے نہ کہ تمہارا مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا۔ وہاں آیت یوں ہو گی:

﴿لَٰكِنَّ الْبِرَّ (بِرّ) مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ﴾

(البقرۃ: 177)

"بلکہ وفاداری ان کی (وفاداری) ہے جو اللہ پر ایمان لائیں......"

لیکن "مَنْ اٰمَنَ" کا مضاف حذف کر دیا گیا ہے۔

---

1. سکراتِ موت: موت کے وقت جانکنی کی تکلیف، نزع کی حالت۔
2. دورانِ عین: آنکھ کی گردش۔

Marfat.com

شرطیہ جملوں میں حذف:

شرطیہ جملوں کے دو حصے ہوتے ہیں جن میں سے ایک حصے میں شرط بیان ہوتی ہے اور دوسرے میں اس کا نتیجہ یا اثر، جس کو جواب شرط یا جزا کہتے ہیں۔ شرطیہ جملوں کے پہلے حصے کا آغاز کسی حرف شرط سے ہوتا ہے مثلاً لو (اگر)، ان (اگر)، اذا (جب)، لما (جب) وغیرہ۔

عام جملہ شرطیہ کی مثال سورہ فاطر میں بیان ہے۔ فرمایا:

﴿اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ﴾ (فاطر: 14)

''اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری فریاد نہیں سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمہاری فریاد رسی نہیں کریں گے۔''

یہ آیت دو شرطیہ جملوں سے مرکب ہے۔ ایک جملے کا آغاز حرف اِنْ سے ہوا ہے اور دوسرے کا حرف لَوْ سے، ''اِنْ تَدْعُوْهُمْ'' اور ''لَوْ سَمِعُوْا'' ان جملوں کا شرطیہ حصہ ہیں جن کا جواب شرط بالترتیب لَا يَسْمَعُوْا دُعَاءَكُمْ اور مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ میں ہے۔

علی ہذا القیاس سورۂ فاطر میں یوں ہے:

﴿لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر: 45)

''اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جان دار کو بھی نہ چھوڑتا۔''

یہاں بھی حرف لَوْ سے شرطیہ جملہ شروع ہوتا ہے جس کا جواب یا نتیجہ مَا تَرَكَ سے شروع ہونے والے حصے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اس طرح کے مکمل شرطیہ جملے بکثرت ہیں لیکن کہیں کہیں ایسے جملے بھی پائے جاتے ہیں جن میں جواب شرط حذف ہو گیا ہے۔ ایسے جملوں کا مفہوم متعین کرنے میں قاری کو مشکل پیش آ سکتی ہے۔ اس لیے حذف کا یہ اسلوب سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جواب شرط کے حذف کے بڑے مواقع حسب ذیل ہیں:

الف: غایت وضاحت یا جواب شرط کا پہلے سے مخاطب کی معلومات میں ہونا۔

ب: سیاق کلام [1] میں اس کا تذکرہ ہونا۔

ج: کلام میں دوسرے مقام میں وضاحت موجود ہونا۔

د: شدت تاثر کو قائم رکھنے کی غرض ہونا۔

ھ: جواب شرط کا کسی ایسے مضمون پر مشتمل ہونا جس کی تعبیر سے کلام قاصر ہو۔

و: مبالغہ کے لیے، جہاں تخیل کی جولانی کو حرکت میں لانا ضروری ہو۔

---

[1] سیاقِ کلام: کلام کا سیاق و سباق، پس منظر۔

Marfat.com

اب ہم چند مثالوں سے ان مواقع کی وضاحت کرتے ہیں:

الف۔ غایت وضاحت:

❀ ... ﴿وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ‌ ؕ﴾

(الانعام: 35)

''اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو...... (ایسا کر دیکھو)۔''

نبی ﷺ جب کفار کو قرآن کی طرف بلاتے تو وہ جواب میں یہ مطالبہ کرتے کہ اگر آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں تو ہمیں معجزہ دکھائیں۔ قرآن کا استدلال یہ تھا کہ ایمان معجزہ دیکھنے پر منحصر نہیں بلکہ یہ عقل وفہم کو استعمال میں لانے سے حاصل ہوتا ہے۔ پچھلی قوموں نے معجزات دیکھے لیکن پھر بھی ایمان کی توفیق نہ پائی کیونکہ انہوں نے اپنے دل و دماغ سے کام نہیں لیا۔ نبی ﷺ کو خیال ہوتا کہ اگر کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو شاید ضدی لوگ اس سے متاثر ہو کر راہ راست پر آ جائیں۔ اس پر آیت زیر بحث میں یہ فرمایا کہ ہم تو کوئی نشانی پیش کرنے سے رہے۔ اگر تم خود زمین یا آسمان میں سے کوئی نشانی لا سکتے ہو تو ایسا کر دیکھو۔ ''ایسا کر دیکھو'' کے الفاظ کلام کا بدیہی تقاضا ہیں۔ اس لیے ان کو حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿وَلَوۡلَاۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ مُّصِيۡبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝﴾

(القصص: 47)

''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی آفت آئی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے بنتے تو...... (ہم رسول نہ بھیجتے)۔''

اس آیت میں قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو رسول کی بعثت کے بغیر محض ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں بھی ان پر گرفت کرتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تاکہ وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی رسول آیا ہوتا تو ہم اللہ کی آیات کی پیروی کرنے والے اور رسول ﷺ پر ایمان لانے والے بنتے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ان کا عذر ختم کرنے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ جملے کے پہلے حصے ہی میں جواب شرط کا مضمون (یعنی رسول نہ بھیجنا) از خود نمایاں ہو گیا ہے، اس لیے الفاظ میں اس کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

❀ ...... سورہ توبہ کی آیت 59 وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا ..... الخ کا جواب شرط بھی بالکل واضح ہے کہ ایسا کرنا ان کے لیے بہتر ہوتا۔

ب۔ سیاق وسباق میں مضمون کا تذکرہ ہونا:

1۔ ﴿وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُيِّرَتۡ بِهِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِهِ الۡاَرۡضُ اَوۡ كُلِّمَ بِهِ الۡمَوۡتٰى‌ؕ﴾ (الرعد: 31)

Marfat.com

''اور اگر کوئی ایسا قرآن بھی اترتا جس سے پہاڑ حرکت میں آجاتے یا زمین پاش پاش ہو جاتی یا مردے بولنے لگتے تب بھی ......'' (یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنتے)۔

اس آیت سے قبل کفار کے اس مطالبے کا ذکر ہے کہ ہمیں رب کی طرف سے کوئی خاص نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ اس کا جواب دیا ہے کہ جن لوگوں کو ایمان لانا ہوتا ہے وہ اللہ کے کلام سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ اے نبی، پچھلی قوموں کی طرح ہم نے تم کو بھی وحی کی تعلیم دی تا کہ تم کفار تک اس کو پہنچا دو۔ جنھیں ایمان لانا ہو گا وہ ایمان لائیں گے۔ دوسرے لوگ اسی طرح کے مطالبات میں الجھے رہیں گے۔ اگر ہم اس قرآن میں پہاڑوں کو حرکت دینے، زمین کو پاش پاش کرنے اور مردوں کو ناطق [1] بنانے کی تاثیر بھی رکھ دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنتے۔ سلسلہ کلام میں کلام کا رخ نہایت واضح تھا، اس لیے جواب شرط کو حذف کر دیا گیا۔

❀ ... ﴿ لَوۡ يَعۡلَمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ ٱلنَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمۡ وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ ﴾ (الانبیاء: 39)

''اگر یہ کفر کرنے والے جان پاتے اس وقت کو جب کہ یہ عذاب نار کو نہ اپنے چہروں سے دفع کر سکیں گے نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی کسی طرف سے کوئی مدد ہو گی تو ...... (یہ عذاب کی جلدی نہ مچاتے)۔''

سلسلہ کلام میں یہ مضمون ہے کہ کفار ایمان نہیں لاتے اور برابر یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے ایمان نہ لانے کے نتیجے میں ان پر عذاب کیوں نہیں آ رہا ہے۔ ان کی اس ہٹ دھرمی پر فرمایا کہ عجلت پسندی انسان کی سرشت میں ہے۔ عذاب کی نشانیاں تو اپنے وقت پر نمودار ہوں گی۔ کاش یہ کفار اس وقت کا بھی کچھ اندازہ کر پاتے جب خدا کے عذاب کی آگ ان کو آگے پیچھے سے گھیر لے گی اور ان پر بے کسی کی حالت طاری ہو گی تو یہ عذاب کے لیے یوں جلدی نہ مچاتے۔ کلام کا ارتقا جواب شرط کے مضمون (عذاب کے لیے جلدی نہ مچانا) کا از خود تقاضا کر رہا ہے، اس لیے اس کو حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُونَ عِلۡمَ ٱلۡيَقِينِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ ٱلۡجَحِيمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ ٱلۡيَقِينِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ ٱلنَّعِيمِ ۝٨ ﴾ (التکاثر: 5-8)

''ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ دوزخ سے ضرور دوچار ہو گے، پھر تم اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے اس دن نعمتوں کے باب میں ضرور پرسش ہونی ہے تو ...... (مال و دولت سمیٹنے کی دوڑ میں اپنی قیمتی زندگی برباد نہ کرتے)۔''

ان آیات سے قبل انسان کو ملامت کی گئی ہے کہ وہ اپنی زندگی مال و دولت جمع کرنے کی دوڑ میں برباد کر دیتا ہے یہاں تک کہ موت آ کر اس کی مہلت عمل کو ختم کر دیتی ہے۔ اس غفلت کا نتیجہ درجہ بدرجہ اس کے سامنے آئے گا۔ کاش اس کو اس حرکت کے برے انجام کا یقین ہوتا تو وہ یوں زندگی برباد نہ کرتا۔ جملے میں شرط کا جواب حذف کر دیا

---

[1] ناطق: بولنے والا۔

Marfat.com

گیا کیونکہ وہ اظہار کے بغیر بھی واضح تھا اور سلسلہ کلام اس کی طرف رہنمائی کر رہا تھا۔

بعض لوگ ان آیات کی ترکیب کو نہیں سمجھتے۔ وہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ اور بعد کی آیات کو جواب شرط قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ آیات لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ کے مفعول کے محل میں ہیں اور جواب شرط ان کے بعد محذوف ہے۔ اس کو ہم نے قوسین میں کھول دیا ہے۔

ج۔ کلام میں وضاحت موجود ہونا:

❀ ... ﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰﴾ (النور: 20)

''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کا کرم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ مہربان و رحیم ہے تو ...... (تم اس کی پکڑ میں آ گئے ہوتے)۔''

یہ واقعۂ افک [1] کے سلسلے کی آیت ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ بلاتحقیق سنی سنائی باتوں کو قبول کر کے تہمتیں لگانے کا عمل ایسا تھا کہ اس پر تم خدا کی گرفت میں آ گئے تھے لیکن اس نے محض اس بنا پر تمہیں عذاب سے محفوظ رکھا کہ وہ بندوں پر بڑا مہربان اور شفقت کرنے والا ہے۔ جواب شرط کا محذوف مضمون خود قرآن نے اوپر آیت 14 میں کھول دیا ہے۔ فرمایا:

❀ ... ﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۴﴾ (النور: 14)

''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، دنیا اور آخرت میں، تو جس چیز میں تم ملوث ہو گئے تھے اس کے باعث تم کو ایک عذاب عظیم آ پکڑتا۔''

❀ ... ﴿قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا﴾ (هود: 88)

''اس نے کہا: اے میری قوم! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مزید اپنی جانب سے مجھے رزق حسن سے بھی نوازا تو ...... (اس کے سوا میں تمہیں اور کس چیز کی دعوت دوں؟)''

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا قول ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو توحید اور معاملات میں دیانت داری کی تعلیم دی جس کو قوم نے دخل در معقولات قرار دیا۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تعلیم میں تمہیں دے رہا ہوں یہ تو میری فطرت کی آواز بھی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے مدلل کر دیا۔ اس کی حقانیت کا یقین رکھتے ہوئے میں اس کے سوا تمہیں کس چیز کی دعوت دوں۔ جواب شرط کے اس مضمون کو خود قرآن مجید نے حضرت صالح علیہ السلام کے مشابہ

[1] افک: غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر منافقین نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان (افک) لگایا تھا جس پر قرآن میں سیدہ کی براءت پر مشتمل آیات نازل ہوئیں۔

Marfat.com

کلام میں واضح کر دیا ہے۔ فرمایا:

❀ ... ﴿قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰٮنِىۡ مِنۡهُ رَحۡمَةً فَمَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ عَصَيۡتُهٗ﴾ ❀ (ھود: 63)

''اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا ہے، پھر تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان افضال وعنایات کے بعد اگر میں کسی دوسری چیز کی دعوت دوں تو یہ اس کی نافرمانی ہوگی جس پر وہ میری گرفت فرمائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو کون ہے جو اس وقت میری مدد کو آئے گا؟

د۔ شدت تاثر کو قائم رکھنا:

❀ ... ﴿وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ۝﴾ ❀ (الانفال: 50)

''اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں، مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزہ جلنے کے عذاب کا تو......''

یہاں کفار کی وہ حالت بیان کی ہے جس سے وہ جان کنی کے وقت اور اس کے بعد دوچار ہوتے ہیں۔ فرشتے ان کو پیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں اور عذاب کے ڈراوے دیتے ہیں۔ یہاں جواب شرط کو حذف کر دیا ہے تا کہ قاری پر تاثر باقی رہے اور وہ کفار کے عبرت انگیز انجام کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے تو اندازہ ہوتا کہ کفار کی کیا درگت بننے والی ہے۔

❀ ... ﴿اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى ۙ ۝ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى ؕ ۝ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَى الۡهُدٰٓى ۙ ۝ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰى ؕ ۝ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ ۝ اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ ۝﴾ ❀ (العلق: 9-14)

''ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا تو......! بھلا دیکھو تو اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا تو......! کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟''

الفاظ کے تیور سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متکلم شدید غضب کی حالت میں ہے۔ اسے یہ بات انتہائی طور پر ناگوار گزری ہے کہ کوئی بندہ نماز پڑھنا چاہے اور دوسرا اس کو روک دے۔ وہ دونوں کے طرزِ عمل کا موازنہ کرتا ہے اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن شدت غضب میں اپنی بات کو پورا نہیں کر پاتا۔ لہٰذا کلام میں حذف چھوڑ دیا گیا ہے تا کہ شدت تاثر قائم رہے اور غلط طرز عمل والا آدمی اپنی حرکت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو۔

Marfat.com

۵۔ تعبیر کی مشکل:

کہیں بیان کے لیے وسعت درکار ہوتی ہے اور آدمی اگر اس کے پیچھے پڑ جائے تو سررشتہ مضمون ❶ ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور بات پھر بھی پوری طرح گرفت میں نہیں آتی۔ اس صورت میں حذف کا اسلوب ہی مناسب ہوتا ہے جو وسعت کا احاطہ کرنے کا کام قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔

❀ ... ﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

(الصافات: 103-105)

''پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے اس کو آواز دی کہ اے ابراہیم، بس، تم نے خواب کو سچ کر دکھایا تو ...... بے شک ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قربان کیے جانے کے واقعہ کا بیان ہے۔ بیان واقعہ کے آغاز میں حرف شرط لَمَّا آیا ہے لیکن آخر تک اس کا جواب سامنے نہیں آیا بلکہ اس اقدام کے صلہ کی خبر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قربانی کے لیے تیار ہو کر باپ اور بیٹے نے عبدیت کا جو عالیشان مظاہرہ کیا اور اپنے رب کی رضاجوئی کے لیے انہوں نے اپنی عزیز ترین متاع کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں رکھا تو ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسی عظیم رحمتوں کا ان کو مستحق بنا گیا جس کی وسعتوں سے صرف اللہ تعالیٰ ہی آگاہ ہے اور جن کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہیں۔ چنانچہ لَمَّا کا جواب حذف کر دیا تاکہ قاری چشم تصور سے ان کا ادراک کرے۔

❀ ... ﴿وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ﴾

(الزمر: 73-74)

''اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان سے کہیں گے السلام علیکم، شاد رہو، پس اس میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے تو ...... اور وہ پکار اٹھیں گے، شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔''

یہاں بھی انجام کار متقین کے جنت میں پہنچنے کی خبر ہے۔ حرف شرط اِذَا کا جواب کہیں مذکور نہیں۔ مراد یہی ہے کہ فرشتوں کے استقبال کے بعد متقین جنت میں داخل ہوں گے تو ایسی ایسی نعمتوں سے مستفید ہوں گے جو احاطہ بیان میں نہیں آ سکتیں۔ ان کا اندازہ یہاں بیٹھے آج کون کر سکتا ہے۔ تعبیر کی اس مشکل کے پیش نظر جواب شرط کو

❶ سررشتۂ مضمون: مضمون کی لڑی کا سرا، مفہوم۔

Marfat.com

حذف کر دیا۔ آخر میں یہ بتایا گیا کہ متقین جب ان نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے تو الحمد للہ کا نعرہ لگائیں گے۔

و۔ مبالغہ کے لیے:

❀ ... ﴿وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝﴾ (البقرۃ: 165)

''اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب یہ عذاب سے دوچار ہو کر دیکھیں گے کہ سارا زور و اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے تو......''

یہاں اس عذاب کی تفصیل نہیں کی جس کو دیکھ کر ہر شخص اس کی شدت کا قائل ہو جائے گا اور یہ یقین کرے گا کہ تمام تر قوت اللہ ہی کی ہے۔ اثرات بیان کر دینا اور عذاب کی وضاحت نہ کرنا مبالغے کے لیے ہے تاکہ قاری اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اس کا زیادہ سے زیادہ اندازہ خود کرے۔

محذوف مضمون کو متعین کرنے کے لیے جملہ کے سیاق و سباق کو دیکھنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اگر اس بارے میں تساہل سے کام لیا جائے تو آدمی ایسے معانی مقدر مان لیتا ہے جن کو قبول کرنے سے سلسلہ کلام ابا کرتا [1] ہے۔ چنانچہ بدیہی طور پر متعین ہونے والے محذوف کلام کو سمجھنے میں بھی لوگوں نے اس لیے غلطیاں کی ہیں کہ انہوں نے سلسلہ کلام پر توجہ نہیں دی۔

کلام کے موقع و محل ہی سے یہ بھی متعین ہوتا ہے کہ محذوف جملہ مضمون کی شدت کا تقاضا کر رہا ہے یا اس کا موقع حسرت یا ملامت وغیرہ کا ہے۔ شرطیہ جملوں میں جواب شرط محذوف کرنے سے کلام میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اگر موقع شدت کا ہو اور حسرت، ملامت، زجر، [2] شفقت، عنایت وغیرہ کے پہلو نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اگر موقع و محل ان کا ہو۔ اس لیے سیاق و سباق اور موقع و محل سمجھنے سے کسی حال میں بھی بے اعتنائی [3] نہیں برتنی چاہیے۔

☆......☆......☆

محبت

جس طرح ہر کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح ایمان اور تعلیم قرآن کی انتہا محبت الٰہی ہے۔ تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے۔

قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے مگر توریت اور انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے؟ تو فرمایا: ''خدا کی محبت تمام دل، تمام روح، تمام عقل سے کرنا یہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے۔'' (متی 1:) (حمید الدین فراہی)

---

[1] ابا کرنا: انکار کرنا۔ [2] زجر: ڈانٹ ڈپٹ۔ [3] بے اعتنائی: توجہ نہ دینا، نظر انداز کرنا۔

Marfat.com

حذفِ فعل

جملے میں فعل کے حذف کا اسلوب قرآن میں عام استعمال ہوا ہے۔ اس کی متعدد شکلیں ہیں جن کو ہم ایک ترتیب کے ساتھ مثالیں دے کر بیان کریں گے۔

الف۔ التفات کے انداز کا حذف:

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بعض مقامات میں سلسلہ کلام میں غائب کے بعد یکا یک حاضر یا حاضر کے بعد غائب وغیرہ کے صیغے آ جاتے ہیں اور کلام کا رخ بدل جاتا ہے۔ یہ شکل التفات کی ہوتی ہے۔ اس کے مماثل بعض جملے قرآن مجید میں ایسے بھی آئے ہیں جہاں التفات مقصود نہیں لیکن جملے کا انداز التفات کا سا ہوتا ہے جس میں ضمیریں بدل جاتی ہیں۔ عام طور پر ان جملوں سے قبل قال، قالوا یا قیل وغیرہ فعل کو محذوف مانا جاتا ہے جبکہ بعض مقامات میں یہ ماننا ضروری نظر نہیں آتا کہ یہ قول زبان ہی سے ہو۔ یہ قول زبان حال سے بھی مراد ہو سکتا ہے۔ صیغوں کی اچانک تبدیلی سے ایک قاری اس حذف پر آسانی سے متنبہ ہو جاتا ہے۔ یہی چیز فعل حذف کا جواز فراہم کرتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾

(البقرة: 57)

''اور تم پر ہم نے بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلوٰی اتارے۔ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔''

اس آیت کا آغاز ماضی سے ہوا ہے جبکہ آخری حصے میں صیغہ امر سے پاکیزہ چیزیں کھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے افضال وعنایات کا ذکر ہے۔ من وسلوٰی کی نعمتیں زبان حال سے کہتی تھیں کہ خدا کی اس عطا سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی صورت و ہیئت سے یہی دعوت دیتی ہے کہ اس نعمت الٰہی کو برتو۔ "کُلُوْا" (تم کھاؤ) سے قبل قلنا (ہم نے کہا) کو محذوف بھی مانا جا سکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ (البقرة: 63)

''اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور (پہاڑ) کو۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے۔ مضبوطی کے ساتھ۔''

اس آیت میں صیغہ فعل کی تبدیلی اوپر والی آیت جیسی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو کتاب آسمانی عطا کیے جانے کا

Marfat.com

ذکر ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت و قدرت کا مظاہرہ فرمایا اور بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ زندگی کے تمام مراحل میں پورے عزم اور استقامت کے ساتھ اس کے احکام پر عمل کریں گے۔ خُذُوْا سے پہلے قُلْنَا کو محذوف کر دیا گیا ہے کیونکہ آگے کا جملہ اسی عہد (وعدہ) کی تعبیر ہے جس کا ذکر پہلے ہوا۔

❀ ... ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟﴾ (البقرة: 285)

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ (ان کا اقرار ہے کہ) ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

یہاں پہلے غائب کا صیغہ استعمال ہو رہا تھا کہ یکایک لَا نُفَرِّقُ سے متکلم کا صیغہ آ گیا۔ اس جملے سے پہلے ''یقولون'' (وہ کہتے ہیں) کا لفظ محذوف مان سکتے ہیں کیونکہ آگے کا جملہ امت کی طرف سے رسولوں کے باب میں اپنے اس عقیدہ کے اعلان و اظہار پر مشتمل ہے کہ وہ ان کے بارے میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہے۔

ب۔ فعل ناقص کا حذف:

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ماضی کی سرگزشت میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ اس سے بھی اشارہ ماضی ہی کی طرف مقصود ہوتا ہے۔ چونکہ فعل مضارع حال اور مستقبل کی تعبیر کے لیے آتا ہے اس لیے قاری مفہوم کے تعین میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ فعل مضارع کے ساتھ افعال ناقص (کان، صار، اصبح وغیرہ) مل کر ماضی کے معنی دیتے ہیں اس لیے مذکورہ مواقع میں بالعموم فعل ناقص کو حذف کر دیا گیا ہوتا ہے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (القصص: 5)

''ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے۔''

اس موقع پر فرعون کی سرکشی کا حوالہ ہے کہ وہ تو ظلم و تعدی کی اسکیموں کو بروئے کار لا رہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کے ہاتھوں پسے ہوئے بنی اسرائیل پر اپنا فضل و کرم کرے۔ یہ ماضی کا واقعہ ہے جبکہ نرید مضارع ہے۔ لہٰذا یہاں اصل میں کنا نرید (ہم چاہتے ہیں) تھا۔ فعل ناقص کنا کو حذف کر دیا گیا۔

❀ ... ﴿مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ﴾ (هود: 109)

''یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے۔''

اس آیت میں کَمَا یَعْبُدُ سے مراد کَمَا کَانَ یَعْبُدُ ہے کیونکہ یہ ماضی کا حوالہ ہے۔

❀ ... ﴿وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: 159)

Marfat.com

''اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے تھے۔''

یہ بھی ماضی کی ایک سرگزشت ہے۔ اس میں یَھْدُوْنَ اور یَعْدِلُوْنَ کے مضارع کے صیغے ماضی استمراری کا مفہوم دے رہے ہیں۔ یعنی ان سے پہلے فعل ناقص کانوا حذف کر دیا گیا ہے۔

❀ ... ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ (ھود: 74)

''تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا۔''

یہاں بھی مراد صَارَ یُجَادِلُنَا ہے۔ یعنی فعل ناقص صَارَ حذف ہے۔

❀ ... ﴿وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ﴾ (ھود: 38)

''اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب بھی اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔''

ماضی کی اس سرگزشت میں حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر ہے۔ فعل مضارع یَصْنَعُ سے پہلے جَعَلَ حذف ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ماضی استمراری کے معانی پیدا ہوتے ہیں۔

❀ ... ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (البقرۃ: 144)

''ہم آسمان کی طرف تمہارے رخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو۔''

مکہ میں مسلمان اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق بیت المقدس کو قبلہ مان کر نماز ادا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انتظار رہنے لگا کہ ابراہیمی قبلہ کی جانب رخ کرنے کا حکم کب ہوتا ہے۔ ہجرت کے ڈیڑھ برس بعد وہ ساعت آئی جب ان آیات میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا۔ اصل حکم کی تمہید کے طور پر ماضی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار کا حوالہ ہے۔ گویا اصل میں مراد قَدْ کُنَّا نَرٰی (ہم دیکھتے رہے ہیں) ہے جس میں سے فعل ناقص کُنَّا کو حذف کر دیا گیا۔ یوں بھی حرف قَدْ ماضی کے صیغہ پر ہی آیا کرتا ہے جبکہ یہاں نَرٰی (ہم دیکھتے ہیں) مضارع کا صیغہ ہے۔

ج۔ اسم منصوب سے متعلق فعل کا حذف:

قرآن مجید میں بکثرت مواقع میں کوئی اسم منصوب موجود ہوتا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ وہ مفعول بہ یا ظرف ہو لیکن اس کا متعلق فعل کلام میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں سلسلہ کلام خود اس فعل کے حذف کو کھول رہا ہوتا ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ مثلاً

❀ ... ﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا﴾ (الاعراف: 65)

''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (ہم نے بھیجا)۔''

Marfat.com

اوپر آیت 59 میں لقد ارسلنا نوحا کے الفاظ آئے تھے۔ مندرجہ بالا آیات اور سلسلہ کلام میں آگے آنے والی متعدد اس کی مماثل آیات اسی پر عطف ہیں۔ ان سب میں فعل ارسلنا کو حذف کر دیا گیا ہے اور بھیجے گئے رسول کا نام منصوب لایا گیا ہے جو اس کے مفعول ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

سورۃ انبیاء کی متعدد آیات جن میں رسولوں کا ذکر ہے اسی اسلوب پر آئی ہیں لیکن وہاں سلسلہ کلام میں انبیاء و رسل پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا ذکر ہے۔ اس مناسبت سے وہاں مفہوم ہوگا: ''ہم نے نوح پر کرم کیا جب ......'' (آیت 76)

''ہم نے ایوب پر اپنا فضل کیا جب ......'' (آیت 83) وغیرہ۔

❀ ... ﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (آل عمران: 48-49)

''اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول (بنا کر بھیجے گا)۔''

یہاں لفظ رَسُوْلًا منصوب ہے جس کا متعلق فعل موجود نہیں۔ مراد ہے: یبعثہ رسولا۔

❀ ... ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (البقرۃ: 138)

''اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔''

یہاں موقع یہود و نصاریٰ کو ابھارنے اور شوق دلانے کا ہے کہ وہ یہودیت و نصرانیت کی فرقہ پرستی چھوڑ کر تمام انبیاء کو مانیں اور ان کی لائی ہوئی وحی پر ایمان لائیں تاکہ ان کے اوپر اصل اسلام کا رنگ چڑھ سکے۔ اس لیے اسم منصوب صِبْغَةَ کا محذوف فعل صیغہ امر میں ہونا موزوں ہے۔

اسی کے مماثل اسلوب میں قرآن میں بعض جگہ وعد اللہ منصوب آیا ہے۔ وہاں موقع و محل کا تقاضا یہ ہے کہ مخاطبین اس دھمکی سے ڈریں جو ان کو دی جا رہی ہے۔ ان مقامات پر بھی محذوف فعل صیغہ امر ہی ماننا مناسب ہے۔

❀ ... ﴿وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ﴾ (البقرۃ: 135)

''اور کہتے ہیں کہ یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، کہو بلکہ ابراہیم کی ملت (کی پیروی کرو) جو اللہ کی طرف یکسو تھا۔''

یہاں ملت حالت نصب میں ہے اور مفعول ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں یہود و نصاریٰ کی دعوت کا حوالہ ہے۔ دوسرے حصہ میں اس کی تردید میں فرمایا ہے کہ یہودیت و نصرانیت اختیار کرنے کی یہ دعوت گمراہ کن ہے۔ راہ ہدایت کو پانے کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کرو۔ یہاں بھی موقع کلام صیغہ امر کا تقاضا کرتا ہے۔

فعل امر کے حذف کی ایک مثال سورۃ البقرہ کی آیت 240 میں ہے۔ اس میں لفظ وصیة منصوب ہے۔ مراد

Marfat.com

یہ ہے کہ وفات پانے والے شوہر بیویوں کے حق میں وصیت چھوڑ جائیں۔ اسی طرح سورہ یونس 23 میں متاع الحیوۃ الدنیا کے اسم منصوب متاع کا فعل محذوف ہے۔ موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بھی صیغہ امر مانا جائے۔ یعنی چند روزہ دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو۔

❀ ... ﴿نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ﴾ (یونس : 28)

''ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ (ٹھہرو)۔''

یہاں اسم منصوب اسم ظرف مکان کے محل میں ہے۔ اس سے پہلے قفوا (رک جاؤ) یا امکثوا (ٹھہرو) حذف ہے۔ یہ ایک فوری حکم کا موقع ہے۔ ایسے مواقع میں فعل کو بالعموم اس لیے حذف کر دیا جاتا ہے کہ مخاطب کی ساری توجہ حکم پر مرکوز ہو جائے اور وہ اس کی بلا تاخیر بجا آوری کر سکے۔

❀ ... ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝﴾

(الصافات : 6-7)

''بے شک ہم ہی نے سجایا ہے آسمان زیریں کو ستاروں کی زینت سے اور (اس کو محفوظ کیا ہے) اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی در اندازی سے۔''

اس آیت میں حفظا مصدر ہے جو تاکید اور مبالغہ کے معنی دے رہا ہے۔ اس کا متعلق فعل اسی مادہ سے حفظنا (ہم نے محفوظ کیا) محذوف ہے۔ مصدر کا وجود خود اس فعل کا پتا دے رہا تھا اس لیے اس کو حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝﴾

(نوح : 7-9)

''میں نے جب بھی ان کو توبہ کی دعوت دی کہ تو ان کو بخشے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی ضد پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔ پھر میں نے ان کو ڈنکے کی چوٹ پکارا۔ پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی۔''

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کی تمہید ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم پر فیصلہ کن عذاب کی درخواست کی۔ یہاں اسلوب کلام کا تقاضا تھا کہ "اصروا اصرارا" اور "اعلنت لھم اعلانا" ہوتا لیکن چونکہ ساتھ آنے والے فعل میں مصدر (استکبارا اور اسرارا) ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں حذف کر دیا گیا تا کہ کلام میں ثقل نہ پیدا ہو جاتے۔

د۔ اذ، ذلك اور كذلك کے ساتھ فعل کا حذف:

1۔ اذ (جب) ظرف زمان کا مفہوم دیتا ہے۔ اس کے تحت بالعموم ماضی کے کسی واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے اور

Marfat.com

مراد یہ ہوتی ہے کہ اس واقعہ کو یاد کرو یا خیال کرو جب یوں ہوا۔ گویا اس سے قبل ایک فعل امر محذوف ہوتا ہے۔
اذ کے استعمال کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ ایک مثال ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ﴾ (البقرة : 63) پہلے بیان ہو چکی ہے۔

2۔ ذلك (وہ) اسم اشارہ ہے۔ بعض مقامات پر محض یہی اسم ایک جملہ کا قائم مقام ہو کر آیا ہے۔ جن باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ اوپر سلسلہ کلام میں بیان ہو چکی ہوتی ہیں اور اب محض ان کا خیال و اہتمام رکھنے پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے لیکن فعل امر کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الحج: 30)

''ان امور کا (اہتمام رکھو) اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔''

اوپر حج کے سلسلہ میں کچھ ہدایت دی گئی ہیں۔ اب ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابھارا ہے کہ ان باتوں کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو اور ان کا اہتمام رکھو لیکن اس مضمون کو ادا کرنے والا فعل محذوف ہے۔
اس کے مماثل اسلوب آگے آیت 32 میں استعمال ہوا ہے۔

3۔ ذلك کی طرح کذلك بھی قرآن میں ایک جملہ کا قائم مقام ہو کر آیا ہے اور اس کا متعلق فعل حذف ہے۔
مثلاً فرمایا:

﴿کَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۵۹﴾﴾ (الشعراء: 59)

''اسی طرح (ہم کرتے ہیں) اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔''

اس آیت سے قبل فرعونیوں کی تباہی کا ذکر ہے۔ یہاں کہا کہ رسولوں کے مکذبین (جھٹلانے والوں) کے ساتھ ہمارا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی کذلك نفعل بالمکذبین. (ہم جھٹلانے والوں کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے ہیں)

ہ۔ فعلیہ جملے کا حذف:

بسا اوقات موقع کلام کے پیش و عقب میں ایسی وضاحتیں موجود ہوتی ہیں جن کی بدولت کسی معنی کے اظہار کے بغیر بھی وہ معنی گرفت میں آ رہا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر قاری کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اس معنی کو ادا کرنے والا جملہ حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کو سیاق و سباق کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (البقرة: 213)

''لوگ ایک ہی امت بنائے گئے۔ (انہوں نے اختلاف پیدا کیا) تو اللہ نے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قول فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر

Marfat.com

رہے ہیں ان میں فیصلہ کر دے۔''

یہاں انبیاء کی بعثت کا مقصد امتوں کے مابین پیدا ہونے والے اختلاف کو رفع کرنا بتایا لیکن آغاز کلام میں اس اختلاف کا تذکرہ نہیں آیا بلکہ امتوں کی وحدت کا ذکر ہے۔ آخر آیت میں رسولوں کی بعثت کی مصلحت کے طور پر امتوں کے اختلاف کا ذکر آ رہا تھا اور اگر شروع میں بھی اس کا بیان آتا تو یہ تکرار ناگوار ہوتی اس لیے امة واحدة کے بعد فاختلفوا (وہ اختلاف میں پڑ گئے) کا جملہ حذف کر دیا گیا۔ گویا مراد یہ ہے کہ امتوں میں وحدت تھی، پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے رسول مبعوث کیے۔

❀ ... ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرة: 239)

''اگر تم خطرے کی حالت میں ہو تو پیدل یا سوار (نماز ادا کرو)۔''

اس آیت سے قبل نماز کی محافظت اور اللہ کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہونے کا حکم الفاظ میں موجود ہے۔ خطرے کی حالت میں چونکہ نماز کے آداب و شرائط کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے پیدل یا سوار جس صورت میں ممکن ہو نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ چونکہ موقع و محل سے واضح تھا کہ نماز ادا کرنے کا حکم ہے، اس لیے جملہ کا اتنا حصہ حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ (یونس: 58)

''کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت سے (نازل ہوا ہے) تو چاہیے کہ اس پر شادمان ہوں۔''

موقع و محل قرآن مجید کے نزول کا احسان جتانے کا ہے۔ یہ مضمون چونکہ واضح تھا اس لیے انزل (نازل ہوا) یا جاء (آیا) یا اس کے ہم معنی کوئی اور فعل حذف کر دیا کیونکہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ جملے کا خلا بھرنا قاری کے بس میں تھا۔

❀ ... ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾﴾ (الانعام: 33)

''ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے (تو صبر کرو) کیونکہ یہ تمہیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔''

اس جملے کا خلا ایک قاری فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ جب تک اس خلا کو نہ بھرا جائے فَإِنَّهُمْ سے آگے کا جملہ بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو صبر کی تلقین یا اسی کے ہم معنی کسی اور مضمون سے بھرا جا سکتا ہے۔ آیت میں مضارع سے پہلے قد آنے کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مضارع کو ماضی استمراری کے معنی میں لیا جائے۔ چنانچہ یہاں بھی فعل ناقص کنا محذوف ہے۔ یعنی قد کنا نعلم.

و۔ لام سے پہلے حذف:

بسا اوقات کسی فعل پر ''لام'' آ کر یہ ظاہر کر رہا ہوتا ہے کہ یہ فعل کسی عمل کا نتیجہ بیان کر رہا ہے لیکن اوپر کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہوتا جس سے وہ فعل ظاہر ہوتا ہو۔ اصل میں اس صورت میں بھی ایک فعل محذوف ہوتا ہے اور اس کی

Marfat.com

موجودگی پر وہی "ل" قرینہ مہیا کرتا ہے۔ سلسلہ کلام پر غور سے محذوف فعلیہ جملہ بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ﴾ (الحج: 5)

"پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں پھر (ایک وقت دیتے ہیں) تاکہ تم جوانی کو پہنچو۔"

یہاں بھی دوسرے ثُمَّ (پھر) کے بعد ایک خلا محسوس ہوتا ہے کہ "ہم مہلت دیتے ہیں" یا "موقع عطا کرتے ہیں" تاکہ بچہ جوان ہو جائے۔ لِتَبْلُغُوْا (تاکہ تم جوانی کو پہنچو) میں لام کا موجود ہونا اس محذوف کا قرینہ مہیا کرتا ہے کیونکہ اس میں نتیجہ بتایا گیا ہے، اصل فعل نہیں بتایا گیا۔

❀ ... ﴿وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ﴾ (الانفال: 42)

"اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور مختلف ہو جاتے لیکن (اللہ نے فرق نہ ہونے دیا) تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے پا چکا تھا۔"

یہاں لٰكِنْ (لیکن) کے بعد حذف ظاہر ہے۔ آگے لام کا موجود ہونا اس کا قرینہ فراہم کرتا ہے۔ آخری جملہ محذوف جملے کا فائدہ بیان کر رہا ہے۔

❀ ... ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ﴾ (بنی اسرائیل: 7)

"پھر جب پچھلی بار کی میعاد آئی تو (ہم نے تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں گھس جائیں۔"

یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ میں بیت المقدس کی تباہی کے دوسرے موقع کا حوالہ ہے۔ لِيَسُوْءٗا (تاکہ وہ بگاڑ دیں) سے پہلے مضمون کا حذف بالکل عیاں ہے کیونکہ آیت کا ابتدائی حصہ شرطیہ ہے اور جواب شرط موجود نہیں۔ آگے لام اس حذف کا قرینہ ہے۔ اوپر آیت 5 میں بیت المقدس کی تباہی کے پہلے موقع کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ طاقتور دشمن تم پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ [1] وہی مضمون یہاں حذف ہے کیونکہ قاری کا ذہن فوراً اوپر کی بات کی طرف جا سکتا ہے۔

ز۔ مشابہ فعل کا حذف:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ مفعول حرفِ عطف کے ساتھ جمع ہو کر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے ساتھ متعلق فعل کو بیان کیا جاتا ہے جبکہ باقی مفعولوں کا متعلق فعل حذف کر دیا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر مناسبت رکھنے والا محذوف فعل قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (النساء: 36)

"اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک (کرو)۔"

---

[1] بیت المقدس (یروشلم) کی پہلی تباہی 86-587 ق م میں شاہِ بابل بخت نصر کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی جب کہ دوسری مرتبہ رومی جرنیل ٹائٹس نے 70ء میں بیت المقدس کو تباہ کیا۔ (حسان عارف)

Marfat.com

یہاں دو مفعول اللہ اور والدین ہیں۔ اللہ کے ساتھ بندگی کا فعل مناسبت رکھتا ہے لیکن والدین کے لیے یہ موزوں نہیں۔ ان کا حق حسن سلوک کا ہے۔ اس کو ادا کرنے والا فعل، احسنوا (اچھا سلوک کرو) حذف کر دیا گیا جس کا قرینہ مصدر احسانًا (اچھا سلوک) مہیا کر رہا ہے۔

❀ ... ﴿تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ﴾ (آل عمران : 61)

''آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلالیں تم اپنے بیٹوں کو بلالو، ہم اپنی عورتوں کو بلالیں تم اپنی عورتوں کو بلالو، ہم اپنے آپ کو (حاضر کریں) تم اپنے آپ کو (حاضر کرو)، پھر ہم مل کر بد دعا کریں۔''

یہاں فعل نَدْعُ (ہم بلالیں) میں بلانے کا فعل بیٹوں اور عورتوں کے لیے موزوں ہے، باہم معاملہ کرنے والوں کی ذات کے لیے مناسبت نہیں رکھتا۔ ان کے لیے مناسب فعل خود کو حاضر کرنا ہے۔ گویا نحضر انفسنا و تحضرون انفسکم مراد ہے لیکن اس کو حذف کر دیا تا کہ قاری اپنے فہم سے اس کو متعین کرے۔

❀ ... ﴿وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ (الحشر : 9)

''اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے تھے اور ایمان (استوار کیے ہوئے تھے) وہ دوست رکھتے ہیں ان کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں۔''

یہاں مدینہ کے انصار کی تعریف فرمائی ہے۔ آیت میں دار اور ایمان حرف عطف سے جمع ہیں لیکن تبوءوا (انھوں نے ٹھکانا بنایا) ایمان کے لیے موزوں لفظ نہیں۔ اس سے مناسبت رکھنے والا فعل قاری کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا ہے۔ مثلاً احکموا الایمان (ایمان کو محکم بنایا)۔

❀ ... ﴿وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَ عَلٰمٰتٍ ۭ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝﴾ (النحل : 15-16)

''اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمھیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں (جاری کر دی ہیں) اور راستے (نکال دیے ہیں) تا کہ تم راہ پاؤ اور دوسری علامتیں (بھی مقرر کر دی ہیں) اور ستاروں سے بھی وہ راہ معلوم کرتے ہیں۔''

یہاں صرف پہلے مفعول رواسی (پہاڑ) کا فعل القی (اس نے ڈال دیے) ظاہر کیا جب کہ باقی تمام مفعولوں انہار (نہریں)، سبل (راستے)، علامات کے متعلق فعل حذف کر دیے ہیں۔ مثلاً اجری انہارا و مھد سبلا و جعل للسبیل علمت (دریا جاری کیے اور راستے نکالے اور راستے کے لیے علامتیں مقرر کر دیں) ان کو قاری اپنے فہم سے متعین کر سکتا ہے۔ [1]

---

[1] عربی میں نہر ''دریا'' (River) کو کہا جاتا ہے جب کہ اُردو کے ''نہر'' (Canal) کے لیے عربی میں ''قناۃ'' یا ''تُرعہ'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مثلاً قَنَاۃُ السُّوَیْس (نہر سویز)، لہٰذا قرآن کے الفاظ ''نہر'' یا ''انہار'' کا موزوں ترجمہ ''دریا'' ہے جب کرۂ ارض کے انہار (دریا) مراد ہوں، البتہ جب جنت کی ''انہار'' کا ذکر ہو تو اس کا ترجمہ ''ندیاں'' کرنا مناسب ہوگا۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

معطوف علیہ کا حذف

دو جملوں کو حرفِ عطف کے ساتھ مربوط کرنے کا طریقہ نہ صرف عربی زبان میں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی معروف ہے۔ حرف عطف عربی میں واو ، فا ، بل ، ام اور ثم وغیرہ ہیں اور بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی نیا جملہ حرف عطف سے شروع ہوتا ہے تو اس صورت میں بالعموم اس جملہ کا عطف اوپر کے کسی مضمون پر ہوتا ہے۔ قرآن میں کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی جملے کے اندر حرف عطف موجود ہوتا ہے، اس کے بعد آنے والا جملہ، جو معطوف کہلاتا ہے، وہ بھی موجود ہوتا ہے لیکن حرف عطف سے پہلے آنے والا جملہ معطوف علیہ کہیں نظر نہیں آتا۔ معطوف علیہ کا حذف عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے جس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ حرف عطف کا وجود، درآنحالیکہ اس سے پہلے کوئی ایسا لفظ موجود نہ ہو جو اس کا معطوف علیہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس بات کا قرینہ ہوتا ہے کہ وہاں معطوف علیہ حذف ہے۔

معطوف علیہ کے حذف کے تین مواقع عام ہیں۔ ایک یہ کہ محذوف مضمون ایسا ہو کہ جس کی طرف قاری کا ذہن بآسانی منتقل ہو سکتا ہو اور یہ امکان نہ ہو کہ سیاق وسباق کی روشنی میں وہ کوئی غلط نتیجہ اخذ کر لے گا۔ دوسرا یہ کہ ایسا قرینہ موجود ہو جس کا تقاضا اس وقت تک پورا ہو ہی نہ سکتا ہو جب تک اس کی روشنی میں محذوف کو کھولا نہ جائے۔ تیسرا یہ کہ محذوف مضمون وسعت رکھتا ہو۔ اس صورت میں الفاظ سے اس کو محدود کرنے کے بجائے قاری کے ذہن کی جولانی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اس موقع پر وہ ساری بات خود اخذ کر لے جس پر سیاق وسباق دلیل بن سکتا ہو۔ اس تیسری صورت میں قرآن کا ایک طالب علم نظائر کی روشنی میں معطوف علیہ کو کھولے تو یہ زیادہ قابل اعتماد طریقہ ہوگا۔

اب ہم اس حذف کی کچھ مثالوں پر غور کرتے ہیں:

۱۔ حرف عطف واوٗ کے ساتھ حذف:

❀ ... ﴿هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا﴾ (یوسف : 65)

"یہ ہماری پونجی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ (اب ہم جائیں گے) اور اپنے اہل وعیال کے لیے رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔"

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قول ہے جو انہوں نے اپنے والد صاحب کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے کہا کہ وہ ان کے چھوٹے بھائی بن یمین کو مصر بھیجیں ورنہ حکومت غلہ دینے سے انکار کر دے گی۔ حرف عطف "وَ" کے بعد کے جملے مستقبل کی خبر دے رہے ہیں کہ ہم رسد لائیں گے اور بھائی کی حفاظت کریں گے۔ ان کا تقاضا یہ ہے

Marfat.com

کہ واؤ سے پہلے بھی مستقبل کا مفہوم رکھنے والا جملہ ہو تا کہ بات مکمل ہو سکے۔ ''اب ہم جائیں گے'' کے مضمون کا حامل کوئی جملہ یہ ضرورت پوری کر سکتا ہے، جیسا کہ آیت کے ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

❀ ... ﴿كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾

(الحج : 22)

''جب کبھی وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ (اس میں ذلیل ہو کر رہو) اور چکھو جلنے کا عذاب۔''

یہاں واؤ سے پہلے کا جملہ بعد کے جملے کا معطوف علیہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ذُوْقُوْا امر کا صیغہ ہے اور اس کا معطوف علیہ بھی امر ہونا چاہیے جو بات کی تکمیل کر سکے۔ مکذبین کے عذاب میں ڈالے جانے کا اسی طرح کا بیان سورہ مومنون آیت 108 میں بھی ہے۔ وہاں آیا ہے کہ جب وہ جہنم سے نکلنے کی فریاد کریں گے تو جواب دیا جائے گا: اخسئوا فیھا یعنی اسی میں ذلیل ہو کر پڑے رہو۔ اس نظیر کی روشنی میں زیر بحث آیت میں بھی یہی مضمون محذوف مانا جا سکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ﴾

(النحل : 14)

''اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں (تا کہ تم ان میں سفر کرو) اور تا کہ اس کے فضل کے طالب بنو۔''

یہاں لِتَبْتَغُوْا (تا کہ تم تلاش کرو) مضارع خفیف ❶ کی شکل میں ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ واؤ سے پہلے بھی اسی طرح کا مضارع خفیف محذوف مانا جائے جو فضل کی طلب کی طرح کے کسی فائدے کی نشان دہی کر سکے۔ یہ مقصد لِتُسَافِرُوْا (تا کہ تم سفر کرو) کو محذوف ماننے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چونکہ کشتی کا پانی کے سفر کے لیے استعمال ایک ایسا معاملہ ہے جس کی طرف ذہن فوراً منتقل ہو جاتا ہے اور قاری کے لیے اس کی تعیین میں غلطی کرنے کا امکان نہیں اس لیے اس لفظ کو حذف کر دیا جبکہ طلب رزق کے مقصد کو نمایاں کر دیا کیونکہ وہ سفر کا ایک ضمنی فائدہ ہے جس کی طرف از خود ذہن منتقل نہیں ہوتا۔

❀ ... ﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ (یوسف : 21)

''اس طرح ہم نے یوسف کے لیے ملک میں (اقتدار کے لیے) زمین ہموار کی (تا کہ ہم اس کو برگزیدہ کریں) اور تا کہ اس کو باتوں کی تعبیر بتائیں۔''

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر میں عزیز کی سرپرستی میں دینے کے موقع کا حوالہ ہے۔ اس کی دو مصلحتوں میں سے ایک واضح جبکہ دوسری محذوف کر دی ہے۔ اسی سورہ کی آیت 5 میں دوسری مصلحت یہ بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کو برگزیدہ کرے گا۔ اس قرینہ کی روشنی میں یہاں لِنَجْتَبِيَهٗ (تا کہ ہم اس کو برگزیدہ

❶ تبتغون (تم تلاش کرتے ہو) مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے، حرف ''لِ'' شروع میں لگنے کے باعث اس کی تخفیف ہوئی یعنی ''ن'' گرنے سے تَبْتَغُوْا رہ گیا جو مضارع خفیف ہے۔

Marfat.com

کریں) کو محذوف مانا جاسکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ﴾ (الانعام: 105)

''اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں (تاکہ وہ بات کو سمجھیں) اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا۔''

قرآن مجید ایک ہی حقیقت کو مختلف اسلوبوں سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کی گرفت میں آجائے اور وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس اسلوب بیان کو وہ تصریف آیات کا نام دیتا ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ سورۃ الانعام کی آیت 65 میں لعلهم يفقهون (تاکہ لوگ بات کو سمجھیں) کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ اس نظیر کی روشنی میں یہاں بھی یہی مفہوم مقدر مانا جاسکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝﴾

(الانعام: 75)

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے (تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے) اور تاکہ کاملین یقین میں سے بنے۔''

اس آیت میں دو جگہ محذوف ہیں۔ نری سے پہلے کنا (ہم تھے) فعل ناقص حذف ہے اور آگے لِيَكُوْنَ (تاکہ بن جائے) کا معطوف علیہ بھی حذف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کائنات کا جو مشاہدہ کرایا گیا اس کی روشنی میں سورج، چاند اور ستاروں کی مثالوں سے انہوں نے شرک کے خلاف قوم پر حجت قائم کی جس کی طرف آگے آیت 83 میں اشارہ بھی کر دیا ہے۔ اس قرینہ کی موجودگی میں یہی مضمون محذوف مانا جاسکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾

(البقرۃ: 259)

''اور اپنے گدھے کو دیکھو (ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمہیں (روزِ قیامت) اٹھائے جانے کا یقین ہو) اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کو دیکھو ہم ان کو کیسے جوڑتے ہیں۔''

یہاں تذکرہ ایک مرد صالح کا ہے جو اپنے گدھے پر سوار کسی بستی کے کھنڈروں پر سے گزرے تو خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ کیسے یہاں زندگی کی ہماہمی پیدا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تربیت کے لیے ان کو سو سال کے لیے موت دے دی۔ پھر زندہ کیا اور ان کے مرے ہوئے گدھے کو ان کے سامنے جوڑ کر اس کا ڈھانچا کھڑا کیا اور پھر اسے زندگی دی۔ خود ان کے اوپر جو واردات گزری اس کا لوگوں کے لیے نشانی بنانا ایک بعید فائدہ تھا جس کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وجہ سے اس فائدہ کو معطوف کی صورت میں واضح کر دیا۔ جب کہ مرنے کے بعد زندہ کیے جانے کے بارے میں جستجو کا اظہار تو خود مرد صالح کے قول میں ہو چکا تھا اس لیے ان کے ایمان بالبعث [1] کا فائدہ

[1] ایمان بالبعث: روزِ قیامت اُٹھائے جانے پر ایمان۔

Marfat.com

بالکل واضح اور قریبی تھا۔ چنانچہ اس کو بیان میں حذف کر دیا اور حرف ربط واؤ کو باقی رکھ کر اس کی طرف توجہ دلا دی۔
اس اسلوب کی مزید مثالیں سورہ آل عمران کی آیات 140، 154، 166، سورہ الانعام کی آیات 55، 92، سورۃ الانفال 17، سورہ مریم 21 میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ب۔ حرف عطف فا کے ساتھ حذف:

❀ ... ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾

(الانعام: 27)

''اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے پس کہیں گے کہ کاش ہم پھر واپس کیے جائیں (کہ مانیں) اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں......''

آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو جب جہنم رسید کیا جائے گا تو اس وقت وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ دنیا میں پھر واپس جانے کا موقع دیا جاتا تو ہم پہلی روش کے خلاف ان کی تصدیق کرتے اور تکذیب نہ کرتے۔ ''تکذیب نہ کرتے'' میں قرینہ موجود ہے کہ پہلا حصہ تصدیق کے مفہوم کا حامل ہونا چاہیے۔ تکذیب میں مضارع کا صیغہ خفیف اعراب کے ساتھ ہے،[1] لہٰذا معطوف علیہ بھی اس کا مماثل ہونا ضروری ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب اس پر ''فا'' داخل ہو یعنی فنو من (پھر ہم ایمان لائیں) یا فَنُصَدِّقُ (پھر ہم تصدیق کریں) کا لفظ محذوف ہوگا۔ چونکہ پہلا جملہ تمنا کا جملہ ہے جس سے شرط مضموم[2] ہوتی ہے اور ایسا جملہ جواب شرط کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس قرینہ کی موجودگی میں یہاں جواب شرط کو محذوف کر دیا تاکہ قاری خود ہی جملے کے خلا کو بھر لے۔ اس طرح کے جملوں میں جواب شرط پر ''فا'' داخل ہوتا ہے اور مضارع کو خفیف کر دیتا ہے۔ حذف کھولنے پر عبارت یوں ہوگی:

((يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ فَنُصَدِّقُ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا))

❀ ... ﴿فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ﴾ (الشعراء: 63)

''پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو (پس اس نے مارا) تو وہ پھٹ گیا۔''

یہاں جملے کے اندر ہی ایسا خلا موجود ہے جو محذوف مضمون کی نشان دہی کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو حکم ہوا اس کا بیان بھی موجود ہے اور اس حکم کی تعمیل کے نتیجہ کا بیان بھی موجود ہے۔ اس قرینہ کی روشنی میں فانفلق سے پہلے فَضَرَبَ (پس اس نے مارا) کا لفظ محذوف ہوگا جو تعمیل حکم کو ظاہر کرتا ہے۔

ج۔ حرف عطف ثم کے ساتھ حذف:

❀ ... ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ﴾

(البقرة: 243)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں

---

[1] مضارع کا صیغہ نکذبُ کے بجائے خفیف اعراب کے ساتھ نکذبَ آیا ہے۔ [2] مضموم: ضم کیا ہوا، شامل

Marfat.com

سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مر جاؤ (تو وہ مر گئے) پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا۔''

یہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کہ مر جاؤ اور پھر ان کے زندہ کیے جانے کے درمیان ایک خلا موجود ہے جو فماتوا (تو وہ مر گئے) سے بھرتا ہے۔ یہ لفظ ثم (پھر) سے پہلے معطوف علیہ مانا جا سکتا ہے۔

د۔ حرف عطف ام کے ساتھ حذف:

❀ ... ﴿وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴾ (النمل: 20)

''اور اس نے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو بولا کہ کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں! (کیا وہ موجود ہے) یا غیر حاضروں میں ہے؟''

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معائنہ افواج کا ذکر ہے۔ انہوں نے جب پرندوں کی فوج کا معائنہ کیا تو ہدہد کو غائب پایا۔ اس پر انہوں نے دریافت فرمایا کہ کیا ہدہد موجود ہے اور مجھے نظر نہیں آ رہا ہے یا غیر حاضر ہے۔ آیت میں پہلی بات حذف کر دی۔ یہ حرف عطف ام (یا) سے پہلے کا حصہ ہے جو موقع کلام سے خود ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔

❀...... سورہ الطّور میں آیت 30 کا آغاز حرف ام سے ہوا ہے جبکہ پچھلی آیت میں جملہ ایسا نہیں ہے جو معطوف علیہ ہو سکے۔ فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝﴾ (الطور: 29-30)

''پس تم یاددہانی کرتے رہو، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کوئی کاہن ہو اور نہ کوئی دیوانے۔ یا کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں۔''

غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں کفار کے اس قول کی تردید ہے جو وہ نبی ﷺ کو کاہن یا مجنون کہتے تھے۔ چونکہ تردید کے الفاظ ہی میں ان کا اعتراض نمایاں ہو رہا تھا اس لیے اس کو حذف کر دیا۔ اس کو کھولیے تو پوری بات یوں ہو گی:

''کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی کاہن ہے یا دیوانہ؟ پس تم یاددہانی کرتے رہو کیونکہ تم اپنے رب کے فضل سے نہ کوئی کاہن ہو نہ دیوانے۔ یا کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردش روزگار کے منتظر ہیں؟ لہٰذا تم ان سے کہہ دو کہ انجام کا انتظار کرو۔''

Marfat.com

مقابل کا حذف

کبھی جملے کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں دو باتوں کا ذکر ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں۔ اگر ان کو مخاطب پر پوری طرح کھول کر بیان کرنا درکار ہو تا کہ ان کا مفہوم اس پر اچھی طرح روشن ہو جائے تب تو دونوں باتوں کو ان کا کوئی حصہ حذف کیے بغیر بیان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بسا اوقات جب ایک حصے کے الفاظ دوسرے حصے کے مفہوم کی طرف خود ہی رہنمائی کر رہے ہوں تو دوسرے مفہوم کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر کلام کے حسن کا تقاضا ہوتا ہے کہ قاری کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اتنے الفاظ حذف کر دیئے جائیں جو پہلے حصے میں مذکور الفاظ کے مقابل میں از خود سمجھ میں آ رہے ہوں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب جن مواقع پر استعمال ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(ا) تکرار سے بچنے کے لیے جملے کے دوسرے حصے میں کوئی لفظ یا عبارت حذف کر دی جاتی ہے کیونکہ بعینہٖ وہی لفظ یا عبارت پہلے حصے میں استعمال ہو چکی ہوتی ہے۔ مثلاً:

❀ ... ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ﴾

(آل عمران: 30)

''جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہوگی اس کو بھی موجود پائے گی۔''

یہاں عبارت کے دوسرے حصہ میں لفظ ''سُوْٓءٍ'' کے بعد بھی ''مُّحْضَرًا'' آنا تھا لیکن اس کو حذف کر دیا تا کہ تکرار سے بچا جا سکے۔

❀ ... ﴿لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝٣٤﴾ (الاعراف: 34)

''نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ (ایک گھڑی) آگے بڑھ سکیں گے۔''

یہاں ساعت عذاب کا ذکر ہے جس کا وقت مقرر ہے۔ لفظ ساعۃ جملے کے دوسرے حصے میں حذف کر دیا۔

❀ ... ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝٣٩﴾ (الرعد: 39)

''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس چیز کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب کا علم اسی کے پاس ہے۔''

یہاں یثبت کے بعد ما یشاء کے الفاظ تکرار سے بچنے کے لیے حذف کر دیئے گئے ہیں۔

Marfat.com

❀ ... ﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾ (الرعد : 13)

''بجلی کی گرج (اس کے ڈر سے) اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے (اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں)۔''

اس آیت کے دونوں حصوں میں مقابل الفاظ حذف ہیں۔ جو لفظ پہلے حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے بِحَمْدِهٖ وہ دوسرے حصہ میں حذف ہے اور جو دوسرے حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے مِنْ خِيْفَتِهٖ وہ پہلے حصہ میں حذف ہے۔ اگر محذوف الفاظ بیان کر دیئے جاتے تو دوہرے تکرار کے باعث عبارت بہت بوجھل ہو جاتی۔

(ب) بعض جملوں کے دونوں حصوں کو کھول کر بیان کرنے میں اگرچہ تکرار کا عیب تو پیدا نہیں ہوتا لیکن ان کی ساخت میں ایسی مماثلت ہوتی ہے کہ ایک حصے میں ظاہر کردہ الفاظ خود بخود دوسرے حصے کے مفہوم پر روشنی ڈال رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر دوسرے حصے میں متعلقہ الفاظ حذف بھی کر دیئے جائیں تو قاری کو محذوف مفہوم کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں ایسے جملوں میں اگر زیر بحث مضمون کا تقاضا ہوا ہے تو مقابل کو حذف نہیں کیا گیا لیکن بالعموم حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ فصاحت کلام کا تقاضا یہی تھا۔ مثالیں دیکھیے:

❀ ... ﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ﴾ (الانعام : 99)

''اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو (جب وہ پکتا ہے)۔''

یہاں اِذَآ اَثْمَرَ کے مقابل يَنْعِ سے متعلق جملہ اِذَآ اَيْنَعَ حذف کر دیا گیا کیونکہ جملے کی ساخت ہی سے مفہوم کی طرف راہنمائی ہو رہی تھی۔

❀ ... ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (ابراھیم : 48)

''اس دن کو یاد رکھو جس دن یہ زمین دوسری زمین سے اور یہ آسمان (دوسرے آسمانوں سے) بدل دیئے جائیں گے۔''

یہاں غَيْرَ الْاَرْضِ کے مقابل غَيْرَ السَّمٰوٰتِ کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ جملے کی ساخت خود ہی ان کی ضرورت کی نشان دہی کر رہی ہے۔

❀ ... ﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (الانعام : 25)

''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے (کہ اس کو نہ سن سکیں)۔''

یہاں جملے کے دونوں حصوں میں مماثلت کا تقاضا یہ ہے کہ اَنْ يَّسْمَعُوْهُ کے الفاظ حذف مانے جائیں۔ اس کی دلیل سورہ لقمان میں ہے۔ وہاں فرمایا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا﴾ (لقمان : 7)

Marfat.com

''اور جب اس کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض کرتا ہے گویا اس کو سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کانوں میں گرانی ہے۔''

❀ ... ﴿قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ﴾

(الاحزاب: 17)

''پوچھو: کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے گا اگر وہ تم کو کوئی گزند پہنچانا چاہے یا (اس کی رحمت کو روک سکے گا اگر) وہ تم پر رحمت کرنا چاہے۔''

یہاں بھی جملے کے دو حصوں میں مماثلت خود محذوف الفاظ (یُمْسِكَ رَحْمَتِهٖ اِنْ) کی نشان دہی کر رہی ہے۔ ان الفاظ کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے۔ فرمایا:

❀ ... ﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ﴾ (فاطر: 2)

''اللہ لوگوں کے لیے جس رحمت کا دروازہ کھولے تو اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔''

❀ ... ﴿قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ﴾ (الانعام: 135)

''کہہ دو: اے میرے ہم قوموا! تم اپنے طریقے پر چلو میں (اپنے طریقے پر) چلتا ہوں۔''

گویا ''عَلٰی مَكَانَتِیْ'' کے الفاظ آخر میں محذوف ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جملے کے دو مماثل حصوں میں دونوں جانب کچھ الفاظ حذف کر دیئے جاتے ہیں، اس طرح کہ ہر محذوف لفظ کا مقابل دوسرے حصے میں ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ اس دوہرے حذف کی مثالیں دیکھیے:

❀ ... ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ﴾ (یونس: 67)

''وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے (تاریک) بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو تمہارے لیے روشن بنایا (تاکہ تم اس میں کسب معاش کر سکو)۔''

یہاں دوسرے حصے میں دن کو ''مُبْصِرًا'' یعنی روشن کہہ کر پہلے حصے میں رات کی تاریکی کی طرف اور پہلے حصے میں رات کا فائدہ سکون بتا کر دوسرے حصہ میں دن کی جدوجہد کی طرف توجہ دلا دی۔ جملے کی ساخت ایسی ہے کہ ایک ذہین قاری خود بخود محذوف مضمون تک پہنچ جاتا ہے مثلاً حذف کھولنے کے بعد عبارت یوں ہوگی: هو الذی جعل لكم الیل مظلما لتسكنوا فیه و النهار مبصرا لتبتغوا فیه.

❀ ... ﴿وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾﴾ (النبأ: 10-11)

''کیا ہم نے رات کو تمہارے لیے پردہ (اور وقت سکون) اور دن کو (روشن اور) وقت معاش نہیں بنایا؟''

یہ حقیقت میں مذکورہ بالا آیت ہی کا مضمون دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ مقابل الفاظ محذوف مضمون پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

Marfat.com

❀ ... ﴿وَ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ نُّعۡجِزَ اللّٰهَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَنۡ نُّعۡجِزَهٗ هَرَبًا ۝۱۲﴾ (الجن: 12)

''اور یہ کہ ہم مان گئے کہ ہم اللہ کے قابو سے نہیں نکل سکتے، نہ زمین میں (چھپ کر) اور نہ (آسمانوں میں) کہیں بھاگ کر۔''

یہاں بھی مذکور الفاظ غیر مذکور الفاظ کے حذف پر دلیل ہیں۔

❀ ... ﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ ۝۲۴﴾ (ابراهيم: 24)

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کلمہ توحید کی تمثیل کس طرح بیان فرمائی۔ وہ ایک مثمر ❶ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ (زمین میں) جمی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں (پھیلی ہوئی ہیں)۔''

جملے کے دونوں حصوں میں مذکور الفاظ مقابل حصوں کے غیر مذکور الفاظ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

❀ ... ﴿قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِیۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ اُخۡرٰی كَافِرَةٌ﴾ (آل عمران: 13)

''جن دو گروہوں میں مڈ بھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمہارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ (جو مومن تھا)، اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا (جو طاغوت کی راہ میں لڑ رہا تھا)۔''

گویا فِئَةٌ کے بعد مُؤْمِنَةٌ اور كَافِرَةٌ کے بعد تُقَاتِلُ فِیْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ حذف ہیں۔ طاغوت کا لفظ غیر اللہ کے لیے معروف ہے۔ مقابل و متضاد مضمون کسی ایسے ہی لفظ کا متقاضی ہے۔

❀ ... ﴿وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ ؕ﴾

(الانعام: 38)

''اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر (اپنے پاؤں سے چلتا ہو) اور کوئی پرندہ نہیں جو (فضا میں) اپنے دونوں پروں سے اڑتا ہو، مگر یہ سب تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔''

(ج) کبھی جملے کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ مقابل حصے میں جب تک محذوف کو معین نہ کیا جائے، الفاظ کی مناسبت برقرار نہیں رہتی۔ یہی بات محذوف کی ضرورت کی نشان دہی کرتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۱۳﴾ (الانعام: 13)

''اس کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی اور جو دن میں (متحرک ہوتی) ہے اور وہ سمیع و علیم ہے۔''

رات کے ساتھ سکون کی اور دن کے ساتھ حرکت و جدوجہد کی مناسبت ہے جس پر قرآن مجید کی متعدد آیات شاہد ہیں۔ اس آیت میں نَهَارِ (دن) سے متعلق موزوں لفظ کو حذف کر دیا تا کہ ذہین قاری خود ہی اس کو معین

❶ مُثْمِر: ثمر دار، پھل لانے والا

Marfat.com

کرے۔ اس کو معین نہ کیا جائے تو جو مضمون پیدا ہوتا ہے وہ قرآن کے نظائر کے خلاف ہے۔ ہم نے مَا سَکَنَ کے بالمقابل الفاظ مَا تَحَرَّكَ کو محذوف مانا ہے۔

❀ ... ﴿وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی ۙ۬ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰی ﴿۷۷﴾﴾ (طٰهٰ: 77)

''ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی تھی کہ میرے بندوں کو شب میں لے کر نکل جاؤ پھر ان کے لیے دریا میں ایک خشک راستہ بناؤ۔ نہ تمہیں پا لیے جانے کا اندیشہ ہوگا نہ (ڈوبنے کا) ڈر ہوگا۔''

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔ ان کو حکم ہوا کہ راتوں رات شہر سے نکل جاؤ، پھر جب دریا کے ساحل پر پہنچو تو اس پر عصا مارنا جس سے خشک راستہ بن جائے گا۔ اس تدبیر سے نہ یہ خطرہ ہوگا کہ فرعونی تعاقب کر کے تمہیں خشکی پر گرفتار کر لیں اور نہ یہ ڈر ہوگا کہ پانی میں ڈوب جاؤ۔ مضمون کی مناسبت کا تقاضا یہ ہے کہ ''لَا تَخْشٰی'' کے بعد ''غرقا'' کو محذوف مانا جائے۔

❀ ... ﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

(النحل: 112)

''اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو بالکل امن و اطمینان کی حالت میں تھی، ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا لیکن انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کے کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس (پہنایا)۔''

اس آیت میں اَذَاقَهَا کے ساتھ لِبَاسَ کی مناسبت نہیں ہے، لباس پہنایا جاتا ہے چکھایا نہیں جاتا۔ علیٰ ہذا القیاس بھوک کا لباس نہیں ہوتا بلکہ بھوک کا مزا ہوتا ہے۔ اس عدم مناسبت کا تقاضا ہے کہ اَلْبَسَهَا (انھیں پہنایا) کو حذف مانا جائے۔ گویا آخری حصے میں آیت کے مفہوم کو مستقیم کرنے کے لیے عبارت یوں ہوگی: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعْمَ الْجُوْعِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ (پھر اللہ نے انھیں بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنایا۔)

(د) کبھی کسی لفظ کو اس لیے محذوف کر دیا جاتا ہے کہ کلام میں آگے پیچھے اس کی وضاحت موجود ہوتی ہے۔ اگر وقتی طور پر قاری کو اشتباہ پیش آ جائے تو سلسلہ کلام خود اس کے شبہ کو رفع کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حسب ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (الانفال: 65)

''اگر تمہارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو (کافروں) پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے ایک سو (ثابت قدم آدمی) ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔''

Marfat.com

آیت کے ابتدائی حصے میں دوسو کی وضاحت موجود نہیں۔ دوسرے حصے کے بالکل آخر میں کافروں کا حوالہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسو کافر مراد ہیں۔ اسی طرح چونکہ پہلے مومنین کی صفت کے طور پر ثابت قدمی کا حوالہ آ چکا تھا آخر میں اس کو بیان نہیں کیا۔ سلسلہ کلام اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

❀ ... ﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ (الحدید : 10)

''تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے انفاق اور جہاد کریں گے (اور جو فتح مکہ کے بعد انفاق و جہاد کریں گے) وہ یکساں نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہوگا جو فتح مکہ کے بعد انفاق اور جہاد کریں گے، اگرچہ اللہ کا وعدہ ان میں سے ہر ایک سے اچھا ہی ہے۔''

یہاں ''لَا یَسْتَوِی'' کا تقاضا یہ ہے کہ آگے دو قسم کے لوگوں کا بیان ہو لیکن ایک صفت کے حامل لوگوں کا ذکر کر کے ان کی خصوصیت واضح کر دی جبکہ دوسری صفت کے حامل لوگوں کا ذکر حذف کر دیا کیونکہ آگے ان کی خصوصیت مذکور ہو رہی تھی۔

❀ ... ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا یُعِیْدُ ۝۴۹﴾ (سبا : 49)

''کہہ دو حق آ گیا (اور باطل نابود ہو گیا) اور باطل نہ آغاز کرتا ہے نہ اعادہ۔''

یہاں بھی آگے باطل کا ذکر آ رہا تھا اس لیے قاری کا ذہن خود ہی ''جَآءَ الْحَقُّ'' کے بعد کے خلا کو بھر لیتا ہے (یعنی زَهَقَ الْبَاطِلُ)، نیز قرآن میں اس مقدر مضمون کی نظیر بھی موجود ہے۔ (دیکھیے سورۃ بنی اسرائیل، آیت 81)

❀ ... ﴿وَ اِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝۳۲﴾ (لقمان : 32)

''اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے۔ پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف کر دیتا ہے تو ان میں کچھ راہ پر رہتے ہیں (اور باقی منکر ہو جاتے ہیں) اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کرتے ہیں جو بالکل بدعہد اور ناشکرے ہوتے ہیں۔''

''مُقْتَصِدٌ'' یعنی راہ پر رہنے والوں کے مقابل گروہ (کَافِرٌ) کی وضاحت چونکہ آگے آیات کے انکار کے حوالے سے آ رہی تھی اس لیے بیچ میں ان کا ذکر حذف کر دیا۔

Marfat.com

اجمال کے بعد تفصیل

قرآن مجید نے اپنی ایک خصوصیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

﴿ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴾ (ہود: 1)

''یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔''

اس کا بدیہی مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول ہوا تو ابتدا میں اس کی تعلیمات مختصر، گٹھے ہوئے اور جامع جملوں کی شکل میں نازل ہوئیں، پھر وہ بتدریج واضح تر اور مفصل ہوتی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تمام معاملات سے مکمل طور پر باخبر ہونے کا تقاضا یہی تھا کہ وہ پہلے حکمت سے مملو [1] آیات میں اپنا پیغام اتارتا اور اس کے بعد اس حکمت کے تقاضے تفصیل کے ساتھ سامنے لاتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک بیج سے تنا پیدا ہوتا ہے تو وہ توانا ہو کر برگ و بار لانا شروع کرتا ہے۔ حکمت بھری عبارت میں کلیات اور بنیادی باتیں ہوتی ہیں جو نہایت عمیق ہونے کے باعث غور و تدبر چاہتی ہیں۔ ایک عام آدمی بھی ان سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کیونکہ یہ کلمات بہ آسانی زبان زدِ عوام ہو جاتے ہیں، یوں بھی فطرت انسانی میں ان کی نمود ہوتی ہے لہٰذا لوگ ان کو تیزی سے قبول کرتے ہیں۔ البتہ ان کے تقاضے ازخود لوگوں کی گرفت میں نہیں آتے، اس لیے ان کا شعور جلد بیدار نہیں ہوتا۔ یوں بھی عوام کے بہت سے تحفظات ہوتے ہیں جو ان تقاضوں کی طرف بڑھنے میں مانع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات کا مجمل تصور ہر انسان کے ذہن میں ہے لیکن اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضوں کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے دفتر لکھے جا چکے ہیں لیکن لوگوں کے ذہنوں میں ان کو داخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ آخری پاروں کی بیشتر سورتیں شروع میں نازل ہوئیں جو نہایت مختصر بھی ہیں اور گٹھے ہوئے جملوں پر مشتمل بھی۔ یہ کلام بدیہی طور پر خوبصورت اور یاد رکھنے کے لیے سہل ہے۔ البتہ تعلیم اس میں بنیادی حقائق واخلاق کی ہے۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان مضامین کو کھولا گیا اور بڑی سورتوں میں ان بنیادی حقائق کو زیر بحث لا کر ان کی تفصیل کی گئی، نیز ان کے تقاضے بیان کیے گئے۔ پھر مدنی دور میں یہی بنیادی باتیں ایک جامع اور ہمہ گیر نظام کی شکل میں نمایاں ہوئیں۔ تب معلوم ہوا کہ اس بیج سے کس طرح کا ثمر آور درخت پیدا ہوا اور اس کے برگ و بار کون کون سی برکات کا مخزن ثابت ہوئے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تو قرآن مجید کی مجموعی ہیئت سے تعلق رکھتا ہے اور یہ سورہ ہود کی آیت کا بدیہی تقاضا

---

[1] مملو: بھرا ہوا، املاء (بھرنا) سے اسم مفعول

Marfat.com

ہے۔لیکن قرآن مجید کی یہی خصوصیت اس کے اسلوب بیان میں بھی نمایاں ہوتی ہے کہ پہلے کوئی لفظ، کوئی حقیقت، کوئی واقعہ، کوئی پیغام مجمل طریقہ سے آتا ہے، اس کے بعد وضاحت کر کے اس کو کھولا جاتا ہے تا کہ ان میں سے ہر چیز کی وضاحت بھی ہو جائے اور کوئی بات مبہم نہ رہے۔اس اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(ا) الفاظ کی تفصیل:

1۔ سورۃ بقرہ کے شروع ہی میں قرآن مجید کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ اس کے ایک آسمانی کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے) اب لفظ متقی میں اجمال ہے۔خدا ترس آدمی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن قرآن نے اس اجمال کی تفصیل یوں کر دی:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (البقرة: 3-4)

''ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔''

اس تفصیل سے خود بخود قرآن سے فائدہ اٹھانے اور ہدایت پانے والوں کی صفات و اوصاف کی وضاحت ہو گئی اور یہ معلوم ہو گیا کہ معاشرہ کے جو طبقات ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں، مثلاً یہود، تو وہ اس صحیفۂ آسمانی سے ہدایت نہیں پا سکتے۔اس تفصیل سے ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی ہو گیا جو اس زمانہ میں متقی کہلانے کے اصل مصداق تھے یعنی صحابہ کرام کی جماعت۔

2۔ سورۂ مومنون کی پہلی آیت ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (کامیاب ہو گئے اہل ایمان)۔اگرچہ یہ جملہ اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس کا لفظ ''مومنون'' مجمل ہے جس کی وضاحت آگے آٹھ آیات میں کی گئی ہے۔ان میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو نمازوں میں عاجزی کرتے، لغو باتوں سے احتراز کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، عفت و پاکیزگی کی زندگی گزارتے اور امانتوں، وعدوں اور معاہدوں کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ ایمان کے تقاضوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ ایمان لانے میں محض زبانی اقرار و دعویٰ کافی نہیں بلکہ اس ایمان کے کچھ لوازم بھی ہیں جو عملی اظہار چاہتے ہیں۔ان کے پورا کیے بغیر دعوائے ایمان کا ثبوت میسر نہیں آتا۔

3۔ سورہ رعد میں نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم قرآن کی شکل میں جو دعوت پیش کر رہے ہو بعض لوگ اس کو قبول کریں گے اور دوسرے اس کی طرف سے دل کی آنکھیں بند کیے رکھیں گے۔اول الذکر لوگ وہ ہیں جو صحیح عقل رکھنے والے ہیں، وہ اس کو اپنی فطرت کی آواز قرار دے کر اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ (الرعد: 19)

Marfat.com

''یاد دہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔''

اس اجمال سے ان اہل عقل کی صحیح نشان دہی نہیں ہوتی جن کو قرآن نے مراد لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی دنیوی اعتبار سے ہر کامیاب انسان کو عقل مند ہی سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس اجمال کی وضاحت یوں فرمائی:

﴿الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝﴾

(الرعد: 20-22)

''وہ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں۔ اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور سخت عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنہوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا، اور جو بدی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ انجام کار کی کامیابی انہی کے لیے ہے۔''

یہاں نہ صرف اہل عقل کی صفات کی تفصیل ہے بلکہ معاشرے میں موجود ان لوگوں کی طرف انگلی بھی اٹھا دی ہے جو اہل عقل ہونے کے اصل مصداق ہیں اور جو قرآن سے ایک بیدار مغز آدمی کی طرح استفادہ کر رہے ہیں۔

4۔ سورۂ ہمزہ میں ہے:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝﴾

(الهمزة: 1-3)

''ہلاکی ہو ہر اشارہ باز عیب جُو کے لیے، جس نے مال سمیٹا اور اس کو گنتا رہا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو زندہ جاوید رکھے گا۔''

یہاں اشارہ باز عیب جُو کہنے میں اجمال ہے جس کے باعث اس کردار کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی لیکن اگلی دو آیات میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد نہایت حریص و بخیل آدمی ہے جو محبت مال میں جنون کی حد تک مبتلا ہے۔ وہ اپنے پیسے گن گن کر سنبھالتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر غریبوں کو کچھ دیتے دلاتے ہیں تو وہ اشاروں سے اور زبان سے ان کا مذاق اڑاتا، ان کی تحقیر اور حوصلہ شکنی کرتا ہے تاکہ ان کی اس نیکی کے باعث اس کے طمع مال اور بخل پر لوگ اس سے بدظن نہ ہو جائیں۔ پھر یہ شخص مال سمیٹنے اور اس کو سینت سینت کر رکھنے میں جس انہماک کا مظاہرہ کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مال ہی میں اپنی زندگی پاتا اور اسی کے بل پر زندہ جاوید رہنا چاہتا ہے۔ گویا اجمال کی اس تفصیل میں ایک کردار کو مصور کر کے پیش کر دیا ہے کہ لوگ بہ آسانی پہچان لیں کہ یہ جامہ کس کس کے قد و قامت پر فٹ آتا ہے۔

Marfat.com

(ب) اصولی حقیقت کی تفصیل:

1۔ سورہ بقرہ کی آیت 257، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ....الخ میں یہ اصولی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا کفر ہوتا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں اور وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ اس اجمال کی وضاحت آگے آیات 258 تا 260 میں کی ہے جس میں تین واقعات پیش کیے ہیں۔ پہلا واقعہ ایک متکبر بادشاہ کا ہے جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر بحث کی اور جب انہوں نے مسکت دلائل دے کر اپنا موقف بادشاہ پر واضح کر دیا تو کفر کی عصبیت نے غلبہ پا کر بادشاہ کے گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنے کی راہ مسدود کر دی۔ دوسرا واقعہ ایک صاحب ایمان شخص کے متعلق ہے جس کا گزر ایک بستی کے کھنڈروں پر ہوا۔ وہ اس الجھن میں گرفتار ہو گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس تباہ شدہ بستی کو بھی نئی زندگی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اس الجھن سے نکالنے کے لیے موت کے بعد زندگی کے ممکن ہونے کا مشاہدہ خصوصی اہتمام سے کرایا۔ جب اس صاحب ایمان بندے پر حقیقت واضح ہو گئی تو وہ پکار اٹھا کہ میں مان گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ تیسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہے۔ انہوں نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ اپنی غیر معمولی قدرت سے ان کو موت کے بعد حیات کے ممکن ہونے کا مشاہدہ کروا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دستگیری فرمائی اور خود انہی کے ہاتھوں ذبح ہونے والے پرندے زندہ ہو کر ان کے پاس واپس پہنچ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان و یقین کی روشنی اور شرح صدر کی طمانیت عطا[1] فرمائی۔

وہ اصولی حقیقت، جو اجمال کے ساتھ بیان ہوئی تھی، تفصیل کے بعد مثالوں کی روشنی میں واضح ہو کر سامنے آ گئی۔

2۔ سورۃ الحجر میں فرمایا:

﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ ﴾

(الحجر: 49-50)

''میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا ہی دردناک ہے۔''

لوگوں میں یہ کمزوری عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں اپنا من پسند پہلو چن لیتے ہیں اور دوسرے پہلو واضح بھی ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے معاملہ میں بھی وہ اسی کمزوری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی زبان سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، وہ قیامت میں ہم سب کو

[1] طمانیت: اطمینان

Marfat.com

بخش دے گا۔ یہ تصور اس کے باوجود ہے کہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بے حد عدل کرنے والا اور اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے۔ وہ مومن و کافر کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرے گا۔ قریش کو یہ غلط فہمی تھی کہ ان کو اگر اللہ تعالیٰ پیغمبر کی تکذیب کے جرم کے باوجود نہیں پکڑ رہا ہے تو یہ ان کے عند اللہ محبوب ہونے کی علامت ہے۔ یا پھر پیغمبر کا دعویٰ محض افتراء ہے، اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور کو درست کیا ہے کہ نیک و بد، مومن و کافر کے ساتھ اس کا معاملہ الگ الگ ہوگا۔ اگر وہ پکڑ نہیں رہا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ڈھیل دے رہا ہے۔ جب وہ پکڑنے پر آئے گا تو دیکھو گے کہ اس کی سزا کتنی دردناک ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کی یاد دہانی کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کی زندگی کے واقعات کی روشنی میں، جو آیت 77 تک پھیلے ہوئے ہیں، یہ دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کس طرح رحمت کا معاملہ کیا اور اس کے مقابل میں قوم لوط کو کس طرح عذاب کی ذلت میں مبتلا کیا۔

3۔ سورۃ الانعام میں آتا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝﴾

(الانعام: 74-75)

''اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ (اپنی قوم پر حجت قائم کرے) اور کاملین یقین میں سے بنے۔''

یہ حوالہ اس بات کا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو کس طرح ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان اور زمین کے نظام پر برابر غور کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے اسرار و حقائق کھولے جن کی مدد سے وہ آفاق سے دلائل اخذ کرتے اور ان کی مدد سے اپنی قوم کے دلائل کا مقابلہ کرتے۔ اس اجمالی حوالہ کے بعد تفصیل سے وہ طریق کار واضح فرمایا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے درجہ بدرجہ ستاروں، چاند اور سورج ہر چیز کے بارے میں قوم کو بتایا کہ یہ ملکوت الٰہی کے تابع اور اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ ان کا نمایاں ہونا بالکل عارضی ہے۔ عبادت کا حقیقی مستحق وہ ہے جو ان سب چیزوں کا خالق و آقا اور اس پوری کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے۔ یہ تفصیل آیت 83 تک پھیلی ہوئی ہے۔

4۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ۗ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝﴾

(المائدۃ: 109)

Marfat.com

''اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔''

اس آیت میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کی بابت سوال کرے گا جو میثاق الٰہی کے حوالہ سے ہر نبی اور اس کی امت پر عائد ہوتی ہے۔ وہ انبیاء سے پوچھے گا کہ انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو حق کی کیا تعلیم دی تھی اور ان کی امتوں کا رویہ اس بارے میں کیا تھا۔ وہ معذرت کریں گے کہ ہمیں ان کے معاملات کا علم نہیں۔ تو خود ہی تمام غیب کا جاننے والا ہے۔ اس مجمل بیان کے بعد اس شہادت کی نوعیت کے بارے میں تفصیل بیان کی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت اور ان سے سوال و جواب کا ذکر وضاحت سے کر دیا ہے تاکہ اس شہادت پر دوسرے تمام انبیاء کی شہادت کا قیاس کر لیا جائے۔

(ج) واقعہ کی تفصیل:

اس اسلوب کا استعمال واقعات کے بیان میں بھی ہوا ہے۔ ایک واقعہ کا ابتدا میں خلاصہ بیان کر کے بعد کو اس کو تفصیل سے سنایا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

1۔ سورہ طٰہٰ میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۠﴾ (طٰہٰ: 115)

''اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔''

اس آیت میں حوالہ اس عہد کا ہے جو آدم کو جنت میں مقیم کرتے وقت ہر نعمت سے فائدہ اٹھانے لیکن ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے احتراز کرنے کے بارے میں لیا گیا تھا۔ آدم اس کو ملحوظ نہ رکھ سکے جس کے نتیجہ میں وہ شیطان کے فریب میں آ گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور عزم کی کمی کے باعث وہ شیطان کے کید [1] کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس اجمال کی تفصیل آگے کی آیات 116-123 میں کی گئی ہے۔ اس میں عہد کی تفصیل، ابلیس کی چال اور آدم کے اس کے نرغہ میں آ جانے کا مفصل بیان ہے۔

2۔ مکہ میں نبی ﷺ کی دعوت کے آخری مرحلہ میں یہود بھی قریش کی پشت پناہی کے لیے آ دھمکے تھے۔ وہ چونکہ اہل کتاب تھے لہٰذا وہ اپنی کتابوں، اپنے معتقدات اور اپنی تاریخ کے حوالہ سے سوالات قریش کو سکھایا کرتے اور وہ ان کو نبی ﷺ کے آگے پیش کرتے کہ اگر وہ ان کا جواب نہیں دے پائیں گے تو تالی پیٹ دیں گے کہ دیکھو، یہ شخص خدا سے علم حاصل کرنے کا دعویدار ہے لیکن پچھلی آسمانی کتابوں کے حوالہ سے فلاں

---

[1] کید: چال، فریب

Marfat.com

سوال کا جواب نہ دے سکا۔ اسی طرح کا ایک سوال اہل کتاب نے اصحاب کہف کے متعلق کیا تو اس کے جواب میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝١٢﴾

(الکهف: 9-12)

''کیا تم نے کہف ورقیم 1 والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا، جب کہ کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمارے اس معاملہ میں ہمارے لیے راہنمائی کا سامان فرما، تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر کئی برس کے لیے تھپک دیا۔ پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدت قیام کو زیادہ صحیح شمار میں رکھنے والا نکلتا ہے۔''

اہل کتاب کے القاء 2 کیے ہوئے سوال کے جواب میں یہ مجمل بیان کافی تھا لیکن اللہ رب العزت نے آگے اس کی تفصیل کر دی جو آیت 26 تک جاتی ہے۔ اس کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: نحن نقص علیك نباهم بالحق (ہم تمہیں ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک اور مقصد کے ساتھ سناتے ہیں)۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کا سوال تو محض شرارت کے لیے تھا یا اس سے کوئی خاص فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن جب اصحاب کہف کا تذکرہ ہو ہی گیا ہے تو اس واقعہ میں جو سبق پنہاں ہے اس سمیت ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اصحاب کہف کیسے نوجوانوں پر مشتمل جماعت تھی، ان کا مقصد زندگی کیا تھا؟ انہوں نے حق کے لیے کتنی آزمائشیں جھیلیں؟ کیسے غار میں پناہ لی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت وحمایت میں کون کون سی شانیں دکھائیں؟ اور بالآخر کیسے ان کو کامیاب وسرفراز فرمایا؟ سو ان سوال کرنے والوں کو ان کے مناظروں میں الجھا رہنے دو اور اصل واقعہ کی روشنی میں اصحاب کہف جیسا طرز عمل اپناؤ۔

دعوت کے اس دور میں چونکہ مسلمان نوجوان بھی بڑی آزمائشوں سے گزر رہے تھے لہٰذا یہ واقعہ ان کے لیے تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ بنا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ نے عارضی پناہ گاہ کے طور پر غار ثور کا جو انتخاب فرمایا تو اس کے لیے یہ واقعہ ہی مشعل راہ بنا ہو۔

3۔ سورہ قصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت نہایت تفصیل سے سنائی گئی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوا ہے:

﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝٤ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝٥ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَ نُرِىَ فِرْعَوْنَ وَ

1 کہف ورقیم: غار اور کتبہ 2 القاء کرنا: ڈالنا، دل میں ڈالنا

Marfat.com

هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾ (القصص: 4-6)

''فرعون سرزمین مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے، اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون، ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔''

یہ اصل سرگزشت کا ایک تصور تمہید کے طور پر دے دیا ہے تاکہ وہ غایت و مقصد سامنے آ جائے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے اور قاری سرگزشت سنتے ہوئے اس طرح کھو نہ جائے کہ اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ اس کے بعد سرگزشت کی تفصیل آیت 46 تک بیان ہوتی ہے۔ اس میں یہ دکھایا کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کے قتل کی حکومتی اسکیم کے نفاذ کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے باوجود کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی، اور حفاظت ہی نہیں کی بلکہ ان کو دشمن ہی کے محل میں پرورش پانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کن کن طریقوں سے اس مقصد کے لیے راہ ہموار کی جو اوپر سورۃ القصص کی آیات 4-6 میں بیان ہوا ہے۔ اس سرگزشت میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کے لیے یہ سبق مضمر تھا کہ اللہ تعالیٰ اب بھی وہی شانیں دکھا کر ان کو محفوظ و مصئون [1] رکھے گا اور آپ کے مخالفین، جو بالکل فرعون ہی کا کردار اپنائے ہوئے ہیں، اپنے برے انجام کو پہنچیں گے اور وراثت ابراہیمی انہی دبائے ہوئے مسلمانوں کو عطا ہو گی اور یہ ملک میں اقتدار حاصل کریں گے۔

(د) پیغام کی تفصیل:

ہر شخص جانتا ہے کہ سورہ البقرۃ میں یہود سے مفصل خطاب ہے۔ اس کا آغاز آیت 40 سے ہوا ہے اور تقریباً ایک سو آیات اس کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ اس میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا حوالہ ہے، ان کے ساتھ جو وعدے وعید ہوئے ان کا تذکرہ ہے، ان کی تاریخ کے متعدد واقعات کے حوالے سے اور کئی حقائق کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ اس تمام بحث کا مقصد ان کو ان کے فرائض یاد دلانا اور دین حق پر ایمان لا کر اپنی تاریخی ذمہ داری کو پورا کرنے کی دعوت ہے۔ یہ بحث شروع ہوتی ہے تو ابتدا میں دعوتی رنگ میں ان سے یوں خطاب فرمایا ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ

[1] مصئون: بچایا ہوا، حفاظت سے رکھا ہوا۔

Marfat.com

إِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ أَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

(البقرۃ: 40۔ 46)

''اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی، اور میرے عہد کو پورا کرو تو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا، اور مجھی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے، تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو۔ اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچتے ہی رہو اور حق و باطل کو گڈمڈ نہ کرو، اور حق کو چھپاؤ مت درآں حالیکہ تم جانتے ہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا تم لوگوں کو تو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے، اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں، جو گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

اس اقتباس میں بعض باتیں تو اس پیغام سے متعلق ہیں جو دیا جا رہا ہے اور بعض باتیں موعظت و نصیحت، ابھارنے اور شوق دلانے کے لیے ہیں اور بعض چیزوں کی نوعیت ان تدابیر کی ہے جو اس پیغام پر عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے والی چیزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار ہیں۔ پیغام جن باتوں کا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

- بنی اسرائیل پر انعام کے تقاضے پورے کرنا۔
- خدا سے انہوں نے جو عہد کیا تھا اس کو پورا کرنا۔
- قرآن پر ایمان لانا، جبکہ یہود کا موقف یہ تھا کہ وہ تو پہلے سے صاحب ایمان ہیں۔
- حق اور باطل کو گڈمڈ کر کے حقیقی واقعات کی صورت نہ بگاڑنا۔

آیت 47 سے آگے پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی بنیادی ہدایت کے نکات کو لے کر ہر ایک کے بارے میں مدلل بحث کی گئی ہے اور اگر اس بارے میں یہود کا کوئی موقف سامنے آیا ہے تو اس کے بخیے ادھیڑے ہیں۔ مثلاً:

1۔ انعام کی تفصیل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت کی زندگی سے نکالا اور تمہارے دشمن فرعون کو غرق کر دیا۔ تم سے بچھڑے کی پوجا کا گناہ سرزد ہوا تو احساس ہو جانے پر معافی دے دی گئی۔ خدا نے تمہیں تورات عطا کر کے جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ صحرا کے سفر میں تم پر بادل سایہ فگن کیے، پانی کی کمی دور کرنے کے لیے چشمے جاری کر دیئے، خوراک کی کمیابی میں من و سلویٰ کی نعمتیں اتاریں۔ لیکن تم لوگوں نے ان احسانات کی ناقدری کی اور رب کے غضب کو بار بار دعوت دی۔ تم نے اللہ کی نافرمانی کو اپنا شعار بنا لیا، انبیاء و مصلحین کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے تم ان کو قتل کر دیتے رہے۔ تم نے سمجھا کہ محض بنی اسرائیل میں سے ہونے پر تمہیں بخش دیا جائے گا۔ حالانکہ خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہونے کے لیے شرط ایمان، عمل صالح اور

Marfat.com

آخرت پر یقین ہے۔ یہ سلسلہ آیت 47 سے آیت 62 تک ہے۔

2۔ یہود ہمیشہ سے اس زعم میں مبتلا رہے ہیں کہ ان کو اللہ کے ساتھ عہد میں بندھا ہونے کی فضیلت حاصل ہے اور یہ عہد ابدی ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ توقع رہی کہ آخری پیغمبر جب تشریف لائیں گے تو وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں گے اور ان کو ذلت و رسوائی کی دلدل سے نکالیں گے۔ لہٰذا نہایت تفصیل سے انہیں بتایا گیا کہ یہ عہد یک طرفہ نہیں تھا۔ تم اگر اس کی پاسداری کرو تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرنے کو تیار ہے لیکن اس معاملہ میں تمہاری تاریخ کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ تم نے سبت [1] کی ذمہ داریاں نہیں نبھائیں، ایک گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو حیلے بہانوں سے اس سے بچنے کی کوشش کی۔ اللہ کے کلام میں اپنی مرضی سے تحریف کی اور اپنے فتووں کو اللہ کا حکم قرار دے کر پیش کرتے رہے۔ میثاق خداوندی کی شقیں بالکل واضح تھیں لیکن تم لوگوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ شریعت سے یہ بے اعتنائی تمہاری عادت ثانیہ بن گئی۔ ذاتی دشمنیوں اور سیاسی معاملات میں تم نے میثاق کو نظر انداز کر دیا اور حیلہ شرعی ایجاد کر کے ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ میثاق کی خلاف ورزی کا یہ بیان آیت 86 تک چلتا ہے۔

3۔ یہود کے پہلے سے صاحب ایمان ہونے کے دعوے کی قلعی کھولتے ہوئے ان کے ماضی وحال سے استدلال کیا ہے۔ ماضی میں تکبر کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے انبیاء کے قتل کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول کا انکار کیا اور ان کے دشمن ہو گئے۔ دنیا کی حرص اور موت کے خوف کے باعث انہوں نے ہمیشہ ایمان کے تقاضوں کو پس پشت ڈالا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کی آمد کے منتظر رہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبریل پر طعن کیا، سحر و ساحری اور عملیات سفلیہ کا سہارا لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں بدتمیزی کرنے لگے۔ لوگوں کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش میں لگ گئے اور پروپیگنڈا کی ایک سے ایک بڑھ کر مہم چلائی۔ خدا نے ان کو حسد کی ایسی آگ میں لا ڈالا کہ جس سے یہ نکل نہیں پا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ بحث آیت 121 تک چلا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں حسب موقع مسلمانوں کو یہود کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ہدایات دی ہیں۔

4۔ یہود نے کتمان حق کی کوششیں بھی کی تھیں اور تحریف کے عمل سے آسمانی صحیفوں میں تغیر کر رکھا تھا تاکہ وہ ہر اچھا وعدہ اپنے ساتھ منسوب کر سکیں اور اپنے حریفوں کو زک پہنچائیں۔ چنانچہ انہوں نے توریت سے مکہ مکرمہ، صفا و مروہ، حج، نماز وغیرہ ہر چیز کا ذکر محو کر دیا تاکہ بنی اسماعیل اپنے شرف کی کوئی دلیل ان کی کتابوں میں نہ پا سکیں۔ قرآن مجید نے حق کو از سر نو واضح کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمات اور ان کی ملت کا شاندار انداز میں اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ہر چیز اپنی اصل پر قائم ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسماعیل کا شرف ثابت ہوا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دلیل بھی مہیا ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن نے دکھایا ہے کہ اصل دین یہودیت یا

---

[1] سبت: ہفتے کا دن

Marfat.com

نصرانیت نہیں بلکہ ملت ابراہیم ہے جس کی پیروی ہونی چاہیے اور یہ کہ اولادِ ابراہیم میں کئی نسلوں تک اسلام کا یہ تصور واضح رہا، بعد میں یہودیوں کی کارستانیوں کے نتیجہ میں اس تصور میں خلل واقع ہوا۔ اب جس کو شرف چاہیے وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کر لے۔ یہ سلسلہ کلام آیت 141 تک چلا جاتا ہے۔

اس طرح پیغام کا ایک خلاصہ جو شروع میں دیا گیا تھا اس کے اجمال کی تفصیل میں تقریباً سو آیات نازل ہوئیں جنہوں نے پوری بات کو مبرہن [1] کر دیا۔

اسلوب کے فوائد:

اجمال کے بعد تفصیل کے اس اسلوب کے بہت سے فائدے ہیں۔ امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے ان کی وضاحت یوں کی ہے:

- گٹھا ہوا مجمل مختصر کلام چونکہ بنیادی اصول وکلیات پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے اس کی تعلیم آسان ہوتی ہے۔ یہ باتیں عقل پر واضح ہوتی ہیں، انداز کلام خوبصورت اور یاد رکھنے کے لیے بہت آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگ اس کو تیزی سے قبول کرتے ہیں۔ اس کا علم اور اس پر عمل دونوں سہل ہوتے ہیں۔
- مجمل بات ایک لمحہ میں معانی و مطالب کا ایک بڑا ذخیرہ سامنے لا دیتی ہے۔ ایک عام آدمی اگرچہ اس سے پوری واقفیت حاصل نہ کر پائے تب بھی وہ ظاہری مفہوم کو اخذ کر لیتا ہے۔
- ایک حکیم جانتا ہے کہ محکم و مجمل کلام نہایت گہرے اور غور طلب معانی کا حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس پر غور کرے تو وہ باتیں بھی اس کی سمجھ میں آ جاتی ہیں جن کی تفصیل موجود نہیں ہوتی۔
- مجمل بیان کے بعد جب تفصیل سامنے آتی ہے تو ذہن کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں۔ مجمل بیان پہلے سے ذہن کو اس رخ پر ڈال چکا ہوتا ہے لہٰذا تفصیل کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔
- مجمل اور مفصل کو جب ملا کر دیکھا جائے تو یہ بے حد لذت کا باعث اور خوبصورت ہوتا ہے۔
- اجمال کے بعد تفصیل ایک کند ذہن آدمی کے لیے بھی مفید ہوتی ہے۔ وہ مجمل انداز میں بات کو نہیں سمجھ پاتا تو تفصیل سے سمجھ لیتا ہے۔ اس کے لیے یہ اسی طرح کی چیز ہوتی ہے جیسے بات کو کسی کی تفہیم کے لیے دوبارہ کہہ دیا جائے۔

صراطِ مستقیم

صراطِ مستقیم سے مراد اللہ تک پہنچانے والی عدل وحق کی راہ ہے۔ (القائد الی عیون العقائد)

صراطِ مستقیم ہی وہ خالص دین قیم ہے جو بندہ کو اس کے رب تک پہنچاتا ہے۔ یہ صاف ستھرا دین شرک اور خواہش نفس سے بالکل پاک ہے۔ شیطان اسی راستہ سے لوگوں کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے (حمید الدین فراہی)

[1] مُبرہَن: برہان (دلیل) والا، واضح

Marfat.com

مخاطب کو متوجہ اور مُتنبّہ کرنے والے اسالیب

قرآن مجید میں متعدد ایسے اسالیب کلام اختیار کیے گئے ہیں جو مخاطب کو کسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے، اس کو جھنجھوڑنے اور ضد چھوڑ کر اصل حقائق کا مواجہہ [1] کرنے کی دعوت دینے کے لیے ہیں۔ ان میں سے بعض نمایاں اسالیب کا تذکرہ ہم یہاں کرتے ہیں:

1۔ تنہا مبتدا کا استعمال:

عام حالات میں کوئی بھی بامعنی کلام مبتدا اور خبر دونوں کے جمع ہونے سے بنتا ہے۔ مثلاً ''سلیم بیمار ہے'' یا ''طالب علم پڑھ رہا ہے''۔ ان جملوں میں تنہا ''سلیم'' یا ''طالب علم'' کہنے سے کچھ پتا نہیں چلے گا کہ بات کرنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ضروری ہوتا ہے کہ مخاطب کی پوری توجہ مبتدا پر مرکوز ہو جائے۔ متکلم اگر خبر بتانے میں لگ جائے تو مخاطب کی توجہ منتشر ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی دوست کے ہمراہ جا رہے ہوں اور دوست کے سامنے یکا یک ایک سانپ نمودار ہو جائے تو آپ اس کو متنبہ کرنے کے لیے محض ''سانپ!'' کہہ دیں گے۔ یہ نہیں کہیں گے کہ ''آپ کے آگے سانپ بیٹھا ہے۔'' کیونکہ آپ کا جملہ ہونے سے قبل سانپ اپنا کام کر لے گا اور جس خطرہ سے دوست کو بچانا چاہتے تھے اس سے آپ اسے دوچار کر دیں گے۔

قرآن مجید کی سورتوں کے جو نام حروف مقطعات کی صورت میں آئے ہیں وہ اصل میں مبتدا ہیں اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اگلا جملہ ان کی خبر بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ گویا متکلم کا اصل زور مبتدا ہی پر ہے اور مقصد اس سورہ کے مضامین کی طرف مخاطب کی کامل توجہ کو مبذول کرانا ہے۔

سورہ الحاقہ اور سورہ القارعہ کا آغاز بھی تنہا مبتدا کے ذکر سے ہوا ہے یعنی الحاقة اور القارعة۔ یہ الفاظ وقوع عذاب اور وقوع قیامت کے لیے آئے ہیں۔ خود ان الفاظ میں بھی دہشت اور ہولناکی کا مفہوم موجود ہے جو مخاطب کی توجہ کو جذب کرتا ہے۔ الحاقة، یعنی ایک اٹل اور قطعی چیز جو حقیقت بن کر سامنے آنے والی ہے۔ القارعة، یعنی ٹھونکنے اور کھٹکھٹانے والی آفت۔ جس طرح رات میں آنے والا زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا دے اور گھر والے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں، اسی طرح قیامت کی گھڑی اچانک نمودار ہوگی اور سارے عالم میں اس سے ایک ہلچل مچ جائے گی۔ گویا اس مبتدا کو ان الفاظ میں سن کر ہی مخاطب متوجہ ہو جائے گا کہ متکلم کس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کیفیت کو مزید پر اثر بنانے کے لیے ان سورتوں میں مبتدا کے بعد ایک سوالیہ جملہ کا اضافہ کیا ہے۔ مَا الْحَآقَّةُ (کیا

---

[1] مواجہہ کرنا: سامنا کرنا، پیش نظر رکھنا

Marfat.com

ہے الحاقہ؟) مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے کھٹکھٹانے والی؟) چونکہ سوال کرنے سے بھی وہ شخص چوکنا ہو جاتا ہے جس سے سوال کیا جائے، اس لیے اس سوالیہ جملہ کا مقصد مبتدا کی خبر سنانے سے پہلے مخاطب کو مزید متوجہ کرنا ہے تاکہ وہ غفلت اور بے پروائی کے ساتھ نہیں بلکہ کان کھول کر بات کو سنے۔

یہی اسلوب کلام اس صورت واقعہ یا کیفیت کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو مخاطب کے لیے اجنبی، اس کے قیاس و گمان سے مافوق اور الفاظ کی گرفت میں نہ آنے والی ہو۔ ایسی صورت واقعہ وہ بھی ہوتی ہے جب کسی چیز کی شان و عظمت بیان نہ ہو پا رہی ہو اور اس کے برعکس وہ کیفیت بھی جس کی ہولناکی، شدت اور اس سے دوچار لوگوں کی ذلت و بدحالی کی تصویر الفاظ کی مدد سے کھینچنا ممکن نہ ہو رہا ہو۔ قرآن مجید نے ایسے دونوں مواقع پر یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ۝٨ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝٩﴾

(الواقعة: 8-9)

"داہنے والے؟ تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! اور بائیں والے؟ تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا!"

یعنی داہنے والوں کی عظمت و شان، عیش جاوداں اور خوش انجامی کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ رہ گئے بائیں والے، تو ان کی ذلت و نکبت، بدبختی اور بدانجامی کا کچھ نہ پوچھو، یہ الفاظ کے احاطہ میں نہیں آ سکتی۔ اس کا اندازہ انہی کو ہوگا جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔

2۔ مَا اَدْرٰکَ کا استعمال:

مَـــا اَدْرٰکَ کا مفہوم یہ ہے کہ فلاں چیز کیا ہے اور کیسی ہے، تم کیا جانو اور کون تمہیں اس وقت اس کی حقیقت سے مطلع کرسکتا ہے۔ یہ اسلوب بھی کسی ایسی چیز کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے جس کی طرف سے مخاطب اپنی نادانی، کم علمی یا غفلت کے باعث آنکھیں بند کیے ہوئے ہو۔

عالم غیب کے امور سے، خواہ ان کا تعلق اس دنیا سے ہو یا اگلی دنیا سے، اسی اسلوب سے آگاہ کیا گیا ہے اور مخاطبین کو ان کی حقیقت کا ہلکا سا تصور دیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝٤ وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧﴾

(الهمزة: 4-7)

"ہرگز نہیں، وہ چورچور کر دینے والی میں ضرور پھینکا جائے گا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ چورچور کر دینے والی کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ! جو دلوں پر جا چڑھے گی۔"

❀ ... ﴿وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣ یَوْمَ یَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝٤ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝٥﴾

(القارعة: 3-5)

Marfat.com

"اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی؟ اس دن لوگ منتشر پتنگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔"

❀ ... ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝﴾ (المطففين: 7-10)

"ہرگز نہیں، بے شک فاجروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر، اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی۔"

یعنی فاجروں کے عمل کا تمام ریکارڈ ایک ایسی کتاب میں تحریری صورت میں موجود ہوگا جس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا کہ کون دوزخ کے کس طبقہ میں داخل کیے جانے کا حق دار ہے۔ ان حقائق کو جھٹلانے والے اس دن طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوں گے۔

❀ ... ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ (المطففين: 18-21)

"ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمال نامے علیین میں ہوں گے اور تم کیا سمجھے کہ علیین کیا ہے؟ لکھا ہوا دفتر! مقربوں کی نگرانی میں۔"

یعنی علیین میں عالی مقام لوگوں کے اعمال نامے ہوں گے جن میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب فرشتے ان کی نگرانی پر مقرر ہیں۔

❀ ... ﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝﴾ (المدثر: 26-30)

"میں اس کو عنقریب سقر میں داخل کروں گا اور کیا سمجھے کہ یہ سقر کیا ہے۔ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چمڑی کو جھلس دینے والی (آگ)۔ اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔"

ان آیات سے پہلے قرآن کو جادو قرار دینے اور اسے انسانی کلام سمجھنے والوں کا ذکر ہے۔ بتایا ہے کہ ان کا ٹھکانا سقر ہوگی جو ایسی آگ ہوگی جس کی لپیٹ چمڑی کو جھلس دے گی اور جو کسی مجرم پر ترس نہیں کھائے گی۔

❀ ... ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝﴾ (الحاقة: 3-4)

"اور تم کیا جانو کہ کیا ہے اٹل حقیقت؟ ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی آفت کو جھٹلایا۔"

مطلب یہ ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر آنے والا عذاب ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی ہولناکی، ہمہ گیر آفت اور بے پناہ مصیبت کو بیان کرنا کس کے بس میں ہے؟ آگے عاد، ثمود اور دوسری اقوام کی مثالوں سے سمجھایا ہے کہ تکذیب کے نتیجہ میں وہ جس مصیبت سے دوچار ہوئیں اس کی نوعیت کیا تھی۔

Marfat.com

❀ ... ﴿وَ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۱۸﴾ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾﴾

(الانفطار: 17-19)

''اور تم کیا سمجھے جزا کے دن کو؟ بولو، تم کیا سمجھے جزا کے دن کو؟ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔''

یہاں وہی اسلوب دہرایا گیا ہے جس کا مقصد مضمون کی اہمیت کو نمایاں کرنا ہے۔ مخاطب کو پوری طرح متوجہ کرنے کے بعد روز جزا کی اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ وہاں کوئی کسی دوسرے کے کام نہ آ سکے گا۔ تمام مزعومہ ❶ شرکاء وشفعاء ❷ بے بس ہوں گے۔ فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہوگا۔

❀ ... ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ؕ﴿۳﴾﴾

(القدر: 1-3)

''بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا اور تم کیا جانو شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

یہاں اس رات کی عظمتوں اور برکتوں کا حوالہ دیا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ بتایا ہے کہ اس رات میں پوری کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اس ایک رات کی برکات پر دوسری ہزار مہینوں کی راتیں فوقیت نہیں پا سکتیں۔ لوگ اس رات کی اہمیت کیا جانیں۔

❀ ... ﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ يَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾﴾

(البلد: 11-16)

''پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی؟ گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔''

یہاں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں، بولنے کے لیے زبان اور ہونٹ عطا فرمائے، پھر اس کو ہدایت کی روشنی عطا کی۔ ان عنایات کا حق یہ تھا کہ یہ گھاٹی عبور کر کے اپنی شکر گزاری کا ثبوت مہیا کرتا لیکن افسوس، اس نے یہ حوصلہ نہیں دکھایا۔ اس کے بعد جس گھاٹی کے عبور کرنے کا اس سے مطالبہ کیا ہے اس کو مبہم نہیں رہنے دیا، بلکہ یہ بتایا کہ اس سے مراد ہمدردی، خلق، ایثار اور نیکی کے کام ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وضاحت کے بغیر آدمی کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے۔

❀ ... ﴿وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾﴾ (الطارق: 1-3)

''شاہد ہیں آسمان اور رات میں نمودار ہونے والے۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں رات میں نمودار ہونے والے؟ دمکتے ستارے!''

---

❶ مزعومہ: زعم (خیال) کی گئی، خیالی ❷ شفعاء: شفیع (سفارش کرنے والا) کی جمع

Marfat.com

یعنی رات میں نمودار ہونے والے بھی اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے۔ پھر کہا ہے کہ اس شہادت کو معمولی نہ سمجھو۔ نمودار ہونے والوں سے مراد دمکتے ستارے ہیں۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی وہ ان گنت آنکھیں ہیں جو ہر آن اہل زمین کو گھورتی رہتی ہیں۔

3۔ اَرَءَیْتَ کا استعمال:

اَرَءَیْتَ (کیا تو نے دیکھا؟) کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں کسی شخص کی نہایت نامناسب حرکت اور برے کردار کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانی اور اس پر نکیر ❶ کرنی ہو۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

❀ ... ﴿ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ ﴾ (الماعون: 1-3)

''دیکھا تم نے اس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا۔''

یہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں خانہ کعبہ کا کلید بردار اور متولی تھا۔ منصب رفادہ پر فائز ہونے کی بدولت اس نے مال و دولت کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ رفادہ ❷ کی ذمہ داریوں کے تقاضوں کے برعکس نہ یتیموں کی سرپرستی کرتا اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر کچھ خرچ کرتا۔ آخرت کی باز پرس سے اس کی بے نیازی نے خانہ کعبہ کے مقاصد کو بے حد نقصان پہنچایا۔ یہاں اس کے برے کردار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

❀ ... ﴿ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ۝ ﴾ (العلق: 9-14)

''ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کی تلقین کرنے والا ہوا! بھلا دیکھو تو اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا؟ کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟''

یہاں لہجہ نہایت غضب آلود ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے رسول کے مخاطبوں کی حرکتیں بالکل مجنونانہ ہیں۔ یہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو نماز ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ سوچتے نہیں کہ یہ اللہ کا بندہ اگر ہدایت پر ہو اور نیکی اور تقویٰ کی راہ لوگوں کو دکھانا چاہتا ہو اور اس کے برعکس خود یہ لوگ اس کی دعوت میں اڑنگے ڈالنے والے اور حق سے منہ موڑنے والے ثابت ہوں، تب ان کی حرکتوں کا انجام کیا ہوگا؟

❀ ... ﴿ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ۝ ﴾ (الجاثیة: 23)

''کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور جس کو اللہ نے، علم رکھتے ہوئے، گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے، بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہو۔ کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟''

---

❶ نکیر: انکار، نفی ❷ رفادہ: حاجیوں کی میزبانی کا انتظام (رفد: انعام، بخشش)

Marfat.com

یہاں اَرَءَ یْتَ کا استعمال یہ دکھانے کے لیے ہوا ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے اپنے عمل کی باگ اپنی خواہش کے ہاتھ میں تھما دی ہو، پھر اس نے اپنے آپ کو ہدایت کی توفیق سے محروم کرلیا ہو اور اللہ نے اس کی سمع و بصر اور عقل وفہم کی صلاحیتوں کو معطل کر کے ان پر مہر کر دی ہو، وہ اب کیسے ہدایت پا سکتا ہے۔ جو لوگ اس کے ایمان کی توقع رکھتے ہیں وہ غور کریں تو ایک ناممکن الحصول مقصد کو حاصل کرنے کے درپے ہیں۔

❀ ... ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝﴾

(مریم: 77-78)

''بھلا دیکھا تم نے اس کو جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ میں آخرت میں بھی مال اور اولاد سے نوازا جاؤں گا۔ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمان سے کوئی عہد کرا لیا ہے؟''

یہاں اَرَءَ یْتَ کا استعمال ایک غلط موقف کو بلا کسی دلیل اور بنیاد کے اختیار کرنے والے کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہوا ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ جب دنیا میں آسودہ حال ہوتے ہیں تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اس خوشحالی اور رفاہیت ❶ کے پیدائشی حق دار ہیں۔ ان کے نزدیک اول تو آخرت ہو گی نہیں، اگر ہوئی تو وہاں بھی ان کا مقدر یہی آسودگی اور عیش کی زندگی ہو گی۔ فرمایا کہ یہ لوگ کیا اگلی زندگی میں جھانک آئے ہیں یا اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے جس کے بل بوتے پر اپنی خوش انجامی کا زعم رکھتے ہیں۔

❀ ... ﴿قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَ مَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۝﴾

(الکہف: 63)

''اس نے کہا: جی دیکھیے نا! جب ہم نے چٹان کے پاس پناہ لی تو میں مچھلی کو بھول گیا اور یہ شیطان ہی تھا جس نے اس کو یاد رکھنے سے مجھے غافل کر دیا۔ اور اس نے عجیب طرح اپنی راہ دریا میں نکال لی۔''

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کے دوران میں پیش آیا جو انہوں نے خضر سے ملاقات کی غرض سے کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ان کے شاگرد ❷ تھے جن کی حفاظت میں زادِ راہ تھا۔ اس میں ناشتہ کے لیے ایک مچھلی بھی تھی۔ جب وہ سمندر کے کنارے کسی چٹان کے پاس ستانے کے لیے اترے تو مچھلی ناقابل یقین طور پر سمندر میں چلی گئی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھانا مانگا تو شاگرد نے ڈرتے ہوئے ان کو اس عجیب واقعہ کی اطلاع دی۔ یہاں اَرَءَ یْتَ کا استعمال ایک ناقابل یقین واقعہ کی خبر دینے کے لیے ہوا ہے۔

اَرَءَ یْتَ کے استعمال میں یہ تنوع بھی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ضمیر خطاب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مقصد اس سے بھی کسی خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا اور غور کی دعوت دینا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آدم اور ابلیس کے قصہ میں ابلیس کا قول نقل ہوا ہے:

❀ ... ﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ

❶ رفاہیت: رفاہ (بہبود) کی حالت، بہبودی، خوشحالی

❷ یہ شاگرد یوشع بن نون تھے، وہ بھی نبی ہوئے۔

Marfat.com

ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۶۲﴾ (بنی اسرائیل : 62)

''اس نے کہا: ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تو نے مجھ پر عزت بخشی ہے۔ اگر تو نے مجھے روز قیامت تک مہلت دے دی تو میں ایک قلیل تعداد کے سوا اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔''

یعنی تو نے آدم خاکی کو مجھ پر فضیلت دی ہے تو اس کی تخلیق کی بنیاد میں جو کمزوریاں ہیں اگر مجھے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے تو میں ثابت کر دوں گا کہ یہ اس شرف کے لائق نہ تھا جو اس کو عطا کیا گیا۔ اور میں اس کی کثیر ذریت ❶ کو گمراہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ ابلیس نے یہاں طنزیہ لہجے میں بات کی ہے اور آدم کی تحقیر کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس کی ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اولادِ آدم کو ورغلا سکتا ہے۔

4۔ ترجیع کا استعمال:

ترجیع سے مراد کسی کلام کا وقفہ وقفہ سے دہرانا ہے۔ قرآن مجید کی چند سورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی آیت بار بار سامنے آتی ہے اور ایک حقیقت کو وقفوں سے مخاطبین کو سناتی ہے تاکہ ان کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہوئی ہے وہ اس کو کھولیں اور اس حقیقت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کی روشنی میں اپنے غلط موقف کی اصلاح کریں۔

ترجیع کا اسلوب سورہ الرحمٰن میں اتنی کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ہر دو تین آیتوں کے بعد اس میں ٹیپ کے بند کی طرح آتی ہے۔ لیکن ترجیع الرحمان کے علاوہ سورہ الشعراء، سورہ القمر اور سورہ المرسلات میں بھی ہے۔

ان تمام سورتوں میں خطاب قریش کے ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو واضح حقیقتوں کو تسلیم کرنے میں اپنی سبکی محسوس کرتے تھے۔ ان کی انانیت حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ ایسے لوگوں کے سامنے اپنی بات مدلل طور پر کہہ دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ہر دلیل کے بعد ان کو جھنجھوڑ دیا جائے کہ یہ بات یا یہ دلیل تمہاری سمجھ میں آئی یا نہیں۔ اگر مخاطبوں کی ضد اور ان کی مزاجی خصوصیت کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ان کو تنبہ ❷ نہیں ہوتا اور کلام ان پر بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا بلاغت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترجیع کا اسلوب اختیار کیا جائے تاکہ یہ لوگ اپنے کان اور آنکھیں کھولیں اور دل و دماغ کو قبول حق کے لیے وا کریں۔

آیت کی ترجیع کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام کے سیاق و سباق سے ہٹ کر آ جاتی ہو اور محض تکرار کا فائدہ دیتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ پر مشتمل اور جامع مضمون کی حامل ہوتی ہے جن کا مدعا بالکل واضح ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ماسبق کلام ❸ کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے جو اس کلام پر غور کر کے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ سورہ الرحمٰن اور سورہ المرسلات میں جو آیات ترجیع ہیں ان کے الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ یہ مختلف انواع کے کلام کے ساتھ مربوط ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

---

❶ ذریت: آل اولاد، نسل ❷ تنبہ: خبردار کرنا، تنبیہ، وارننگ ❸ ماسبق کلام: جو بات پہلے گزر چکی (مَا سَبَقَ: جو پہلے گزرا)

Marfat.com

(i) سورۃ الشعراء:

اس سورہ کا پیغام یہ ہے کہ محمد رسول اللہ، اللہ کے سچے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔قرآن کو کہانت [1] یا شاعری سمجھ کر رسول کی تکذیب کرنے والے اس عذاب کی نشانی مانگتے ہیں جس کی خبر رسول اللہ ﷺ ان کو دے رہے ہیں۔ایسے لوگوں کو آخر وہ نشانیاں کیوں نظر نہیں آتیں جن سے زمین کا چپہ چپہ معمور ہے۔اگر ان پر دھیان نہیں دینا چاہتے تو ماضی کی ان اقوام کی تاریخ میں نشانیاں تلاش کریں جو خدا کے تازیانہ عذاب کے نتیجہ میں دنیا سے معدوم ہوگئیں۔ان ضدی لوگوں پر بھی اگر اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرنا چاہے تو کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہ سکے گا۔خدا بڑا زبردست ہے لیکن چونکہ وہ بڑا رحیم بھی ہے اس لیے وہ مہلت دیتا ہے تاکہ لوگ توبہ واصلاح کے بعد اس کی رحمت کے مستحق ہوسکیں۔

زمین کی نشانیوں اور تاریخ میں رسولوں کے واقعات بیان کرتے کرتے جابجا آیت ترجیع آتی ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝٨ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝٩﴾

(الشعراء: 8-9)

''اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی۔''

(ii) سورۃ القمر:

اس سورہ میں بھی مخاطب وہی لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے انذار [2] کے جواب میں نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ان کو بتایا ہے کہ ان کے حق میں بہتر یہ ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کریں اور اس انتظار میں نہ رہیں کہ جب سب کچھ ان کے اپنے سروں پر سے گزر جائے گا تب مانیں گے۔اس قوم پر تو اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ایک ایسی کتاب اتار دی جو تعلیم وتذکیر اور شکوک وشبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع وکامل اور تمام ضروری اوصاف ومحاسن سے آراستہ ہے۔آخر اس عظیم نعمت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے؟

سورہ میں پچھلی اقوام کی سرگزشتیں سنائی ہیں اور ٹیپ کے بند کے طور پر یہ آیت ترجیع آتی ہے:

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝١٦ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۝١٧﴾ (القمر: 16-17)

''تو کیسے پیش آیا میرا عذاب اور میرا ڈراوا۔اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے، تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا۔''

(iii) سورۃ الرحمٰن:

سورۃ الرحمٰن میں سورۃ القمر کے مضمون کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے۔رحمانیت کے تقاضا سے اس نے انسان کو نطق وبیان کی صلاحیت دی جس کے طفیل تم بات سمجھ سکتے اور سمجھا سکتے ہو۔

[1] کہانت: فال نکالنا، آئندہ کی خبر دینا، کاہن کا پیشہ (کاہن: آئندہ باتوں کی خبر دینے والا) [2] انذار: ڈرانا، برے انجام سے خبردار کرنا

Marfat.com

رحمانیت کے تقاضے ہی سے اس نے قرآن کو رہنمائی کا ذریعہ بنایا اور اصل حقائق کے حق میں دلائل آفاق وانفس میں ہر چہار سو پھیلا دیے۔ لیکن تم ہو کہ پھر بھی نئی نشانیوں کا تقاضا کرتے ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت وقدرت اور اس کی شانوں، کرشموں اور عظیم الشان نشانیوں میں سے ایک ایک پر جیسے انگلی رکھ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں تو اور کیا ہے۔ ان کی طرف سے کیوں آنکھیں بند کیے ہوئے ہو! ہر نشانی کے بعد آیت ترجیع آتی ہے:

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٣﴾﴾ (الرحمٰن: 13)

''تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟''

آیت میں آلاء کا لفظ ایسا جامع استعمال ہوا ہے جو نشانیوں، قدرتوں، شانوں، عظمتوں، کرشموں اور کارناموں سب پر حاوی ہے۔ ماسبق آیت کی روشنی میں اس کا خاص پہلو متعین کیا جا سکتا ہے۔

(iv) سورۃ المرسلات:

اس سورہ میں قیامت کا اثبات آفاق کے آثار وشواہد کی مدد سے کیا ہے اور عدل وجزا کا انکار کرنے والوں کی بدانجامی کی خبر دی گئی ہے۔ سورہ میں زیادہ زور ترہیب [1] کے پہلو پر ہے اور مکذبین کے عذاب کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہر حقیقت کے بیان کے بعد آیت ترجیع آتی ہے:

﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٥﴾﴾ (المرسلات: 15)

''خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔''

لفظ وَیْل ایک جامع لفظ ہے جس کے تحت خرابی کا سبب بننے والی تمام چیزیں آ سکتی ہیں مثلاً غم، حسرت، پریشانی، عذاب وغیرہ۔ ماسبق کے ساتھ آیت ترجیع کو مربوط کیجیے تو کہیں یہ مکذبین پر قیامت کے اثرات کو بیان کرتی ہے، کہیں اس سے عذاب کی مختلف اقسام مراد لی گئی ہیں جن سے مجرمین کو سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں یہ بتایا ہے کہ مکذبین کی آنکھیں آج حقائق کو نہیں دیکھ رہی ہیں لیکن جب وہ دن خرابی لائے گا تو ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس روز یہ نہ زبان سے کوئی عذر پیش کر سکیں گے اور نہ اپنا دفاع کرنے پر قادر ہوں گے۔ اس دن ان کے لیے ہلاکت اور تباہی کے سوا کیا چیز رہ جائے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آج تکذیب سے باز آ جائیں اور قرآن کی دعوت پر کان دھریں۔

سمع وبصر

سمع کی حقیقت عقل ہے۔ چنانچہ جو شخص بات کو نہیں سمجھتا اس کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور بصارت کی حقیقت قلبی بصیرت ہے۔ جس کے اندر قلبی بصیرت نہیں ہوتی اس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ سورۂ حج (46) میں فرمایا ہے: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

(حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ یونس: 42)

---

[1] ترہیب: ڈرانا، خوف دلانا۔ اسی سے ''راہب'' (ڈرنے والا) ہے۔

Marfat.com

علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم کی نظر میں

مولانا حمید الدین مرحوم، ان علما حق میں سے تھے، جن کا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں ہوتا، بلکہ عمل بھی ہوتا ہے، اور اس دوسری جنس کی کمیابی کا جو عالم ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، میں جب کبھی ان سے ملا مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا، وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے، ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔ (امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ)

عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ متاخرین میں قرآن مجید کے فہم وتدبر کے لحاظ سے بہت کم لوگ اس مرتبے پر پہنچے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو سرفراز فرمایا تھا، انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کلام اللہ کے معانی میں صرف کیا اور عربی زبان میں ایک ایسی محققانہ تفسیر لکھی جس کی نظیر متقدمین کی تصنیفات میں بھی کم ملتی ہے۔ جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی، جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا، جس کی تفسیروں سے عرب وعجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا، جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جاں نثار کرتا ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اس دور میں علوم قرآنی کے لحاظ سے امام وقت تھے، وہ تفسیر قرآن میں ایک امتیازی درجہ رکھنے والے نہ صرف اپنے معاصرین اور متاخرین میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ تاریخ اُمت میں انھوں نے تفسیر کے بعض نئے اُصول دریافت کیے، ان میں سب سے بڑا ان کا فلسفہ نظم قرآن ہے، یعنی ہر سورہ بجائے خود ایک مستقل ومنظم ومرتب کلام ہے، اور پھر اس طرح ہر سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے اپنی قبل والی اور بعد والی سورہ سے مربوط ہے۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ان علمائے کرام میں ہیں جنھوں نے اسلام، خصوصاً قرآن پاک کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، کلام مجید کے فہم اور مشکلات قرآنی کے حل میں اللہ تعالیٰ نے انھیں خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اس حیثیت سے وہ اس دَور کے صحیح معنوں میں ترجمان القرآن تھے۔

(مولانا شاہ معین الدین ندوی)

مولانا حمید الدین قرآن پاک کے والہ وشیدا ہی نہیں تھے، بلکہ اس کے نکات اور معانی جس طرح وہ سمجھتے تھے، شاید ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو۔ آخر عمر میں انھوں نے ساری توجہ ترتیب ونظام قرآن کی طرف مبذول کر دی تھی، جس سے ان کی وسعت نظر اور تحقیق وتدقیق کامل کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ان کی ساری عمر کی محنت اور کاوش کا نتیجہ تھا، انھوں نے قرآن مجید پر ہر پہلو سے غور کیا تھا، اور کوئی نکتہ ایسا نہیں تھا جو ان کی نظر سے بچا ہو۔

(مولانا عبدالحق، رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

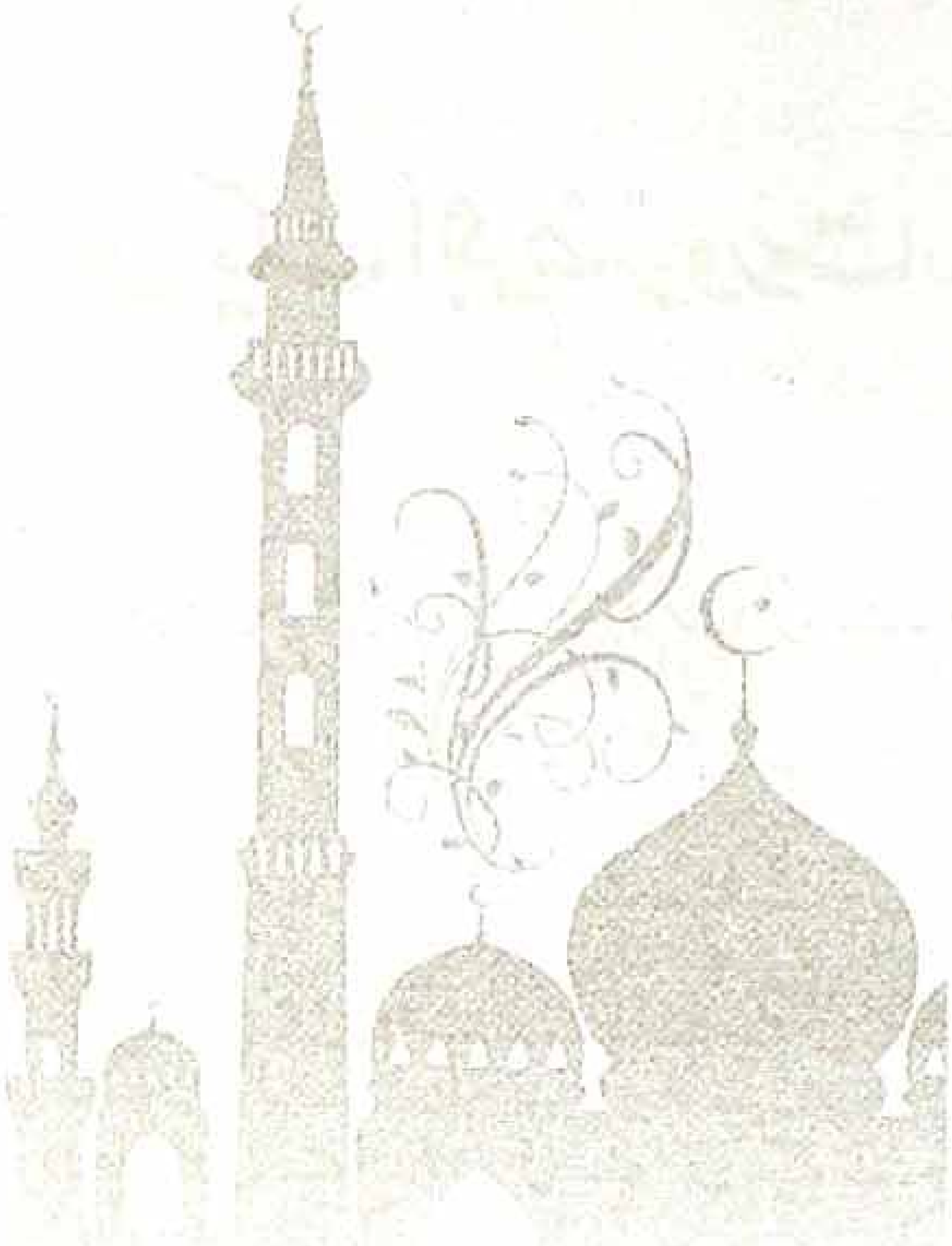

ذکر و فکر

بابِ نہم

- وقت کی ایک اہم ضرورت
- زکوٰۃ سے متعلق بعض وضاحتیں
- صدرِ اول کی تاریخ کے لیے چند رہنما نکات
- مشاہداتِ حج
- معاشرتی نظام کو بگاڑنے کی بین الاقوامی تحریک
- مکاتیبِ اصلاحی نمبر
- تدبرِ قرآن کا ایک قابلِ قدر مطالعہ
- امام فراہی سیمینار
- نظمِ قرآن کے نظریہ کی مقبولیت

Marfat.com

وقت کی ایک اہم ضرورت

قوموں کی عالمی برادری میں امت مسلمہ آج بالکل بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں مغربی اقوام کے استیلاء اور غلبے سے جب مسلمانوں کے علاقے آزاد ہوئے تو ملت کے لیے سوچنے اور اس کا درد رکھنے والا ہر مسلمان یہ توقع رکھتا تھا کہ امت مسلمہ اب یورپ کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ پالے گی۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا ہے یہ توقع عبث ثابت ہو رہی ہے، اور اب تو وہ حالات و واقعات جن سے امت ادھر دوچار ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ اہل مغرب نے مسلمانوں کو نام نہاد آزادی اس وقت دی ہے جب ان کو سیاسی و اقتصادی طور پر بالکل بے بس کر دیا ہے اور یہ انتظام بھی کر لیا ہے کہ ان کے اندر دوبارہ سر اٹھانے کی صلاحیت پیدا نہ ہونے پائے۔

اس صورت حال پر ہر دردمند مسلمان متفکر ہے اور چاہتا ہے کہ ملت کے تحفظ اور استحکام کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو کر گزرے، لیکن اس مقصد کے لیے کون سا کام سب سے اہم ہے، اس سوال کے جواب میں رائیں الگ الگ ہیں۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے قومی زبوں حالی کا علاج یہ سوچا کہ مغربی تہذیب وتمدن کو اپنا لینا قومی ترقی کا ضامن ہوگا لیکن دو تین نسلیں گزرنے کے بعد ترک قوم پر واضح ہوا کہ اس علاج کو اختیار کر کے مسلمان رہنا محال ہے۔ اسی مسئلہ سے آج وہ مسلمان بھی دوچار ہیں جو مغربی ممالک میں جا کر آباد ہو گئے اور مغربی ثقافت کو اختیار کر لیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک دینی درس گاہوں کی کثرت اور تبلیغ دین کے اہتمام سے دور حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وسط ایشیا میں اس وقت مسجدیں اور خانقاہیں آباد اور مدرسے اور کتب خانے بڑی تعداد میں قائم تھے جب روس نے یلغار کی اور ملت کے تمام آثار مٹا کر رکھ دیئے۔ یہ چیزیں اس فکر و فلسفہ کا مقابلہ نہ کر سکیں جو مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ بعض لوگ مسلم ممالک کے سیاسی اتحاد اور اقتصادی تعاون کو امت کی سربلندی کے لیے ایک اکسیر نسخہ سمجھتے ہیں لیکن چوتھائی صدی قبل (1969ء میں) اسلامی ممالک کی تنظیم قائم ہوئی، اس کے تحت اسلامی عالمی بینک بھی بنا اور دوسرے ادارے بھی وجود میں آئے جن میں اسلامی ممالک کے باہمی اشتراک وتعاون سے مادی ترقی کی کئی اسکیمیں تیار ہوئیں لیکن اس نسخے سے امت مسلمہ اپنا کوئی ایک مسئلہ بھی حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

ہمارے نزدیک جو چیز قوم کو قوم بناتی ہے وہ ان کا خودی کا شعور ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں، دنیا میں کس لیے آئے ہیں اور ہمیں یہاں کیا کرنا ہے۔ ہمیں کس مقصد کے لیے جینا اور کس مقصد کے لیے مرنا ہے۔ یہ شعور جب قوم کے

Marfat.com

ذہین طبقے کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے تو اس کے خون میں حرارت اور اس کے فکر کو صحیح رخ عطا کرتا ہے۔اس سے قوم قوم بنتی ہے۔ یہودیوں میں جب سے یہ قومی شعور ابھرا ہے ان کی یک جہتی، قومی بہبود اور اپنے آثار کی حفاظت میں بے مثل ترقی ہوئی ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے علم کا منبع اور فکر و فلسفہ کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ اس نے تخلیق آدم کی غایت واضح کی ہے، انسان کے مرتبہ و مقام کا تعین کیا ہے، انسان اور خدا کے تعلق کی اساسات نمایاں کی ہیں، مسلمانوں کو وہ اصول بتائے ہیں جن پر عائلی زندگی کی بنیادیں استوار اور اجتماعی و سیاسی زندگی کی تعمیر ہونی چاہیے، اس نے ان مقاصد کا تعین کیا ہے جن کے لیے امت مسلمہ وجود میں آئی اور جن کی خاطر افراد امت کا جینا اور مرنا پسندیدہ ہے۔قرآن کے اس پیغام اور حجت سے صدر اول کے مسلمان شعوری طور پر آگاہ تھے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت سے مقصدِ حیات کا یہ شعور ان کے رگ و پے میں جب سرایت کر گیا تو دنیا نے دیکھا کہ اس فکر و فلسفہ کے سیلاب میں وقت کی تہذیبیں اور عظیم سلطنتیں خس و خاشاک کی طرح بہ گئیں اور اقوام عالم اس فکر و فلسفہ کے حاملین کی عظمت کو سلام کرنے لگیں۔ جوں جوں مسلمان اسلام کے اس اصلی خزانے سے بے خبر ہوتے گئے ان کے اوپر ادبار و زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ وہ اقوام عالم میں خفیف اور بے وزن ہو کر رہ گئے۔

اقوام عالم کے مقابلے میں امت مسلمہ کو آج بھی جو شرف حاصل ہے وہ کتاب اللہ کی امین ہونے کا شرف ہے۔ لہٰذا امت کا عروج ہو یا زوال، اس امانت کا حق ادا کرنے یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ آج اس کتاب کا تعلق مسلمان معاشرے کی فکری اور عملی زندگی سے بڑی حد تک منقطع ہو چکا ہے۔قرآن کے حقوق سے ناآشنا ملت کو اگر مخالف اقوام کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور آسمان سے ان کے لیے نصرت نازل نہ ہو تو یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔اپنے ملک ہی پر غور کیجیے۔ ہم مادی وسائل کو ترقی دینے کے منصوبے بناتے ہیں، توانائی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرتے ہیں، تعلیمی و ثقافتی میدان میں قلیل المیعاد اور طویل المیعاد اسکیمیں نافذ کرتے ہیں، ملکی دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے قومی سطح پر افراد ملت میں ملی شعور پیدا کرنے اور ان کو قرآن مجید کے فکر و فلسفہ سے آگاہ کرنے کے لیے آج تک کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ آج تک ہم ان کو ان کے فرض منصبی سے روشناس نہیں کر سکے۔ ہماری ساری تگ و دو ان کو مغربی تہذیب و ثقافت کا دلدادہ بنانے پر مرکوز ہے۔

آج وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کی جو نعمت عطا ہوئی ہے، ہم اجتماعی طور پر اس کی قدر کریں۔ اس کے اندر مدفون خزانے سے واقف ہوں، اس کے فکر و فلسفہ کو خود اپنائیں اور دوسروں میں رواج دیں اور ہر کام اس کی روشنی میں سرانجام دیں۔ اسی کے نتیجے میں ہم اپنے رب کی رضا حاصل کر سکیں گے جو تمام قوتوں سے بڑی قوت اور ہر دولت سے بڑھ کر دولت ہے۔

Marfat.com

زکوٰۃ سے متعلق بعض وضاحتیں

تدبر کے گزشتہ شمارے میں زکوٰۃ کے مصارف سے متعلق جو مضمون شائع ہوا[1] اس کو قارئین نے بہت مفید اور معلومات افزا پایا۔ بعض لوگوں نے توجہ دلائی ہے کہ اس موضوع سے متعلق دوسرے ضروری مسائل کو بھی اسی انداز سے زیر بحث لایا جائے تاکہ اس زمانہ میں نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ میں جو مشکلات درپیش ہیں ان کا حل سامنے آئے۔ قارئین نے خاص طور پر یہ دریافت کیا ہے کہ دورِ حاضر میں ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے لیے کیا طریق کار اختیار کرے گی؟ زکوٰۃ کو اگر ایک ٹیکس سمجھ لیا جائے یا ٹیکسوں کو زکوٰۃ کے ہم معنی قرار دے دیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ مصارفِ زکوٰۃ کی بحث میں مسئلہ تملیکِ زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے اور اس کو کس طرح حل کیا جائے گا؟ وغیرہ

چونکہ مسلمان ایک مدت سے زکوٰۃ کے اجتماعی نظام اور اس کی برکات سے محروم ہیں اور اس حکم کی حقیقت بس اسی حد تک جانتے ہیں کہ بعض مخیّر حضرات وقتاً فوقتاً اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم کا حساب کر کے اسے محلے کے محتاجوں میں بانٹ دیتے یا پھر اس رقم کو دینی مدارس کے حوالے کر کے اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے رہے ہیں، اس لیے ان کو یہ سوال واقعی پریشان کرتا ہے کہ دورِ حاضر کی ایک اسلامی ریاست میں بھی کیا کام کا انداز یہی ہو گا۔

ہمارے نزدیک زکوٰۃ کا موضوع بڑی اہمیت رکھنے والا ہے اور اس میں کافی تحقیق کی ضرورت بھی ہے نہ صرف زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم بلکہ اس سے بھی زیادہ بنیادی سوالات مثلاً یہ کہ زکوٰۃ کن اشیاء پر وصول ہو گی اور کون سی اشیاء اس سے مستثنیٰ ہوں گی اور جدید دور میں اس کے قواعد وضوابط کیا ہوں گے، تحقیق طلب ہیں۔ یہ کام ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے پیش نظر ہے۔ امید ہے کہ اصول تدبر حدیث کے مباحث مکمل ہوتے ہی ہم اس موضوع پر قلم اٹھا سکیں گے۔

جہاں تک زکوٰۃ کو ایک ٹیکس قرار دینے کا تعلق ہے ہمارے نزدیک اس میں واضح قباحتیں ہیں۔ ان دونوں کی حقیقت اور مزاج میں چند نمایاں فرق ہیں۔ علمائے معاشیات کی اصطلاح میں ٹیکس وہ رقم ہوتی ہے جو کوئی حکومتی ادارہ اپنی رعایا پر عائد کرتا ہے۔ اس کے برعکس زکوٰۃ کو اسلامی حکومت کا ٹیکس سمجھ لیا جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی ان حالات میں واجب نہیں ہو گی جب ایک مسلمان غیر اسلامی حکومت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہو، یا وہ ہو تو کسی اسلامی حکومت کی حدود میں لیکن حکومت زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام نہ کرتی ہو۔ اس پوزیشن کو مسلمانوں نے کسی زمانہ میں قبول نہیں کیا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کا عائد کرنے والا خدا ہے، اسلامی حکومت نہیں۔

معاشیات کی رو سے ٹیکس کا مقصد ریاست کے اخراجات کے لیے رقوم مہیا کرنا اور ملک کی معاشی زندگی کو

---

[1] رسالہ تدبر، شمارہ نمبر 9، دسمبر 1983ء۔

Marfat.com

منضبط کرنا ہوتا ہے چنانچہ ہر حکومت سالانہ بجٹ بناتے وقت اپنی ضروریات کے لحاظ سے نئے ٹیکس لگاتی ہے یا پرانے ٹیکسوں کی شرح میں کمی بیشی کرتی ہے۔اس کے برعکس زکوٰۃ کا مقصد خدا کے انعام کا شکر ادا کرنا، محبت دنیا سے دل کو پاک کرنا اور حاجت مندوں کی امداد کرنا ہوتا ہے۔ اس کی بعض شرحیں نبی ﷺ ہی نے مقرر نہیں کیں بلکہ تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شریعتوں میں بھی یہی شرحیں رائج تھیں۔ گویا اس اعتبار سے زکوٰۃ مال یا پیداوار کا ایک متعین حق ہے۔قرآن مجید نے اسے حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ (متعین حق) کہا بھی ہے۔ایک بخیل آدمی کے مال کے ناپاک ہونے کا تصور اسی سبب سے پیدا ہوا ہے کہ وہ حاجت مندوں کا یہ حق ادا نہیں کرتا جبکہ یہ حق خدا نے اس کے مال میں رکھا ہے۔ٹیکسوں کے باب میں یہ نقطۂ نظر بالکل ناپید ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف قرآن نے متعین کر دیے ہیں۔ یہ اگرچہ نہایت وسیع ہیں لیکن اس کے باوجود کسی دور میں حکومت کے تمام تر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکے۔حکومت کو بعض ایسے کام بھی کرنے ہوتے ہیں جو خاص طور پر رعایا کے انہی طبقات کے لیے نہیں ہوتے جن کی نشان دہی قرآن مجید نے کی ہے۔ خصوصاً دورِ حاضر کی حکومتوں کے بعض اخراجات تو شرعی نقطہ نظر سے ناجائز بھی ہیں۔ اگر زکوٰۃ کو ایک ٹیکس قرار دے کر حکومت ہر طرح سے اسے اپنے استعمال میں لائے تو یہ قرآن کے احکام کی خلاف ورزی اور خدا کے متعین حق کا بے جا استعمال ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ گمان حقیقت پر مبنی نہیں کہ اسلامی ریاست کے ذرائع آمدنی میں زکوٰۃ ہی ایک واحد ذریعہ آمدنی ہے۔خلفائے راشدین کے عہد میں زکوٰۃ کے علاوہ جزیہ، خراج، فے [1]، خمس [2] اور سرکاری زمینوں کی آمدنی بیت المال کا حصہ بنتی تھی۔اس دور میں عشور یعنی درآمدی ڈیوٹی کا تصور بھی ملتا ہے۔ جزیہ، خراج اور عشور حقیقتاً اس دور کے ٹیکس ہی تھے جن کی شرحیں کم وبیش ہوتی رہتی تھیں۔حکومت اپنی ضروریات کے لیے مزید ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے۔ ایسے امور کا فیصلہ ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے مصالح کے تحت ہوتا ہے اور اسلام نے ان کو مباحات کے دائرے میں رکھا ہے۔ جب حکومت کی ضروریات کے لیے ٹیکس لگانے پر شریعت نے کوئی قدغن نہیں لگائی تو زکوٰۃ کو خواہ مخواہ ایک عبادت کے درجہ سے گھٹا کر عام ٹیکس قرار دے کر اس کی وقعت کو کیوں کم کیا جائے؟

جہاں تک تملیک زکوٰۃ کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کی بازگشت علماء کنونشنوں میں سنائی دیتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے انتہائی اہمیت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس رائے کی کوئی خاص دلیل نہیں مل سکی۔ علماء کے نزدیک تو جب تک زکوٰۃ دینے والا کسی فقیر کو اس کا مالک نہ بنا دے اس وقت تک اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ گویا تملیک کو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ایک شرط ہی نہیں بلکہ اس کا ایک رکن مان لیا گیا ہے۔ان کے نزدیک تملیک فقیر ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جس سے کسی امام فقہ کو اختلاف نہیں۔ جب یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر اسلامی حکومت کے عمال کس قاعدے سے زکوٰۃ وصول کرتے رہے ہیں جبکہ اس صورت میں تملیک فقیر نہیں پائی جاتی تو علماء نے اس کا یہ جواب دیا کہ

---

[1] فے: اچھی حالت کی طرف لوٹنا، وہ مال جو مسلمانوں کو کافروں سے جنگ کیے بغیر حاصل ہو۔

[2] خمس: پانچواں حصہ، مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ [3] تملیک: ملکیت میں دینا، حوالے کرنا

Marfat.com

ولایت عامہ ❶ حاصل ہونے کی بنا پر امام فقراء کا وکیل ہوتا ہے اور عمال اس کے نائب ہوتے ہیں۔ امام یا مصدق کا مال زکوۃ پر قبضہ کرنا فی الحقیقت فقراء ہی کا قبضہ ہوتا ہے۔

اس قاعدے کے تحت ملک کے اندر دوسرے رفاہی ادارے لوگوں سے زکوۃ وصول کرنے کے حق دار نہیں سمجھے جاتے کیونکہ انہیں ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سے دینی مدرسے چونکہ عامۃ المسلمین کے تعاون اور اموال زکوۃ ہی سے چل سکتے تھے اس لیے شرعی حیلہ نکالا گیا کہ مخیر حضرات زکوۃ کی رقم مدارس کے نادار طلبہ کو دیں تاکہ تملیک فقیر کا حق ادا ہو سکے۔ اس کے بعد یہ طلبہ مہتمم مدرسہ کو یہ رقم ہبہ کر دیں تاکہ وہ اسے مدرسہ کے انتظام و انصرام میں استعمال کر سکیں یعنی اس حیلہ شرعی سے تملیک فقیر کی شرط بھی پوری ہو جائے اور مدرسہ کو وہ مال بھی میسر آ جائے جس سے اس کے اخراجات پورے ہو سکیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی عبادت کا رکن قرار دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو۔ بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو عبادت کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ تملیک فقیر کے مسئلہ کو لیجیے تو اس کی واحد دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ سورہ توبہ کی آیت 60 ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ﴾ میں لفظ فقراء سے پہلے حرف لام آیا ہے اور یہ لام تملیک کے معنی دیتا ہے۔ اگر یہ استدلال اتنا زوردار ہوتا کہ یہ آیت اس کے لیے نص قطعی سمجھی جا سکتی تب تو یقیناً تملیک کو زکوۃ کا ایک رکن قرار دیا جا سکتا اور یہ دین میں حجت ہوتا لیکن امر واقعی یہ نہیں۔

جہاں تک محض حرف لام کا تعلق ہے، حروف کی مشہور کتابوں میں اس کے متعدد استعمالات بتائے گئے ہیں جن میں غالب استعمال علت، استحقاق، اختصاص اور عاقبت کے بیان کے لیے ہے۔ تملیک کے معنی میں لام کا استعمال بیان کیا گیا ہے لیکن بہت کم اور قرآن مجید میں اس معنی کی حامل کوئی آیت پیش نہیں کی گئی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو تملیک کے معنی میں لیا لیکن فقہائے احناف اور مالکیہ اسے لام عاقبت یا لام اجل (یعنی جو کسی چیز کے حتمی نتیجہ کو بیان کرے) کے معنی میں لیتے ہیں گویا فقہاء کے نزدیک یہ لام تملیک کے معنی کے لیے نص قطعی نہیں ہے۔

جب ایک حرف متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو ہر موقع کلام میں اس کا ہر معنی درست نہیں ہوتا بلکہ کلام میں کسی حرف کا استعمال اور خود کلام کا دروبست اور سیاق و سباق متعین کرتا ہے کہ وہ کون سے مفہوم پر دلالت کر رہا ہے۔ سورہ توبہ کی آیت 60 جس سیاق و سباق میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ بعض منافقین نبی ﷺ کو صدقات کی تقسیم کے بارے میں الزام دیتے تھے کہ آپ نے جانبداری اور ناروا پاسداری سے کام لیا۔ ان کی خواہش ہوتی کہ تقسیم میں وہ بھی حصہ پائیں۔ اس سیاق میں آیت إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ میں یہ بتایا کہ صدقات کی رقم کے اصلی حق دار فقراء، مساکین، غارمین ❷، مسافر، وغیرہ ہیں، ہر شخص یہ توقع نہ رکھے کہ اسے تقسیم میں لازماً حصہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں

---

❶ ولایت عامہ: عوام پر حکومت، جنرل اتھارٹی ❷ غَارِمِیْنَ: تاوان زدہ لوگ، قرض دار

Marfat.com

یہ بتانے کی کوئی افادیت نہیں کہ صدقات کی ادائیگی کے وقت فقراء کو ان کا مالک بنانا ضروری ہے، اس کے بغیر زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔ اگر افادیت ہے تو یہ بتانے کی کہ لوگوں کو حبِ مال میں مبتلا ہو کر فلاں فلاں مستحقین کا حق نظر انداز اور غصب نہیں کرنا چاہیے۔

''تملیک فقیر'' اگر شرط ہو سکتی تھی تو اس صورت میں جب زکوٰۃ کا مصرف صرف فقراء ہی کی امداد ہوتا اور قرآن وسنت نے کسی دوسرے مصرف کی نشان دہی نہ کی ہوتی۔ زکوٰۃ کے مصارف آٹھ قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ جب سات مصارف تملیک کی زد میں نہیں آتے تو پھر تملیک ادائیگی زکوٰۃ کی شرط یا اس کا رکن کیسے ہوئی؟

جو لوگ لِلْفُقَرَآءِ کے لام کو برائے تملیک سمجھتے ہیں وہ اگر قرآن کے الفاظ کا ساتھ دیں تو ان کا دعویٰ یہ ہونا چاہیے کہ تملیک زکوٰۃ چار قسم کے لوگوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ لِلْفُقَرَاءِ کا لام چار اقسام تک متعدی ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (التوبة: 60)

''صدقات تو بس محتاجوں، مسکینوں، عاملین صدقات اور تالیف قلوب [1] کے سزاواروں [2] کے لیے ہیں۔''

گویا انہی کی دلیل کی رو سے مبنی برقرآن مسلک یہ ہونا چاہیے تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فقراء، مساکین، محصّلینِ زکوٰۃ اور ان لوگوں کو جن کی تالیف قلب مقصود ہے زکوٰۃ کی تملیک کر دی جائے لیکن حیرت ہے کہ تملیک فقیر کو شرط قرار دینے والوں کی نگاہ لِلْفُقَرَاءِ پر ہی رک گئی۔ انہوں نے باقی تین اصناف کو نہیں دیکھا جو لام کے ہی تحت ہیں۔

باقی چار مصارف لام کے اثر سے آزاد ہیں اور حرف ''فِی'' (میں) کے تحت آتے ہیں یعنی ﴿وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ﴾ گویا غلاموں کی بہبود، تاوان زدوں کی امداد، نیکی کے جملہ کاموں اور مسافروں کی رفاہیت کے لیے تو بہر حال تملیک کی شرط نہیں ہو سکتی۔ جب اتنے مصارف لام کی پابندی سے آزاد ہیں تو تملیک فقیر کا شرط ہونا زکوٰۃ کا رکن کہاں رہا؟ کیا رکن ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو کسی حکم کی ادائیگی میں مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو! اور کیا ''فِی'' کے تحت بیان کردہ مصارف میں خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہو گی کیونکہ اس میں تملیک فقیر نہیں پائی جاتی۔

آیت کی اندرونی تالیف پر غور کیجیے کہ خود اس کے اجزا کی باہمی مناسبت کا تقاضا کیا ہے جیسا کہ واضح کیا گیا زکوٰۃ کے چار مصارف کا ذکر حرف لام کے تحت ہے اور باقی چار کا ذکر حرف فی کے تحت۔ کلام کا صحیح مدعا وہی ہو گا جو لام کے ساتھ بھی مربوط ہو اور فی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ یہ بات واضح ہے کہ حرف فی میں تملیک کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے اندر افادیت، خدمت اور مصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اگر لام کو تملیک کے لیے خاص کر لیا جائے تو آیت کے پہلے اور دوسرے حصے میں ہم آہنگی مفقود ہو جاتی ہے۔ ان کی ہم آہنگی اور حسن کلام کا تقاضا یہ ہے کہ لام کو بھی اس کے مشہور مفہوم استحقاق اور انتفاع [3] کے معنی میں لیا جائے تاکہ ایک ہی

---

[1] تالیف قلوب: دلوں کو جوڑنا، دلداری [2] سزاوار: حقدار، کے قابل [3] انتفاع: فائدہ حاصل کرنا، نفع اُٹھانا

Marfat.com

تقدیرِ کلام ① کے تحت پوری آیت کی تاویل ہو سکے۔

اس بات کے نظائر قرآن میں بکثرت موجود ہیں کہ حرف لام کو مستحقین کے استحقاق اور مال کے افادہ کے مضمون کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ الحشر میں مالِ فے کی تقسیم کے ضمن میں فرمایا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ﴾ (الحشر: 7)

''جو کچھ اللہ بستیوں والوں کی طرف سے اپنے رسول کی طرف لوٹائے تو وہ اللہ اور رسول اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

اس آیت میں حرفِ لام مال فے میں اللہ، رسول ﷺ، آپ ﷺ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا استحقاق ظاہر کرتا ہے۔ پھر معاشرے میں اس کے بعد خاص مستحقین کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ (الحشر: 8)

''یہ مال خاص طور پر ان محتاج مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی املاک سے نکالے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور رسول کی مدد کرتے ہوئے۔''

یعنی مال فے کے خاص مستحق وہ غریب مہاجرین ہیں جو اپنے گھر بار اور اموال چھوڑ کر محض اللہ کے دین کی نصرت کے لیے مدینہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کا فارمولا بیان کرتے ہوئے بھی حرف لام کو استحقاق ہی کے معنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ﴾ (الانفال: 41)

''اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

ان آیات کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مال فے اور مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کی تملیک اللہ اور رسول ﷺ اور فلاں فلاں لوگوں کو کرو۔ بس اس کے حق داروں کی نشان دہی کر دی گئی ہے کہ یہ حصہ ان پر خرچ ہونا چاہیے۔ اس مال پر ان کا حق ہے۔

خاص انفاق ② کے ضمن کی ایک اہم آیت سورۂ بقرہ میں ہے۔ فرمایا:

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰی وَ

---

① تقدیرِ کلام: کلام (متن) کا اندازہ ② انفاق: خرچ کرنا۔ اسی سے نان ونفقہ (روٹی اور خرچ) کی ترکیب بنی ہے۔

Marfat.com

﴿الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (البقرة: 215)

''وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو: جو مال بھی تم خرچ کرتے ہوتو وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

یعنی جو مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے وہ خدا کی جیب میں نہیں جاتا بلکہ اس کا فائدہ تمہارے ہی ماں باپ، خویش واقارب، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو پہنچتا ہے اور انہی کی خدمت پر یہ مال خرچ ہوتا ہے۔ یہاں لام انتفاع، افادہ اور خدمت کے معنی میں ہے۔ آیت میں والدین، قرابت داروں وغیرہ کو تملیک مال کا کوئی مضمون نہیں۔

انفاق کے ضمن کی دوسری اہم آیت بھی سورہ بقرہ ہی کی ہے۔ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (البقرة: 273)

''یہ مال ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل وحرکت نہیں کر سکتے، بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے۔''

اس آیت میں لام استحقاق کے لیے ہے اور معاشرے کے ایک حقیقی حاجت مند گروہ کی نشان دہی کر کے ان کی امداد کی ترغیب دی ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ تملیکِ فقیر کا زکوٰۃ کی شرط یا اس کا رکن ہونا تو کجا، سرے سے اس کی عمارت ہی بغیر کسی مضبوط بنیاد کے ہے۔ قرآن مجید نے مالیات سے متعلق تمام ہدایات میں لام کا استعمال کر کے یا تو معاشرے کے بعض طبقوں کا استحقاق واضح کیا ہے یا مال کی افادیت اور اس کی خدمت کا حوالہ دیا ہے۔ یہی صورت حال زکوٰۃ کی تقسیم سے متعلق سورہ توبہ کی آیت 60 میں بھی ہے۔ اس میں لام اور فی اسی مقصد سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان تمام مصارف زکوٰۃ میں سے جس مصرف میں بھی زکوٰۃ صرف کی جائے گی اس کی ادائیگی درست اور شریعت کے مطابق متصور ہوگی، اگرچہ اس کے لیے تملیک کا کوئی حیلہ اختیار نہ کیا گیا ہو۔ آیت میں اس بات کا قرینہ بھی موجود ہے کہ ایک اسلامی ریاست زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم کرے اور اجتماعی نظم کے تحت معاشرے کے تمام مستحقین تک زکوٰۃ کا فیض پہنچایا جائے تاکہ کوئی طبقہ اس سے محروم نہ رہے۔

ذکر کے ارکان

ذکر کے تین رکن ہیں۔ ایک ذکر الٰہی جو ہر چیز کی اصل ہے اور سب سے اوپر ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کو واحد مانتے ہوئے اسے یاد رکھا جائے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو یاد کیا جائے جو خلق، ہدایت اور ربوبیت کا مظہر ہیں۔ تیسرا مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو یاد رکھنا ہے۔ اور کمال ذکر یاد دہانی حاصل کرنا اور دین کی دعوت دینا ہے۔ (حمید الدین فراہی، تعلیقات سورۂ طٰہٰ)

Marfat.com

صدرِ اوّل کی تاریخ کے لیے چند رہنما نکات

رسالہ تدبر کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کی کتاب ''واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر'' کا تعارف کرایا تھا۔ ❶ ہمارے ایک قاری نے یہ استفسار کیا ہے کہ اس واقعہ کے بارے میں تدبر کا اپنا موقف کیا ہے۔ یہ واقعہ امت مسلمہ کے اندر اختلاف کی جڑ ہے اور اس کی توجیہات کی بڑی بہتات ہے۔ اس لیے لوگ وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں استفسارات کرتے رہتے ہیں۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث کا موضوع تاریخ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم تاریخ کے مسائل کے بارے میں تحقیق کے دعویدار نہیں ہیں۔ تاہم ہماری رائے میں صدر اول کی تاریخ کے بارے میں بنیادی راہنمائی خود قرآن و سنت سے مل جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اگر مورخین کے بتائے ہوئے ان امور پر غور کیا جائے جن پر ان کا اجماع ہے تو ہمارے خیال میں حق سے قریب تر نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند نکات کا تذکرہ کرتے ہیں:

1۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ مقام حاصل ہے کہ آپ کے فرضِ رسالت کی کامیابی کے ساتھ تکمیل اور دوسرے ادیان پر غلبہ کی خبر خود قرآن نے دی ہے۔ تیئس برس کی محنت کے بعد آپ نے انسانوں کی وہ جماعت تیار کی جو قرآن کے الفاظ میں کفار کے لیے بے حد سخت اور اہل ایمان کے لیے نہایت شفیق تھی۔ اس کی تمام جدوجہد کا مقصد اللہ کی رضا کی تلاش تھی، ایمان کی نورانیت ان پاکیزہ انسانوں کی جبینوں سے ہویدا تھی اور ان کے شب و روز خدا کی محبت میں رکوع و سجود میں بسر ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن کو ماننے والا کوئی شخص کسی ایسے نقطۂ نظر کو نہیں مان سکتا جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جماعت کو اسلام کی باغی یا ایمان سے خارج بتایا گیا ہو۔ ایسا نقطۂ نظر مان لینا رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ اپنے فرضِ رسالت میں ناکام ماننے کے مترادف ہے۔

2۔ قرآن مجید نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سابقوں اولون ❷، مہاجرین، انصار اور بعد میں اسلام لانے والوں کے الگ الگ درجات بیان کیے ہیں۔ پہلے گروہوں کی بطور خاص تحسین فرماتے ہوئے خبر دی ہے کہ اللہ ان کے حسن کارکردگی کے باعث ان سے راضی ہو گیا۔ ان کا صلہ اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ قرآن کے اسی بیان کی روشنی میں صدرِ اول کی اسلامی حکومت اور عوام دونوں نے جماعتِ صحابہ کے ان طبقات کے ساتھ ہمیشہ خاص معاملہ کیا اور ان کے اکرام ❸ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے بارے میں یہی صحیح رویہ ہے۔ اللہ کے

---

❶ رسالہ تدبر، شمارہ نمبر 39، مئی 1992ء۔ ❷ سابقون اوّلون: قبولِ اسلام میں پہلے سبقت کرنے والے
❸ اکرام: عزت (کرم) کرنا

Marfat.com

ان کے منظورِ نظر اور نبی ﷺ کے معتمد علیہ ساتھیوں کے ساتھ اس کے برعکس کوئی رویہ اختیار کرنا خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ دشمنی ہے۔

3۔ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ وحی الٰہی کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ اگر کبھی وہ جانب حق میں بھی کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو وحی کے ذریعے ان کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ انبیاء کے سوا اور کسی کو، خواہ اس کا تعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہو یا صلحاء و ابرار [1] سے، وحی کا یہ تحفظ حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ معصوم نہیں ہیں اور ان سے اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ ان کے افعال کے لیے کسوٹی قرآن وسنت ہی ہے۔

4۔ تاریخی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار سابقون اولون میں ہے اور اسلام کے لیے ان کی خدمات نہایت شان دار ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے قبل اسلام اور ہجرت سے مشرف ہوئے، کتابت وحی کی عزت سے سرفراز ہوئے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے رومیوں پر اسلام کی دھاک بٹھائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان کا شمار صغار صحابہ میں ہے جن کو عالم شعور میں نبی ﷺ کی تربیت میں رہنے اور آپ ﷺ کے ہمراہ دین کے لیے جدوجہد کا موقع نہیں ملا۔ یہ جب سن رشد کو پہنچے تو اسلامی مملکت مستحکم ہو چکی تھی۔ ان اہم شخصیات کے معاملات پر غور کرتے وقت ان کے فرقِ مراتب کو نگاہ میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔

5۔ مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مملکت اسلامیہ میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو گیا تھا۔ منصب قضاء پر فائز لوگوں کا انتخاب اہل علم وتقویٰ میں سے ہوتا۔ پورے دور بنی امیہ میں اسلامی قانون نافذ رہا اور اس سے کوئی انحراف نہیں ہوا۔ لہٰذا اس دور میں حکومت کے ساتھ کفر واسلام کے معرکے پیش آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اگر شریعت سے انحراف کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہوتی تو اموی دور کے دو تہائی عرصہ تک بڑے جلیل القدر صحابہ ابھی زندہ تھے۔ ان کا وجود اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے سامنے کسی حکومت سے کفر بواح [2] کا صدور نہیں ہوا ورنہ وہ اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کرتے۔

6۔ حکومت میں باپ کے بعد بیٹے کا جانشین ہونا خلافِ شرع نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی جانشینی کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بھی رکن نامزد کیا تھا۔ وہ مشورہ میں شریک تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ایسا کرنا خلافِ شرع ہوتا بلکہ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بقول بارِ خلافت کی جواب دہی کے لیے خاندان بنی عدی میں سے تنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کافی تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانشینی کے لیے ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا، حالانکہ ان سے اہل تر اور تجربہ کار معمر صحابہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

7۔ خاص واقعہ کربلا میں اس امر پر مورخین کا اتفاق ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ جانے سے متعدد صحابہ نے اختلاف کیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ خدانخواستہ اسلام کے بہی خواہ نہ تھے بلکہ دین کے وفادار و جانثار

---

[1] صلحاء وابرار: صالح اور نیک لوگ، بر (نیک) کی جمع ابرار ہے۔

[2] کفر بواح: کھلا کفر

Marfat.com

خادموں کی نگاہ میں حقائق وہ نہیں تھے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بتائے گئے تھے۔

8۔ اصل صورت حال سے مطلع ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا تین شرائط پیش کرنا بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اقدام کو کفر و اسلام کے معرکہ کی حیثیت نہیں دے رہے تھے بلکہ اب وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے تھے جس میں مبتلا کیے گئے تھے۔ ورنہ کفر کے مقابل میں اسلام کے حق میں اٹھایا ہوا قدم واپس لینے کے کیا معنی!

9۔ جس دور میں واقعہ کربلا پیش آیا اس زمانے کے لوگوں نے اس کو کبھی کفر و اسلام کی آویزش کے رنگ میں نہیں دیکھا بلکہ اس کو ایک افسوس ناک حادثے کی حیثیت دی۔ اس حیثیت کا تعین کرنے والوں میں بڑے جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔

ہمارے خیال میں اس پر آشوب دور کے ہر اس مورخ کی تحقیق یقیناً قابل قدر ہے جو مذکورہ بنیادی حقائق، جو قرآن وسنت کے نصوص [1] اور مورخین کے اجماع پر مبنی ہیں، کا لحاظ کر کے حقیقت کو دریافت کرنے کی سعی کرے۔ ان حقائق سے ہٹ کر جب ہم کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو یہ امت کے اندر تفرقہ اور انتشار کا باعث ہوتی ہے۔

سورتوں کے نام اور ان کے عمود

1۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی الفاظ سے رکھ دیے گئے ہیں۔ یہود کے یہاں بھی اسی اصول پر صحیفوں کے نام رکھے گئے تھے۔

2۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ پر رکھ دیے گئے ہیں جو ان سورتوں میں استعمال ہوئے ہیں اور نمایاں ہیں۔ مثلاً زخرف، شعراء، حدید، ماعون وغیرہ۔ یہ الفاظ سورہ کے مقصد کو نہیں ظاہر کرتے بلکہ سورہ کے اندر بطور ایک نمایاں نشان اور علامت کے ہیں جو اپنے مسمی کو ممتاز کرتے ہیں۔ اہل عرب اسی اصول پر اشخاص اور اشیاء کا نام رکھتے تھے۔

3۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ سے ہیں جو سورہ کے کسی اہم مضمون کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً سورہ نور کا نام آیت نور کی وجہ سے ہوا۔ آل عمران، سورہ نساء، سورہ ابراہیم، سورہ یونس وغیرہ بہت سے اسماء اسی طریق پر ہیں۔

4۔ بعض سورتوں کے نام ان کے اس مقصد کے لحاظ سے ہیں جو سورہ میں روح کی طرح جاری وساری ہے...... اگر ہر سورہ کا نام اسی اصول پر ہوتا تو اہل نظر کے لیے ہر سورہ کا نظام واضح ہو جاتا۔

(حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، تفسیر نظام القرآن، ص 61-62، ص: 49، ص 85)

[1] نصوص: نص کی جمع، قطعی احکام، قرآنی آیات جو اپنے معنی اور مطلب واضح طور پر ظاہر کریں۔

Marfat.com

مشاہداتِ حج

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس سال حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ پاکستان سے حج پروازیں 10 مارچ 97ء سے شروع ہو کر 11 اپریل 97ء تک جاری رہیں۔ میری روانگی 11 مارچ اور واپسی 23 اپریل کے شیڈول سے ہوئی۔ مدینہ منورہ میں قیام 14 مارچ کی صبح سے 22 مارچ کی صبح تک رہا۔ 22 مارچ کو صبح نو بجے مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مغرب کے وقت مکہ مکرمہ پہنچے۔ اس طرح مدینہ شریف کے قیام کے دوران جمعہ کی دو نمازیں پڑھی گئیں، نیز شاہراہ ہجرت کو دن کی روشنی میں دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ مدینہ میں قیام مسجد نبوی سے دو منٹ کے فاصلہ پر ایک عمارت قصر انس میں تھا جبکہ مکہ مکرمہ میں ہماری عمارت محلّہ شامیہ میں جبل ہند کی چوٹی پر واقع تھی۔ بلندی سے قطع نظر حرم شریف تک پہنچنا آٹھ دس منٹ میں ممکن ہوتا تھا۔ سفر حج کے پورے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بیماری کا حملہ نہیں ہوا، اس لیے عبادات ومناسک کی ادائیگی پوری یکسوئی، دل جمعی اور اہتمام کے ساتھ ممکن ہوئی۔ الحمد لله علی ذلك.

حج ایک عظیم عبادت ہے۔ اس میں جو مال خرچ کرنا پڑتا یا سفر کی جو صعوبت اٹھانی پڑتی ہے وہ تو ہر شخص کو نظر آنے والی چیز ہے لیکن اس میں زندگی کے معمول سے ہٹ کر جو مناسک ادا کیے جاتے ہیں اور جو حج کو ایک منفرد عبادت بناتے ہیں، ان سے بالعموم ہمارے لوگ واقف نہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی عبادات میں شامل نہیں ہیں لیکن حج کی عبادت کا لازمی جزو ہیں۔ پھر یہ عبادت اس مقام پر کی جاتی ہے جہاں امت مسلمہ کا قبلہ واقع ہے۔ ساری عمر ہماری نمازیں اس قبلہ کے رخ پر ادا ہوتی ہیں جبکہ حج میں آدمی قبلہ کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبلہ کا یہ قرب عبادت کو ایک نئے کیف سے آشنا کرتا ہے جس کا حصول کسی بھی دوسرے مقام پر ممکن نہیں ہے۔

حج کے مناسک کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دین کے اعلیٰ تقاضوں اور مقاصد کو علاماتی شکل میں سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ بیت اللہ، اس کے گرد ونواح کے مقامات اور اس سے متعلق چیزوں کے لیے شعائر اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی وہ چیزیں جو اہم حقائق کا شعور بیدار کرنے کے لیے بطور علامت رکھ دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ جو اعمال وابستہ ہیں وہ اصل میں قالب ہیں جن کے اندر روح وہ حقیقت ہوتی ہے جس کا احساس دلانا مقصود ہے۔ مثال کے طور پر کعبہ کو بیت اللہ یعنی علامتی طور پر اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔ یہ عرش الٰہی کی علامت ہے۔ جس طرح مقربین فرشتے عرش الٰہی کو گھیرے میں لیے ہوئے اللہ رب العزت کی تسبیح وتحمید

Marfat.com

میں مشغول رہتے ہیں اسی طرح زمین پر اللہ کے بندے اس گھر کا طواف کر کے اور اللہ کی حمد و تسبیح بیان کر کے مقرب فرشتوں کے ساتھ ہم نوا ہوتے ہیں۔ کعبہ محض پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ایک مکان نہیں بلکہ امت مسلمہ کا مرکز عبادت و عقیدت ہے۔ یہ فلاح و سعادت کے حصول کے لیے ایک نشان ہے جس کی طرف لپکنے اور سبقت کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اس گھر کی تاریخ عظیم روایات کی امین ہے۔ یہ دنیا کے بت کدے میں خدا کی توحید کا پہلا مرکز ہے۔ اس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے اسلام کی حقیقت کو اپنے عمل سے ظاہر کرنے والی جلیل القدر شخصیات ہیں جن کی عبدیت پر گواہ اللہ کا کلام ہے۔ اپنی تعمیر کے دن سے لے کر آج تک یہاں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ ان کا شمار اسی طرح ناممکن ہے جس طرح آسمان کے ستاروں کا شمار کسی کے بس میں نہیں۔ کعبہ کے ایک کونے میں لگے ہوئے حجر اسود کا استلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کے عہد کا مظہر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک عاصی بندہ جب اپنے ایمان کا حقیر سرمایہ لے کر بیت اللہ کے روبرو پہنچتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ نہ اس کو اپنے ہاتھ پاؤں میں سکت محسوس ہوتی ہے اور نہ جذبات پر قابو رہتا ہے۔

خانہ کعبہ سے متعلق دوسرے شعائر کے ساتھ بھی اسی طرح کی حقیقتیں وابستہ ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کس بات کی یادگار ہے؟ اگر اس کی عام توجیہ قبول کی جائے کہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ نے اپنے بچے اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی تو یہ سعی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پیش آنے والی مشکل کے حل کے لیے سرگرمی دکھانے کا سبق دیتی ہے۔ اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ مروہ، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے معلوم ہوتا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا اصل مقام ہے۔ اللہ کے حکم قربانی کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دوڑ دھوپ کی، صفا و مروہ کی سعی اس کی یادگار ہے۔ ان دونوں توجیہات کی روشنی میں عبدیت کے اظہار میں سرگرمی اور تگ و دو کی حقیقت ان شعائر سے وابستہ ہے۔ منیٰ میں جانور قربان کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی عملی یادگار منائی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ قربانی کے جانوروں کو بھی شعائر اللہ میں شمار کیا گیا ہے۔

رمی جمرات میں علامتی شیطانوں پر تین چار روز برابر سنگ باری کی جاتی ہے۔ سنگ سار کرنا لعنت کرنے کے مترادف ہے۔ رمی جمرات میں جو حقیقت پیش نظر ہونی چاہیے وہ یہ عزم ہے کہ ہم بیت اللہ کے دشمنوں اور ہر طرح کے شیطان صفت لوگوں پر لعنت کرتے ہیں۔ ہم ان کا راستہ روکیں گے اور اس راہ میں عملی جہاد کریں گے۔ نیز کافر اگر ہمارے قبلہ کی جانب میلی آنکھ سے دیکھیں گے تو ہم، پوری ملت، یک جان ہو کر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے قبلہ کا دفاع کریں گے۔

اس جہاد کی عملی مشق منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منیٰ تک ایک ایسے سفر کے ذریعے سے

Marfat.com

کرائی جاتی ہے جو کوچ اور قیام کے نظام الاوقات کے حوالے سے فوج کے مارچ سے مشابہ ہے۔ اس میں اسی طرح کی سختیاں برداشت کرنی ہوتی ہیں جیسی سختیاں ایک فوج برداشت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے لیے حج کو جہاد ہی کے درجہ میں رکھا گیا ہے۔

حرم شریف کی حدود میں اور مناسک حج کے ادا کرتے وقت جب آدمی بیسیوں قومیتوں کے لاکھوں انسانوں کو ایک ہی رب کے سامنے سجدہ ریز دیکھتا اور ان پر ایک ہی دھن سوار ہونے کا مشاہدہ کرتا ہے تو فی الواقع اسے اپنے رب کی کبریائی اور ملت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اس ملت کا ایک فرد ہے۔ اسے بار بار حضوری کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے مالک سے قریب محسوس کرتا ہے۔ اسے رب سے مناجات میں دلی تسکین ملتی ہے اور دیکھا جائے تو اس سفر کا اصل حاصل یہی چیزیں ہیں۔

حرمین شریفین کی عمارتوں کا شکوہ، ان کا حسن انتظام، حجاج کی ضرورتوں کا لحاظ، سب چیزیں ایک زندہ ملت کے شایان شان ہیں۔ شرک و بدعت کے مظاہر سے حرم شریف کو پاک رکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے اور طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ (میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا) کی وہاں عملی تفسیر مشاہدہ میں آتی ہے۔ یہ اللہ رب العزت کا اس امت پر خاص انعام ہے کہ اس نے اسے اپنے قبلہ کو مظاہر شرک سے پاک رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ حسن انتظام کا عظیم مظاہرہ ایام حج میں، جب لگ بھگ تیس لاکھ انسان ایک ہی جگہ جمع ہو جاتے ہیں، دیکھنے کو ملتا ہے کہ نہ وہاں پانی اور خوراک کی کمی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، نہ صفائی کا۔ اتنے انسان نہایت محدود وقت میں ایک سے دوسرے مقام تک متحرک ہوتے ہیں اور سب اپنے مناسک ادا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہم اس صورت حال کا مقابلہ جب اپنے ملک کے انتظام سے کرتے ہیں، جہاں اگر کسی سیاسی لیڈر کا جلسہ ہوتا ہے تو دو دو گھنٹے ٹریفک جام ہو جاتی اور شاہراہوں پر کئی کئی میل تک گاڑیاں رک جاتی ہیں، تب احساس ہوتا ہے کہ سعودی حکومت نے کس قدر عرق ریزی کے بعد اتنے بڑے مجمع کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کا اہتمام کیا ہوگا۔

سعودی حکومت کے حسن انتظام کے باوجود بہت سے مسائل محض ازدحام کے باعث پیدا ہوتے ہیں یا پھر حجاج کی مناسک حج سے بے خبری ان کا باعث ہوتی ہے جس کی ذمے داران حجاج کو حج پر بھیجنے والی حکومتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ دور دراز کا اتنا پرمشقت سفر اس بات کا متقاضی ہے کہ حج کے لیے آنے والے جسمانی طور پر صحت مند، توانا اور ذہنی طور پر حج کے مقاصد سے آگاہ، اس کے مناسک سے باخبر اور ان کو ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ حجاج کی بہت بڑی تعداد نحیف و نزار بوڑھوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو شائد اپنے ملک میں بین الاضلاعی سفر پر بھی تنہا روانہ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ بوڑھے یا تو بیماریوں کا شکار ہو کر کسی گوشے میں پڑے رہتے ہیں یا ہجوم میں شامل ہو کر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ مناسک حج ادا کرنا تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ شریعت نے حج کے لیے استطاعت کی جو شرط عائد کی ہے حجاج کی یہ قسم ہرگز اس پر پوری نہیں اترتی۔ بالعموم یہ بوڑھے (مرد اور عورت دونوں) اپنی مرضی یا شوق سے

Marfat.com

نہیں بلکہ اولاد کے بھیجے ہوئے آتے ہیں۔ اولاد کو نئی دولت ہاتھ آتی ہے تو وہ اپنے ضعیف والدین کو حج کروا کر اپنی سعادت مندی کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن عملاً یہ دیکھا گیا ہے کہ ان بوڑھوں کو وہاں جب دھکم پیل سے واسطہ پڑتا ہے تو یہ حج پر بھیجنے والوں کو گالیاں اور بددعائیں دیتے ہیں اور مناسک حج کو ادا نہیں کرتے۔ حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حج کے درخواست دہندگان کا اس پہلو سے معائنہ کروائے اور بشرط صحت و توانائی ان کو حج پر بھیجے۔

جہاں تک ذہنی تیاری اور مناسک سے باخبری اور حج کی عبادت کے شعور کا تعلق ہے ہمارے ملک کی عظیم تعداد اس سے بالکل تہی دامن ہوتی ہے۔ اپنے ملک میں مقبروں اور آستانوں سے عقیدت رکھنے والوں کا تصور دین یہ ہوتا ہے کہ حرم شریف میں پہنچ کر انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیت اللہ کیا چیز ہے اور اس کا کیا مقام ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی ولی اللہ کا مزار ہے اور پوچھتے ہیں کہ اس کا دروازہ کب کھلے گا۔ بعض لوگ بیت اللہ کا طواف کر لینے کے بعد یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان کا حج مکمل ہو چکا۔ کچھ لوگوں نے سن رکھا ہوتا ہے کہ حج میں کنکریاں بھی پھینکی جاتی ہے۔ وہ حرم شریف میں یہ سوال کرتے پائے گئے کہ یہاں کنکریاں کب پھینکی جائیں گی۔ گویا انہیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ حج مخصوص ایام میں ادا کیا جاتا ہے، ان ایام میں انہیں مکہ سے باہر جانا ہوگا اور وہاں یہ مناسک ادا کرنے ہوں گے۔ دین سے بے خبری کا ایک مظاہرہ یوں ہوتا ہے کہ لوگ مقام ابراہیم کے شیشے کو چومتے اور اس سے لپٹتے ہیں اور خدام حرم کے باصرار روکنے کے باوجود اس حرکت سے باز نہیں آتے۔

مشکل مناسک کے ادا کرنے کے لیے عدم آمادگی منیٰ کے قیام کے دوران بار بار سامنے آئی۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ان ایام کو مصیبت سمجھنے لگتے ہیں۔ رمی جمار کے لیے ہجوم میں جانا انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ رمی کے اوقات کا لحاظ ان کے لیے سوہان روح [1] ہوتا ہے۔ ایک دنیا ایسی ہوتی ہے کہ اگلے دن کی رمی سے اس سے پہلی رات کے کسی وقت فارغ ہو جاتی ہے۔ پھر ایک ایک آدمی اپنے کتنے ہی ساتھیوں کی طرف سے کنکریاں پھینک کر آ جاتا ہے۔ خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کام سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر کے واپس مکہ کے آرام دہ ماحول میں پہنچا جائے۔ معلم حضرات حجاج کی اس بے تابی سے واقف ہیں۔ وہ بارہ ذوالحجہ کو دوپہر بارہ بجے کے فوراً بعد خیمے اکھڑوانا شروع کر دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص مسنون طریقہ پر تیرہ تاریخ کی رمی کرنے کا خواہش مند ہو تو وہ اس کے لیے کوئی سہولت مہیا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پانی کے کنکشن کاٹ دیے جاتے ہیں۔ بجلی کی رو منقطع کر دی جاتی ہے اور آدمی کو بے بس کر دیا جاتا ہے کہ وہ منیٰ میں مزید قیام نہ کر سکے۔ مکتبوں میں لاؤڈ سپیکر کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ اگر حجاج کو اس کی مدد سے احکام حج اور ان پر عمل کے صحیح طریقوں سے بار بار آگاہ کیا جاتا رہے تو بہت سے لوگ مناسک صحیح وقت پر درست طریقہ سے ادا کر سکیں گے۔ رمی جمار کے موقع پر اگر مختلف زبانوں میں ہجوم کو پرسکون رہنے اور آرام سے رمی کرنے کی ہدایات لاؤڈ سپیکر سے برابر دی جاتی رہیں تو اس مشکل کام کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔

اس سال حجاج کی تعداد میں پہلے کی نسبت اضافہ کی اجازت دے دی گئی تھی اس لیے ایام حج سے بہت پہلے

---

[1] سوہانِ روح: روح کی ریتی، نہایت تکلیف دہ

Marfat.com

حرم شریف میں ازدحام کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ حرم شریف کا وسیع صحن طواف کے لیے بالعموم تنگ پڑ جاتا ہے اور لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ برآمدے یا اوپر کی منزلوں پر جا کر طواف کریں۔ بظاہر نظر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ جتنی تعداد صحن مسجد میں طواف کر رہی ہے اسی کے لگ بھگ تعداد اوپر بھی مصروف طواف ہے۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں دو چیزوں کو دخل تھا۔ ایک تو عرضی رخ پر صحن مسجد کی تنگ دامنی اور دوسری حجر اسود کی سمت کی نشان دہی کے لیے فرش پر بنائی گئی پٹی کا غلط استعمال۔ صحن مسجد شرقاً غرباً تو کافی وسیع ہے لیکن شمالاً جنوباً اس کا عرض کم ہے۔ عام حالات میں طواف کے لیے یہ عرض بالکل کافی ہے لیکن حج کے مہینوں میں رش کے اوقات میں شمالی اور جنوبی برآمدوں کا وسطی حصہ طواف میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور خواہش ہوتی ہے کہ حکومت اس حصے کو چند محرابوں کی قربانی دے کر صحن میں شامل کر دے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو بہت بڑی تعداد برآمدوں میں طواف کرنے سے بچ سکتی ہے جو ظاہر ہے کہ طواف کے مقصد کے لیے نہیں بنائے گئے اور وہاں تعمیر کی ہیئت اور نمازیوں کے ہجوم کے باعث رکاوٹیں بھی بے پناہ ہوتی ہیں۔ جہاں تک حجر اسود کی سمت کا تعین کرنے والی پٹی کا تعلق ہے، دین سے بے خبر حجاج ٹھیک اس پٹی پر نماز ادا کرنے لگتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیت اللہ کے رخ پر نماز پڑھنا کافی نہیں سمجھتے بلکہ حجر اسود کو سجدہ کرنا افضل سمجھتے ہیں۔ اس عمل میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ مزید برآں لوگ استلام [1] کے طریقہ سے بھی واقف نہیں ہوتے اور پٹی پر کھڑے ہو کر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے اشارے پر اشارے شروع کرتے ہیں تو وہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ حالانکہ استلام کعبہ کی جانب بغیر رخ پھیرے محض ایک اشارے سے ہوتا ہے۔ طواف کے دوران عملاً استلام کرنے والوں کی ایک دیوار پٹی پر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے باعث طواف بالکل رک جاتا اور رکن یمانی اور رکن حجر اسود کے درمیان ہجوم بالکل پیک ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کی آسان ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ پٹی کو پانچ چھ فٹ چوڑا کر دیا جائے تا کہ اس پر دیوار کی صورت پیدا نہ ہونے پائے اور طواف کرنے والے اپنا راستہ بنانے میں دشواری محسوس نہ کریں۔

طواف کے دوران ایک غیر معمولی رکاوٹ وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو مقام ابراہیم سے متصل زبردستی کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے لگتے ہیں۔ انہوں نے کتابوں میں پڑھ رکھا ہوتا ہے کہ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کرنے سے طواف کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ اس کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ ہجوم کے بے پناہ رش کے باوجود انہیں یہ دو رکعتیں مقام ابراہیم کے عین پیچھے پڑھنی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک شخص نے نماز شروع کر دی تو دو آدمی اس کی حفاظت کے لیے ہجوم کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ تحفظ میسر آ جاتا ہے تو دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں۔ اس طرح بسا اوقات دو تین صفیں بن جاتی ہیں۔ طواف کرنے والے اس صورت حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خود گرتے ہیں اور کبھی ان نمازیوں کو گراتے ہیں۔ اس حصے میں بلاوجہ کشمکش اور دھکم پیل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدام حرم لوگوں کو مسلسل بتاتے ہیں کہ یہ دو رکعت نماز مسجد کے کسی حصے میں بھی ہجوم سے ہٹ کر پڑھی جا سکتی ہے لیکن لوگ ہیں کہ اس مسئلے کو ذہن سے نکالنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو ان کے ذہنوں میں بٹھا دیا

---

[1] استلام: حجر اسود کا عملاً یا اشارے سے بوسہ لینا

Marfat.com

گیا ہے۔ اس صورت حال میں حرم شریف کی انتظامیہ کے لیے بالکل مناسب ہوگا کہ وہ مقام ابراہیم کو اس کی موجودہ جگہ سے اٹھا کر آٹھ دس میٹر اور پیچھے لے جا کر نصب کر دے۔ تاریخ میں پہلے بھی مطاف میں وسعت کے لیے یہ اقدام کیا گیا ہے اور اس وقت پھر ضرورت ہے کہ طواف کی اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے یہ تبدیلی عمل میں لائی جائے۔

حرم شریف بے حد وسیع عمارت ہے۔ کچھ لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مسجد میں نماز کے لیے جائیں تو زیادہ آگے نہ بیٹھیں تاکہ نماز کے اختتام پر فی الفور مسجد سے نکلنا ممکن ہو۔ یہ لوگ حرم شریف کے دروازوں کے اندر داخل ہوتے ہی بیٹھ جاتے اور بعد میں آنے والوں کے لیے بے پناہ رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ آگے صفیں خالی ہوتی ہیں۔ دروازوں کے اندر راستوں کو کھلا رکھنا انتظامیہ کا کام ہے۔ اس مقصد کے لیے دروازوں پر تعینات آدمی بالکل ناکافی تھے۔ موسم حج میں یہ نفری زیادہ ہونی چاہیے تاکہ نماز کے وقت تک راستے اندر تک کھلے رہیں اور نمازی ان پر بیٹھنے نہ پائیں۔

حرم کی انتظامیہ کی اس بات کی حکمت سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ حجر اسود کے بوسے کے لیے قطار بنوانے کا طریقہ کیوں استعمال نہیں کرتی۔ ہر حاجی کی خواہش بلکہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ قیام کے دوران کم از کم ایک مرتبہ حجر اسود کا بوسہ لے لے۔ لیکن وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس تمنا کے بر آنے کے لیے نہ صرف زور بازو کی ضرورت ہے بلکہ زور بازو کو استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔ حجاج کی بڑی تعداد میں یہ زور ہوتا ہی نہیں، اگر ہوتا ہے تو عین بیت اللہ کے سائے میں کچھ لوگ اس کا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ لہٰذا حجر اسود پر زور آوروں کا قبضہ رہتا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی مقابلہ، جس میں کپڑے پھٹ سکتے اور ذاتی اشیاء بکھر سکتی ہیں، کے بعد بوسہ لیتے ہیں اور برابر لیتے رہتے ہیں۔ یہ طرز عمل کسی بھی سنجیدہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ حرم شریف میں ہر شخص کا رویہ باوقار اور حلیمانہ ہونا چاہیے۔ حجاج کو قطار بنانے پر مجبور کرنے کے لیے حجر اسود کے سامنے کی جانب مضبوط پائیوں کا ایک جنگلہ لگانا کافی ہے تاکہ سامنے سے کوئی حملہ آور نہ ہو سکے۔ جنگلے کے اندر داخلہ کے مقام پر دو سپاہی ڈیوٹی دیں اور لوگوں کو اس کے اندر قطار بنا کر داخل کریں۔ اس انتظام سے نہ صرف ہر طرح کے حاجیوں کی تمنا بر آنے کا امکان پیدا ہو جائے گا بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد حجر اسود کا بوسہ لے سکے گی جتنی اب لیتی ہے۔

اپنے ماحول سے نکل کر ایک نئے ماحول میں پہنچنے والے حجاج کے لیے معلم یا مطوف کے ادارہ کا رول خاصا اہم ہے۔ وہ ان کے لیے پہلے سے رہائش اور ٹرانسپورٹ کا انتظام کرتا اور ان کے جدہ اترنے کے بعد ان کے معاملات کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ منیٰ اور عرفات میں ان کے لیے خیمے مہیا کرنا، رہائش کی تمام سہولتیں فراہم کرنا، مدینہ منورہ لے جانا، وہاں قیام کا بندوبست کرنا اور واپس مکہ پہنچانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ تمام کام اگر ہر شخص کو انفرادی طور پر کرنے پڑیں تو وہ انہی میں الجھا رہے اور عبادات کے لیے یکسوئی حاصل نہ کر سکے۔ یہ دیکھا گیا کہ معلم کا ادارہ وہ کام تو بڑی مستعدی سے کرتا ہے جن کے لیے یہ حکومت کے سامنے جوابدہ ہے لیکن ان کاموں سے پہلو تہی

Marfat.com

کرتا ہے جن کا تعلق صرف حجاج سے ہو اور ان میں حکومت کا دخل نہ ہو۔ عملاً یہ ہو رہا ہے کہ مطوفین اپنے اپنے کوٹہ کے مطابق حجاج کی ایک بڑی تعداد حاصل تو کر لیتے ہیں لیکن عمومی انتظامات کے علاوہ نہ ان کو کوئی سہولت پہنچاتے اور نہ ان سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ایام حج میں ٹرانسپورٹ کا انتظام اتنا ناقص تھا کہ عرفات سے کئی لوگ رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد پرائیویٹ گاڑیوں کو بھاری کرائے ادا کر کے نکل سکے لیکن معلم کی گاڑیاں میسر نہ تھیں۔ اسی طرح مزدلفہ سے منٰی لانے کا ان کے لیے کوئی انتظام نہ تھا۔ حالانکہ معلم حضرات اس مرتبہ 150 ریال فی کس ایام حج میں ٹرانسپورٹ کی مد میں وصول کر چکے تھے۔ پہلے یہ رقم مکہ جا کر معلم کے پاس جمع کرائی جاتی تھی اور بہت سے لوگ چونکہ معلموں کی کارگزاری کا علم رکھتے ہیں اس لیے وہ منٰی و عرفات جانے کے لیے خود انتظام کرنے کو ترجیح دیتے اور معلم کی سہولت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ اس مرتبہ معلوم نہیں حکومت پاکستان نے کیوں یہ رقم خود ہی کاٹ کر معلموں کے حوالے کر دی جبکہ اس بات کا اہتمام نہیں کیا گیا کہ وہ معلم حجاج کو ٹرانسپورٹ لازماً مہیا کریں۔

منٰی میں جب آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا تو معلم کے نمائندے کہیں نظر نہیں آتے تھے حالانکہ میرا مکتب آگ کے موقع سے خاصا دور تھا اور اس کی جانب آگ بڑھ بھی نہیں رہی تھی۔ مکتب کو خالی کرنے کی باقاعدہ ہدایت نہ دی گئی بلکہ خیمہ گرا دینے پر اکتفا کیا گیا اور لوگوں نے معاملہ کو سمجھتے ہوئے خود ہی مکتب خالی کر دیا۔ ہماری طرف آگ کے خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے کھلا میدان جمرات کا نواح تھا۔ تقریباً چار گھنٹے اس میدان میں گزرے۔ جمرات کے پل کے نیچے حجاج کے قیام کو ناممکن بنانے کے لیے وہاں فوج کا پہرا لگا دیا گیا تھا اور سپاہی کسی شخص کو وہاں گھسنے نہیں دے رہے تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا اور یہ ایک قابل تحسین فیصلہ تھا لیکن آتش زدگی کے دوران لوگوں کا تھوڑی دیر کے لیے پل کے سایہ میں ستانا ایسی چیز نہیں تھی جسے ممنوع سمجھا جاتا۔ عجیب بات ہے کہ حکام اعلیٰ نے چند گھنٹوں کے لیے اس سایہ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی اور ایک جم غفیر سہ پہر کی تیز دھوپ میں آگ ٹھنڈی ہونے کا منتظر رہا۔ اس عمل میں تقریباً چار گھنٹے صرف ہوئے۔

مجموعی طور پر سفر حج نہایت خوشگوار اور روح پرور ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے گھر کے جاہ وجلال اور عظمتوں کو قائم و دائم رکھے۔ امت مسلمہ کو اس کی بیش از بیش خدمت اور حفاظت کی توفیق عطا فرمائے اور وہاں حاضر ہونے والے ناچیز بندوں کی عبادات و مناجات کو شرف قبولیت بخشے۔

دین و شریعت

دین تہذیب نفس کے لیے آیا ہے اور شریعت کے احکام اس کا ذریعہ ہیں۔ نفس کی سب سے بڑی بیماری آپس کی دشمنی ہے...... زکوٰۃ اصلاح نفس کی دو بنیادی باتوں کی جامع ہے۔ ایک تو وہ نفس کے اندر سے عداوت کے بیج کو نکال دیتی ہے، دوسرے لالچ اور نفسانیت کو جڑ سے ختم کرتی ہے۔ شریعت کے جملہ احکام تقویٰ کے ماتحت ہیں۔

(حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ بقرہ: 178)

Marfat.com

معاشرتی نظام کو بگاڑنے کی بین الاقوامی تحریک

اقوام متحدہ کا ادارہ، جس کی تشکیل جنگوں سے اکتائی ہوئی دنیا کو صلح و آشتی کی فضا مہیا کرنے، قوموں کے مابین اختلافات رفع کرنے کے لیے ایک مرکز فراہم کرنے اور پس ماندہ ممالک کو ترقی کے وسائل سے بہرہ مند کرنے کے لیے کی گئی تھی اور اقوام عالم نے بڑی توقعات کے ساتھ اس کی رکنیت حاصل کر کے اس کو مضبوط بنایا، وقت گزرنے کے ساتھ بالکل نئے مقاصد اور اہداف لے کر سامنے آ رہا ہے۔ یہ مقاصد اور اہداف کسی ایسے ادارے کے وجود کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے جو پوری دنیا کی اقوام کی فلاح و بہبود کے لیے بنا ہو۔ ان اہداف میں چند خاص اقوام کو تمام دوسری اقوام پر فوقیت دینے اور انہیں تابع کر کے ان خاص اقوام کی مرضی کے مطابق کسی خاص رخ پر ہنکانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ اب اس ادارہ کو بہبود اگر عزیز ہے تو ان مراعات یافتہ اقوام کی، جنہوں نے روایتی چودھریوں اور وڈیروں کی حیثیت سے اس کا کنٹرول سنبھال رکھا ہے اور وہ اپنے مفادات محفوظ کر کے دیگر اقوام عالم کو نکیل ڈال کر غلام بنانا چاہتی ہیں اور یہ اقوام ان کے سامنے اسی طرح بے بس دکھائی دیتی ہیں جس طرح چودھریوں اور وڈیروں کے آگے ان کے مزارع اور کارکن بے بس ہوتے ہیں۔

اتفاق سے جن بڑی اقوام کو اس ادارہ میں سربراہی کا مقام حاصل ہے یہ وہ ہیں جن کی تاریخ اسلام دشمنی سے عبارت ہے۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو نہایت فراخ دل اور کشادہ ذہن کا مالک قرار دیتی ہیں لیکن فی الحقیقت یہ نہایت تنگ نظر اور کینہ پرور ہیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو یہ اسلام اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے سے باز نہ آتیں لیکن ان کے عزائم اور منصوبے ہیں اسی نوعیت کے کہ جن کے نتیجے میں مسلمان کسی طرح پنپ نہ سکیں۔ یہ تو اسلام کا ایک دین فطرت ہونا، اس کے عقائد و اخلاق کا عوام الناس کے لیے پرکشش اور مفید ہونا اور اس کے اختیار کرنے سے سکون و اطمینان میسر ہونا وہ اسباب ہیں جن کے باعث اس دین کے دشمنوں کو اپنے عزائم میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج کی دنیا پروپیگنڈے کی زد میں ہے اور مغرب نے میڈیا کے وسائل یعنی ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ کو جس طرح پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا ہے اس سے وہ اپنے اہداف حاصل کرنے میں خاصا کامیاب ہو رہا ہے۔ اب مغربی تہذیب مشرقی تہذیب کو شکست سے ہمکنار کرنے کے قریب ہے۔ اسلام میں چونکہ محکم عقائد اور معاشرتی نظام موجود ہے اس لیے مغرب کی یلغار کو اسے فتح کرنے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تاہم مغربی تہذیب میڈیا

Marfat.com

کی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے گھر گھر میں اپنا اثر چھوڑ رہی ہے۔

مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل کے لیے جو طریق کار اختیار کیا اس میں اسلام کے نہایت اعلیٰ مقاصد و اعمال کو ایسے ناموں سے موسوم کرنا سرفہرست ہے جو عرف عام میں نہایت ناپسندیدہ ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے مسلمانوں کی فنڈامنٹلزم یا بنیاد پرستی کا چرچا کیا گیا جو مغرب کی تاریخ میں ایک قابل نفرت سوچ تھی، جبکہ مسلمانوں میں قرآن وسنت کی بنیادوں سے وابستہ رہ کر زندگی گزارنا ہی اصل اسلام ہے اور ان بنیادوں سے دور ہو کر آدمی اسلام ہی سے دور ہو جاتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے تحت گویا اپنی اصل سے وابستہ مسلمان قابل نفرت قرار پائے اور دین سے دور لبرل مسلمان اچھے مسلمان ٹھہرے۔ اس کے بعد مسلم اقوام پر جہاں جہاں عرصہ حیات تنگ کیا گیا وہاں بعض مسلمان جہاد کے جذبے سے سرشار ہو کر ظالموں کے خلاف مزاحمت کرنے لگے تو مغرب نے ان کو دہشت گرد اور اسلام کو ایک جنگجو مذہب قرار دینا شروع کیا۔ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور میڈیا ان مجاہدانہ سرگرمیوں کو دہشت گردی کے طور پر متعارف کرانے لگا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک کو دہشت گرد ثابت کر دیا جائے تو صلح و آشتی کی ٹھیکیدار تنظیم کو اس ملک کے خلاف استعمال کرنے سے کون سی طاقت روک سکتی ہے۔ چنانچہ متعدد مسلم ممالک کو اپنے قومی مقاصد کے لیے کام کرنے پر اقوام متحدہ کے ذریعے سزا دلوائی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس، اسلام انسانوں کے مابین حقوق و فرائض کی تقسیم کا بے حد عادلانہ اور حکیمانہ نظام پیش کرتا ہے۔ چودہ سو برس پہلے نبی اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں اس نظام کو پیش کر کے پوری امت کو اس کا گواہ بنایا اور اس کو اپنانے کی وصیت فرمائی۔ اس کو اختیار کر کے ان چودہ سو برسوں میں مسلم معاشرے نے نہایت اتفاق اور ہم آہنگی کی زندگی گزاری ہے۔ اب اس کے مقابل میں مغرب نے اپنا خود ساختہ حقوق انسانی کا منشور پیش کیا ہے جو اسلامی نظام سے کئی باتوں میں متصادم ہے لیکن اقوام متحدہ کے ذریعے سے اس کی خلاف ورزی کرنے والے ممالک کو سزا دلوائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں اپنوں اور غیروں کے درمیان جو امتیاز روا رکھا جاتا ہے وہ ہر شخص کو نظر آنے والی چیز ہے۔

ان معاملات میں اقوام متحدہ کو جس طرح پارٹی بنا لیا گیا ہے اس کی تازہ ترین مثال بیجنگ +5 کانفرنس ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کانفرنس جو ستمبر 1995ء میں منعقد ہوئی، کے اغراض و مقاصد کو دین اسلام کی تعلیمات کے منافی قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت میں آوازیں اٹھائی گئی تھیں اور مسلم عوام نے اپنی حکومتوں سے اس کانفرنس کے بائیکاٹ کا مطالبہ کیا تھا لیکن ہمارے حکمران معلوم نہیں کن مصلحتوں کے تحت کوئی ایسا قدم اٹھانے سے گریز کرتے ہیں جو ان کے مغربی آقاؤں کی جبین پر شکن لانے کا باعث ہو۔ چنانچہ پاکستان نے بھی آزاد خیال خواتین کا وفد بھیج کر اس کانفرنس میں اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔ اس سلسلے کی دوسری کانفرنس ''خواتین 2000: اکیسویں صدی میں صنفی مساوات کی نشوونما اور امن'' کے عنوان سے منعقد ہوئی ہے۔ اس کے ایجنڈے پر کردار، ضابطہ اخلاق، معاشرتی اقدار اور ازدواجی معاملات کے دائروں میں نئے عالمی نظام کی منظوری ہے جسے اقوام متحدہ کے ذریعے رکن ممالک پر مسلط کیا جائے گا۔

Marfat.com

اس نظام میں حکومتوں سے مرد اور عورت میں صنفی تفریق پر مبنی قوانین کی منسوخی کا مطالبہ اور ہم جنسیت کو تحفظ فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کی منظوری کے بعد رکن ممالک کی اپنی اقدار و روایات یا دینی تعلیمات ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں گی اور اقوام متحدہ مسلمان ممالک کو ہدف بنانے کا کوئی موقع پیدا کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ اس سلسلے میں ہمارے ملکی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خاندانی منصوبہ بندی اور ایڈز کے نہایت بے ہودہ اشتہارات جو دکھائے جا رہے ہیں اور ڈراموں میں مادر پدر آزادی کا جو درس نوجوان نسل کو دیا جا رہا ہے، معلوم ہوتا ہے یہ نئے معاشرتی نظام کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔

مسلمان ممالک کی تعداد اقوام متحدہ میں کچھ کم نہیں ہے کہ ان کی اٹھائی ہوئی آواز کی وہاں کوئی حیثیت نہ ہو۔ انہوں نے اسلامی کانفرنس کی تنظیم بھی قائم کر رکھی ہے لیکن اس کو کچھ ایسی زنجیریں پہنا دی گئی ہیں کہ وہ کسی ملی معاملے میں ازخود متحرک نہیں ہو پاتی۔ حکومت پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے پچھلے دنوں برملا اس بات کا اظہار کیا کہ دنیا جس چیز کو دہشت گردی کے طور پر پیش کر رہی ہے ہمارے احساسات اس کے بارے میں مختلف ہیں اور ہم دہشت گردی اور جہادی قوتوں کی سرگرمیوں میں فرق کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ضرورت اس امر کی ہے کہ بیجنگ +5 کانفرنس کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا جائے کہ معاشرتی نظام اور اخلاقی اقدار میں ہم مسلمان آسمانی ہدایت کے حامل ہیں جس کا بدل اقوام عالم کی کوئی قرارداد نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اقوام متحدہ اپنی حدود کے اندر رہے اور کسی ایسے دائرہ میں اپنی سرگرمی نہ دکھائے جو آسمانی ہدایت سے متصادم ہو۔ قرآن مجید کو جو شخص بھی سمجھ کر پڑھے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ احکام کے ضمن میں قرآن نے جس زور و قوت اور تفصیل کے ساتھ معاشرتی حقوق و فرائض بیان کیے ہیں اس قوت اور تفصیل سے کسی دوسرے دائرے میں احکام نہیں دیے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ رب کائنات کے علم میں تھا کہ انسان معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے شیطانی کھیل کھیلنے کی کوشش کرتا رہے گا، لہٰذا اس معاملہ کو زیادہ سے زیادہ واضح طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

ابتدائی اطلاعات کے مطابق پاکستانی وفد نے غیر اخلاقی تجاویز کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور ایک اسلامی ریاست ہونے کے تقاضے سے یہی متوقع موقف تھا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے دینی زعما اور عوام بھی اس معاملہ کو سنجیدگی سے لیں اور حکومت پر واضح کریں کہ وہ اقوام متحدہ کی خلاف فطرت اور خلاف اسلام سرگرمیوں میں فریق نہ بنے بلکہ ایک لیڈر کا کردار ادا کرتے ہوئے دوسرے اسلامی ممالک کو بھی متحرک کرے کہ وہ اقوام متحدہ کی غیر اخلاقی قراردادوں کو ماننے سے انکار کر دیں۔

Marfat.com

مکاتیبِ اصلاحی نمبر

الحمد للہ کہ رسالہ تدبر کے ......اصلاحی نمبر......کو قارئین نے بے حد پسند کیا اور متعدد خطوط میں اتنی قلیل مدت میں ایک وقیع مجموعہ مضامین شائع کرنے پر مبارک باد دی ہے۔ اس نمبر کی ترتیب و تدوین مولانا رحمہ اللہ سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھنے والوں کی مرہون منت ہے۔ حقیقت میں وہی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بروقت اپنی تحریریں بہم پہنچائیں اور رسالہ کی اشاعت ممکن بنائی۔ پہلے خیال یہ تھا کہ اسی شمارے میں مولانا مرحوم کے وہ خطوط بھی شامل اشاعت کر دیئے جائیں گے جو قارئین کی جانب سے موصول ہوں گے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی کہ ان کو شائع کرنے کے لیے ایک پورا شمارہ مختص کرنا پڑے گا اور اس کی ضخامت عام شمارے سے دوگنی ہوگی۔

ادارہ کو جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان میں بھارت سے حکیم محمد مختار اصلاحی (ممبئی)، مولانا عبدالحسیب اصلاحی (بلریا گنج) اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (علی گڑھ) اور پاکستان سے سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے صاحبزادے جناب نور محمد خان لغاری (رحیم آباد)، ملک عبدالرشید عراقی (سوہدرہ)، محمد احسن خان (لاہور) اور محمود احمد لودھی (کراچی) کا تعاون نمایاں ہے۔ مولانا عبدالحسیب نے ڈاکٹر عبداللطیف خان صاحب مرحوم کے نام خطوط بھی عنایت فرمائے۔ ادارہ ان تمام احباب کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے تدبر کے اس شمارہ کو ایک اہم تاریخی دستاویز بنانے میں بھرپور مدد دی۔ بعض اہم خطوط کی نقول مولانا مرحوم ریکارڈ کے لیے راقم کے حوالہ کر دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر ان میں سے بھی بعض خطوط شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض نقول پر مکتوب الیہ کا نام لکھنے سے رہ گیا ہے، تاہم ان کے مضامین کی اہمیت کے پیش نظر ان کو لے لیا گیا ہے۔ چند مطبوعہ خطوط بھی شامل اشاعت ہیں مثلاً نیو سنٹرل جیل ملتان سے لکھے گئے خطوط ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور کی شائع کردہ کتاب ......مکاتیب زنداں...... سے ادارہ کے شکریہ کے ساتھ نقل کیے جا رہے ہیں۔ ان میں مولانا مرحوم نے اپنی خوش دامن صاحبہ، جناب ضیاء الرحمان مسعود (چھوٹے سالے)، ابو صالح اصلاحی مرحوم (بڑے بیٹے) اور جناب ابوسعید (چھوٹے بیٹے) کو مخاطب کیا ہے۔ ان کے علاوہ دو خطوط جناب حکیم محمد شریف مسلم کے نام ہیں جو ان کے استفسار کے جواب میں ہیں۔ حکیم صاحب ''مکاتیب زنداں'' کے مرتب ہیں۔ ان تمام خطوط کا تعلق مولانا رحمہ اللہ کی پہلی اسیری کے زمانے سے ہے جب مولانا کو جماعت اسلامی کے لیڈر کی حیثیت سے 5 اکتوبر 1948ء کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ان کی قیام گاہ راولپنڈی سے گرفتار کر کے پہلے دو ہفتے اٹک جیل میں رکھا گیا اور وہاں سے 22 اکتوبر کو نیو سنٹرل جیل ملتان میں منتقل

Marfat.com

کر دیا گیا جہاں مولانا مودودی مرحوم اور میاں طفیل محمد صاحب بھی قید تھے۔ جماعت کے یہ تینوں اکابر 28 مئی 1950ء کو اپنی رہائی تک ملتان ہی میں رہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی کتاب ''دعوت دین'' اسی اسیری کے دوران میں مدوّن کی۔ نیز ''اسلامی ریاست اور پاکستانی عورت دوراہے پر'' کے ابواب تصنیف کیے۔

خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکتوبر 1943ء تک مولانا مرحوم سرائے میر میں اپنی تدریسی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد کسی وقت مرکز جماعت اسلامی دارالاسلام میں منتقل ہوئے۔ اس سلسلے میں تدبر کے پچھلے شمارہ [1] میں شائع شدہ ڈاکٹر منصور الحمید صاحب کے انٹرویو کے اس جملے کی وضاحت ضروری ہے کہ ''مولانا مودودی مرحوم اور مولانا منظور نعمانی صاحب دونوں میرے درپے ہو گئے کہ تمہارا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔'' (ص 47)

اس بارے میں مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمان سنبھلی اپنے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

''یہ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمی ہی ہوسکتی ہے۔ مولانا مرحوم جب دارالاسلام تشریف لے گئے ہیں اس سے بہت پہلے مولانا نعمانی (میرے والد ماجد) دار الاسلام ہی نہیں، جماعت بھی چھوڑ چکے تھے۔ البتہ ان کی سرگزشت (شائع شدہ الفرقان، مارچ، اپریل 1958ء) میں یہ ضرور مرقوم ہے کہ مولانا مرحوم اس بارے میں مشورے کے لیے والد ماجد کے پاس بریلی آئے تھے اور انہوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ دار الاسلام جانا مناسب ہوگا، لیکن درپے ہونے یا دباؤ ڈالنے کا تو اس حالت میں سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ و اللہ اعلم مولانا مرحوم نے کیا فرمایا تھا۔''

مولانا مرحوم کے زیر بحث جملے کی، اگر یہ درست نقل ہوا ہے، یہ توجیہ بھی کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ جماعت اسلامی کے قیام کے جلد بعد ہی مولانا مودودی مرحوم کا تقاضا شروع ہو گیا ہو اور اس تقاضا میں مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے بھی، جو ابھی جماعت میں شامل تھے، اپنا وزن ڈالا ہو۔ اگر یہ صورت پیش نہیں آئی تو پھر مولانا سنبھلی کا موقف درست معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ مولانا مرحوم پر مدرسۃ الاصلاح کی ذمے داریاں بھی تھیں اس لیے وہ دارالاسلام منتقل ہونے کے بارے میں فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں اور انہوں نے مولانا نعمانی رحمہ اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد حتمی رائے قائم کی ہو۔ اس صورت میں زیر بحث جملے کی تعبیر یوں مناسب ہو گی کہ ''دار الاسلام منتقل ہونے کے فیصلے میں مولانا مودودی مرحوم کے اصرار کو بھی دخل تھا اور مولانا نعمانی مرحوم کے مشورہ کو بھی۔''

مولانا مرحوم کے ایک مکتوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے زمانے میں وہ اعظم گڑھ واپس جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ وہیں سے جماعت کی خدمت کرنے اور دائرہ حمیدیہ کو از سر نو منظم کرنے کے کام ان کے پیش نظر تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کے دوران کی افراتفری میں وہ پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے اور پھر سرائے میر واپس جانے کی منزل ان سے دور سے دور تر ہوتی گئی، البتہ وہاں کی یادوں سے ان کا دل ہمیشہ آباد رہا۔ جب بھی ماضی کا تذکرہ

[1] رسالہ تدبر ''اصلاحی نمبر''، شمارہ نمبر 60، اپریل 1998ء۔

Marfat.com

ہوتا تو وہ اپنی مادر علمی کے حالات مزے لے لے کر سناتے۔ جب بھارت سے کوئی صاحب ملنے کے لیے آتے تو وہ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور مدرسہ کے احوال کے بارے میں جزرسی [1] سے معلومات حاصل کرتے۔ مدرسے کی محبت ان کے ذہن میں اس قدر راسخ تھی کہ 1994ء میں جب ان پر آخری طویل بیماری کا پہلا حملہ ہوا تو یہ تقاضا ان کی زبان پر جاری رہا کہ انہیں سرائے میر لے جایا جائے۔ مدرسے کے ساتھ محبت ان خطوط میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ جو انہوں نے اپنی اصلاحی برادری کے نام لکھے ہیں۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد جب مولانا مرحوم نے تفسیر تدبر قرآن لکھنے کا کام شروع کیا تو یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن گیا۔ متعدد خطوط میں وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید سے متعلق اپنی ذمے داریوں کے لیے عنداللہ مسئول ہوں گے اس لیے اب وہ سرد و گرم ہر طرح کے حالات میں اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔ اس عزم میں انہوں نے بعد میں کبھی کمزوری نہیں دکھائی۔ وہ اس بارے میں اپنے استاذ امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے سامنے بھی سرخرو ہونا چاہتے تھے کہ وہ ان کی توقعات پر پورا اترے۔ درس قرآن کے جو سلسلے انہوں نے جاری کیے ان میں ان کے پیش نظر ایسے افراد کی تلاش ہوتی جو مولانا فراہی رحمہ اللہ کے اسلوب تدبر کو سمجھ کر اپنے آپ کو خدمت قرآن پر لگا دیں۔ مولانا خطوط میں برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ دین کی اس ناقدری کے زمانے میں اگر ایک دو آدمی بھی تیار کر سکیں تو یہ بھی غنیمت ہوگی۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ایک ذہین شاگرد محمود احمد لودھی کو زیر دام لانے کے لیے جو جتن کیے ان کا اندازہ اس مجموعہ میں شامل ان کے نام لکھے گئے خطوط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ مکاتیب میں چند خطوط وہ بھی ہیں جو مولانا مرحوم نے امیر جماعت اسلامی کے نام اپنے استعفے کے ہمراہ اور اس کے بعد لکھے یا استفسار کرنے والوں کے جواب میں تحریر کیے۔ ان تمام خطوط کی نقول مولانا مرحوم نے محفوظ کر رکھی تھیں۔ ان کے مطالعے سے قارئین کو ان اسباب کے تعین میں مدد ملے گی جو سولہ سترہ برس جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد اس سے علیحدگی کا باعث بنے۔ ان خطوط سے ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام اور کوٹ شیر سنگھ میں منعقد ہونے والی مجلس شوریٰ کے نتائج فکر کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر سمجھا جا سکے گا اور یہ بہر حال مولانا کی حیات کے ایک نہایت اہم موڑ کی روداد کا ایک حصہ ہے۔

یہی نوعیت ان خطوط کی ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے متعلق ہیں اور بے حد تلخ ہیں۔ اس تلخی کے کچھ اسباب ہیں۔ 1966ء میں ڈاکٹر صاحب لاہور منتقل ہوئے تو جماعت اسلامی میں رفاقت کی بنا پر مولانا نے ان پر بے پناہ اعتماد کر کے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ انہیں رسالہ میثاق کی ادارت سونپی اور بعد میں اپنی تفسیر تدبر قرآن اور دوسری کتب کا ناشر بھی انہی کو مقرر کیا۔ رسالہ کے سرورق پر ''زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی'' کے الفاظ چھپتے۔ اختلاف کا آغاز اس وقت ہوا جب رسالہ کے مضامین میں ایسے افکار پیش کیے گئے جن پر مولانا ہمیشہ تنقید

---

[1] جزرسی: کفایت شعاری، ذہانت، نکتہ رسی، تفصیلات دریافت کرنا

Marfat.com

کرتے رہے تھے۔ قارئین ان کی وضاحت مولانا سے طلب کرتے۔ اس پر مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو زیرسرپرستی کے الفاظ ہٹا دینے کی ہدایت کی تاکہ چھپنے والے مضامین کی ذمہ داری ان پر نہ آئے۔ 1972ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک تنظیم انجمن خدام القرآن کے نام سے قائم کی۔ مولانا نے اس کی ہیئت ترکیبی اور اس کے دستور کی بعض شقوں کو اسلامی نظام اجتماعیت کے منافی قرار دیا لیکن ڈاکٹر صاحب ان کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر رسالہ میثاق میں بعض ایسی تحریریں چھپنے لگیں جن میں ادعاء ❶ کا رنگ بہت نمایاں ہوتا۔ مولانا نے اپنے بارے میں شائع ہونے والی بعض چیزوں کو بھی خلاف حقیقت قرار دیا۔ چنانچہ انہوں نے 1974ء میں میثاق میں تفسیر کی اشاعت روک کر اپنے قطع تعلق کا اظہار کیا اور کتابوں کی اشاعت کا متبادل انتظام کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس مرحلے میں مولانا کے احباب نے اصلاح احوال کی کوششیں کیں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس مجموعہ میں شامل خطوط تعلقات کی کشیدگی کے آخری دور سے متعلق ہیں اور ان کی تلخ نوائی کا سبب اس تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اس مجموعہ مکاتیب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولانا اپنی زندگی کا ایک معین مقصد رکھتے تھے۔ اس کے لیے وہ برابر تگ و دو کرتے رہے۔ اس راہ میں مشکلات پیش آئیں تو انہوں نے ایک صاحب عزیمت شخص کی طرح ان کا مقابلہ کیا اور اس میں کسی مصلحت کو سد راہ نہیں بننے دیا۔ انہیں اپنے دینی منصب کے تقاضوں کا ہمیشہ خیال رہا اور اس کی ذمے داریوں کو پورا کرنے میں وہ کسی مداہنت ❷ سے کام لینا گوارا نہیں کرتے تھے، خواہ اس کے لیے برسوں کی رفاقت کو قربان کر دینا پڑے۔

آدمی کے خطوط اس کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ مرقع ان شاء اللہ مستقبل کے اس مورخ کے کام آئے گا جو مولانا کی ذات اور شخصیت کو موضوع بحث بنائے گا۔

نظم قرآن

نظم قرآن کی معرفت سے ہمارا مقصد قرآن مجید میں غور و فکر کے سوا اور کچھ نہیں کیوں کہ یہی نظم کی کلید ہے اور اسی سے ہدایت اور تقویٰ کا راستہ کھلتا ہے جن پر پورے دین کا مدار ہے۔ ہدایت سے نفس کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور تقویٰ سے اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ ایمان اپنے تمام علمی شعبوں کے ساتھ ہدایت میں دخل ہے اور شرائع و اخلاق اور قلب کے احوال و معاملات تقویٰ کا حصہ ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور تورات و انجیل میں پوری طرح واضح کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں نظم کی طرف رہنمائی اس پر غور و فکر کی ابتدا ہی سے ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد غور کرنے والا شخص اس کے نظام کو سمجھنے کے لیے خود کو مجبور پاتا ہے۔ کیوں کہ قرآن کا چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی غور و فکر کا طالب ہے اور آگے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور یہ چیز اسے درجہ بدرجہ اور اوپر لے جاتی ہے یہاں تک کہ جب نظم کلام پوری طرح بے نقاب ہو جاتا ہے تو سورہ کے محاسن روشن ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اور وہ حکمت جلوہ گر ہو جاتی ہے جو تمام تر علم و تقویٰ ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، دلائل النظام: 21)

---

❶ ادعاء: دعویٰ کرنا، خواہش کرنا
❷ مداہنت: سستی کرنا، ہاں میں ہاں ملانا، جو دل میں ہو اس کے خلاف کہنا

Marfat.com

تدبّرِ قرآن کا ایک قابلِ قدر مطالعہ

مغرب میں قرآن مجید کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ یہ کتاب غیر مربوط آیات اور منتشر مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کی جو کچھ اہمیت ہے وہ ایک مقدس کتاب ہونے کی وجہ سے ہے اور اسی لیے مسلمان اسے آنکھوں سے لگاتے ہیں، ورنہ بحیثیت ایک تصنیف یہ ان خوبیوں کی حامل نہیں جو ایک اچھی تصنیف کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ کچھ اس عام غلط فہمی کے باعث اور کچھ اس عناد کے باعث جو اسلام سے غیر مسلموں کو ہے، مغربی مصنّفین نے قرآن مجید کے اندر بے ربطی کو نہ صرف اپنی تحریروں کا موضوع بنایا، بلکہ اس کے اندر تحریف کرنے کی کوشش بھی کی تاکہ وہ قرآن کو اس ترتیب کے مطابق تیار کرسکیں جو ان کے نزدیک صحیح ترتیب ہونی چاہیے تھی۔ اس نہج پر مستشرقین کی کوششیں ابھی تک جاری ہیں اور بعض نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ان کو سراہا بھی گیا ہے۔

مستشرقین کی اس سازش کا مقابلہ ایک تو مسلمانوں کے ایمانِ راسخ سے ہوسکتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر تحریف کی ہر کوشش کو ناکام بنائیں، خواہ وہ کتنے ہی خوبصورت الفاظ اور کتنے ہی دل پسند مقاصد کو سامنے لا کر کی جائے۔ دوسرے یہ مقابلہ غیر مسلموں پر اتمامِ حجت کر کے ہوسکتا ہے یعنی ان پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ قرآن اس عیب اور نقص سے پاک ہے جو وہ اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مؤخر الذکر کام قرآن مجید کے گہرے مطالعے اور تفکر و تدبر سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر یہ ہو جائے تو ہمیشہ کے لیے مستشرقین کے فتنہ کو دفن کر دے سکتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی تفسیر ''تدبر قرآن'' قرآن کو مربوط و منظّم ثابت کرنے کی ایک منفرد اور کامیاب کوشش ہے، چونکہ یہ اردو زبان میں ہے اس لیے یہ فی الحال ان طبقوں تک نہیں پہنچ سکی جو قرآن مجید کی طرف مذکورہ نقص منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک اس کو کسی بین الاقوامی زبان میں نہ منتقل کیا جائے گا، دوسری زبانوں کے محققین اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ [1]

اردو نہ جاننے والے محققین، جیسا کہ عرض کیا گیا، ابھی ''تدبر قرآن'' کی خصوصیات سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے، لیکن ادھر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا انتظام کر دیا کہ تدبر قرآن میں اختیار کردہ اندازِ تفسیر کی جملہ بنیادی خصوصیات

---

[1] الحمد للہ ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے رفیق اور مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے شاگرد جناب محمد سلیم کیانی نے تفسیر تدبر قرآن کی آیت بسم اللہ، سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کا انتہائی اعلیٰ اور معیاری ترجمہ انگریزی میں Pondering Over The Quran کے نام سے دو جلدوں میں کیا ہے جس سے مغربی ممالک میں لوگوں کے لیے تدبر قرآن تک رسائی آسان ہو گئی ہے۔ یہ کتاب ملائیشیا میں Islamic Book Trust نے شائع کی ہے۔ (حسان عارف)

Marfat.com

انگریزی میں بیان ہو جائیں۔ اس کی شکل یہ ہوئی کہ ایک پاکستانی طالب علم، مستنصر میر نے امریکہ کی مشی گن یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے داخلہ لیا اور قرآن کے ربط اور نظم ہی کو موضوعِ تحقیق بنایا۔ انہوں نے جو مقالہ تحریر کیا، اس کا نام ہے:

"Thematic and structural coherence in the Quran: A study of Islahi's concept of 'NAZM'.

یعنی ''قرآن میں کلام و معنی کا ربط: مولانا اصلاحی کے تصور نظم کا ایک مطالعہ۔''

موضوع زیر بحث کے تقاضے سے فاضل مقالہ نگار نے بڑی کاوش سے تفسیر تدبر قرآن میں بیان کردہ نظم قرآن کی خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی پی ایچ ڈی کمیٹی چار پروفیسروں پر مشتمل تھی، یونیورسٹی آف مشی گن سے پروفیسر جیمز بیلامی، پروفیسر جارج میور وڈز، پروفیسر ارنسٹ میک کیرس اور یونیورسٹی آف شکاگو سے پروفیسر فضل الرحمان۔ کمیٹی نے اس علمی کاوش کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور مصنف کو مشورہ دیا کہ وہ اس تحقیق کو کتابی شکل میں شائع کروائیں کیونکہ مولانا اصلاحی کا تصور نظم قرآن نہایت دل نشیں، منفرد اور نئے امکانات سے مالا مال ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے 200 صفحات کے اس مقالے میں اپنی تحقیق کو چھ ابواب میں سمویا ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے اس تصور نظم قرآن کا خاکہ بیان کیا ہے جو اب تک کے قدیم و جدید مصنّفین نے پیش کیا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے ابوسلیمان حمد الخطابی، ابوبکر محمد الباقلانی، عبدالقاہر الجرجانی، زمخشری، رازی، ابوحیان، شمس الدین شربینی، شہاب الدین آلوسی، ابو الاعلیٰ مودودی، محمد محمود حجازی اور ڈاکٹر فضل الرحمان کے خیالات کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں مولانا فراہی رحمہ اللہ اور مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے تصور نظم کو مفصل بیان کر کے فاضل مقالہ نگار نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مفسرین اس تصور میں منفرد ہیں اور ان کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے نظم قرآن انتہائی اہمیت رکھنے والا بنیادی اصول ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب نظم قرآن کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ ہر سورہ ایک وحدت ہے جس کا ایک خاص عمود ہے، سورتیں جوڑے جوڑے ہیں اور ہر جوڑے کے ارکان مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتے ہیں اور قرآن مجید سورتوں کے سات گروپوں میں مدوّن ہے جن میں سے ہر گروپ کا اپنا الگ عمود ہے۔ دورانِ بحث فاضل مقالہ نگار نے دورِ حاضر میں نظم قرآن کے قائل مفسرین محمد حسین طباطبائی اور ڈاکٹر سید قطب کی تفاسیر کے ساتھ موازنہ کر کے بتایا ہے کہ مولانا اصلاحی کا بیان کردہ نظم قرآن نہایت جامع اور سائنٹفک ہے اور صرف یہی نظم موثر طور پر قرآن کو ایک مربوط کلام کے طور پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آخری باب میں فاضل مقالہ نگار نے اپنی تحقیق سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

ا۔ مولانا اصلاحی کا طریقۂ تفسیر مطالعہ قرآن پر مبنی ہے، ان کے نزدیک قرآن کی موجودہ ترتیب کے سوا کوئی دوسری ترتیب اس کے نظم کو تہ و بالا کر دینے والی ہوگی۔ ان کا تصور نظم نہایت جامع ہے اور یہ نظم آیات سے

Marfat.com

لے کر سورتوں کے مجموعے تک میں پایا جاتا ہے۔

ب۔ مولانا اصلاحی نے گو یہ تصورِ نظم اور اس کی دریافت کا طریق کار مولانا فراہی رحمہ اللہ سے لیا ہے لیکن اس میں اتنے اضافے کر دیے ہیں کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ بھی ان کے مرہونِ منت [1] ہوں گے کہ ان کے شاگرد نے ان کے ایک تصور کو پورے قرآن کی تفسیر لکھ کر موثر انداز میں حقیقت ثابت کر دیا۔

ج۔ تدبر قرآن، قرآن مجید کو ایک انتہائی مربوط کتاب ثابت کرتی ہے جو ترتیب کلام اور معنی دونوں اعتبار سے مربوط ہے۔ لہٰذا قرآن کی کوئی اور ترتیب اس کو اس کے ظاہری اور معنوی حسن سے عاری کرنے والی ہوگی۔

د۔ مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کا تصور نظم، نظم کے قائل تمام دوسرے مفسرین سے منفرد ہے۔ اس میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھتے ہوئے آیات کی حتمی واحد تاویل کی جا سکتی ہے۔ جب کہ دوسرے کسی تصور نظم کے تحت یہ ممکن نہیں۔ لہٰذا مولانا اصلاحی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نظم قرآن اور سیاق و سباق کا لحاظ قرآن کی تفسیر کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے۔

ہ۔ یہ تصورِ نظم قرآن مجید کے ساتھ ایک ایسا صوری شکوہ منسوب کرتا ہے جو اس سے قبل کبھی منسوب نہیں کیا گیا۔

زیرِ نظر مقالہ چونکہ اصلاً ڈاکٹریٹ کے حصول کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے اس کا انداز تنقیدی ہے۔ اس میں مصنف نے سورۂ نساء کا مفصل مطالعہ پیش کیا ہے اور آیات کے باہمی ربط کی توجیہ جاہلی ادب کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تدبر قرآن میں بعض سورتوں کے جوڑا قرار دیے جانے کو محل نظر قرار دیا ہے اور بعض نئے جوڑے تجویز کیے ہیں جو اس تصور کے مطابق نہیں جو مولانا اصلاحی نے پیش کیا ہے۔ وہ مولانا کے اس دعوے کو بھی محل نظر سمجھتے ہیں کہ سات گروپوں میں قرآن مجید کی تقسیم منصوص ہے۔ تاہم فاضل مقالہ نگار کی اس تحقیق کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ انہوں نے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تفسیر تدبر قرآن کے اصولی نتائج تحقیق، جو نظم سے متعلق ہیں، DATA کی شکل میں مرتب کر دیے ہیں لہٰذا اب یہ مقالہ ''تدبر قرآن'' پر اس پہلو سے کام کرنے والوں کے لیے ایک ایسی ضرورت بن گیا ہے جو ان کو بہت سی کاوش سے بچا لے گی۔

فاضل مقالہ نگار نے یہ واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنے استاذ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے کام کو کن کن اعتبارات سے آگے بڑھایا۔ انہوں نے ان میدانوں کی نشاندہی بھی کی ہے جن پر مستقبل میں مزید کام کی ضرورت ہوگی تاکہ قرآن مجید کا نظم مکمل طور پر واضح ہو سکے۔ توقع ہے کہ ان کے مقالے کے بغور مطالعے سے جہاں قرآن مجید کے طالب علموں کو رہنمائی ملے گی وہاں مستشرقین بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ان کی ترتیب قرآن کو بدلنے کی کوششوں میں ایک طرزِ تفسیر اس طرح حائل ہے کہ وہ اس کو نظر انداز کر کے اپنے مذموم مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔

---

[1] مرہونِ منت: احسان مند، ممنون (مرہون: رہن یا گروی رکھا گیا۔ منت: احسان)

Marfat.com

امام فراہی سیمینار

انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (ہند) نے امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی شخصیت اور خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ماہ نومبر 1990ء میں ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے تمام ضروری انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے کہ عین انہی دنوں میں بابری مسجد کے مسئلہ پر ملک میں کشیدگی کی ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں سیمینار کا انعقاد اس کے شرکاء کے لیے خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے انجمن نے اس کو کسی بہتر وقت کے لیے مؤخر کر دیا۔ یہ سیمینار 8 اکتوبر سے 10 اکتوبر 1991ء تک مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں منعقد ہوا۔ اس کے کنوینر مدرسہ کے استاد مولانا اختشام الدین اصلاحی تھے۔

سیمینار کا افتتاح 8 اکتوبر 1991ء کی صبح کو ہوا۔ عالم اسلام کے نامور فرزند مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صدارت فرمائی اور افتتاحی تقریر مولانا صدر الدین اصلاحی نے کی۔ اس کے بعد مقالات پیش کرنے کے لیے پانچ اجلاس ہوئے جو تین دنوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان اجلاسوں میں 37 مقالات پیش ہوئے جن میں امام فراہی کے اصول تفسیر، اصول تحقیق حدیث، مختلف دینی موضوعات پر ان کی اہم تحقیقات اور علم و ادب کی خدمت کو موضوع بحث بنایا گیا۔ مقالہ نگاروں میں مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغین نے نصف سے زائد عنوانوں پر اپنی نگارشات پیش کی ہیں۔ تقریباً ایک تہائی مقالہ نگار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مختلف شعبوں کے پروفیسر ہیں۔ ان کے علاوہ مدرسۃ الفلاح بلریا گنج، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی لکھنؤ اور جامعہ ہمدرد نیو دہلی کے اساتذہ اور محققین نے سیمینار کو کامیاب بنانے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامیان ہند کے تعلیم یافتہ طبقہ میں فکر فراہی کے قدردان خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ پاکستان میں فکر فراہی کے منتسبین [1] کے تین مقالات سیمینار میں پیش ہوئے۔ ان میں سے راقم کا مقالہ بعنوان ''حدیث و سنت کی تحقیق کا فراہی منہاج'' پڑھا گیا۔

مقالات کے عنوانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگاروں نے اپنی نگارشات میں امام فراہی کی شخصیت اور فکر کے نہایت اہم پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ مواد بے حد وقیع معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے اس کی یکجا اشاعت انجمن طلبہ قدیم کے پروگرام میں شامل ہو۔ اگر شامل نہیں ہے تو ہم درخواست کریں گے کہ اس کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا جائے۔ [2] بعض موضوعات پر ایک سے زیادہ مقالہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان میں مضامین کی تکرار کا پایا جانا

---

[1] منتسبین: نسبت رکھنے والے، منتسب کی جمع

[2] انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح نے ان مقالات کو ''علامہ حمید الدین فراہی: حیات و افکار'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔

Marfat.com

ناگزیر ہے۔ اگر ان مقالات پر تھوڑی سی محنت کر کے مصنفین کی اجازت سے ایڈیٹنگ کر لی جائے تو کتاب کی خوبی کو چار چاند لگ جائیں گے اور یہ کتاب یقیناً نہایت قابل قدر علمی سرمایہ اور فکر فراہی کی اشاعت و پیشرفت کے لیے اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔

سیمینار کے لیے اتنی بڑی تعداد میں اہل علم سے مقالات حاصل کر لینا بجائے خود اس کی کامیابی کی ایک بین دلیل ہے۔ لیکن یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ سرائے میر کے نواح کے لوگوں نے اس علمی مجلس میں بڑی دلچسپی لی اور ہر اجلاس میں تقریباً دو سو اور افتتاحی اجلاس میں تین سو آدمی شریک ہوئے۔ مندوبین اور مہمانوں کے استقبال، نقل وحمل اور قیام و طعام کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور طلبہ نے میزبانی کے فرائض بڑے سلیقہ سے سر انجام دیے۔

راقم تمنا، ارادہ اور بھرپور کوشش کے باوجود فراہی مدرسہ فکر کی اس نمائندہ تقریب میں شامل نہ ہو سکا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ ❶ انڈین ہائی کمیشن اسلام آباد نے ویزا کی درخواست کو اس وقت تک روکے رکھا جب تک سیمینار کی تاریخیں نکل نہیں گئیں۔ اس کے بعد یہ کہہ کر پاسپورٹ لوٹا دیا کہ ہم اپنی حکومت سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے جو آخر وقت تک مہیا نہیں ہو سکیں۔ اس طرح سیمینار میں شرکت راقم کے لیے ایک حسرت ہی رہی اور فکر فراہی پر کام کرنے والوں سے شناسائی حاصل کرنے اور ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کا ایک اہم موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ راقم ذاتی طور پر منتظمین کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے اس کی رہنمائی کے لیے دہلی اور شاہ گنج میں ضروری بندوبست آخر وقت تک کیے رکھا۔ یہ ان کی محبت کی دلیل ہے۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث سیمینار کے اس کامیاب انعقاد پر انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور منتظمین کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کی شبانہ روز کی اس محنت نے مولانا فراہی رحمہ اللہ کی ذات اور خدمات کو اجاگر کرنے اور ان کے فکر کی مختلف جہتوں کو نمایاں کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو آئندہ بھی ایسی تقاریب منعقد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مدین

مدین کی وجہ تسمیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد مدین ہیں۔ یہ علاقہ بحر قلزم کے کنارے تبوک کے جوار میں اس سے سات میل کی دُوری پر ہے اور رقبہ میں تبوک سے بڑا ہے۔ یہ پہلے غیر آباد تھا بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں لوگ آباد ہوئے اور تجارت کو فروغ حاصل ہوا، لیکن اسی کے ساتھ تاجروں کی برائیاں بھی بڑھتی گئیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے درمیان پیغمبر بنا کر بھیجا...... ان کا مسکن عرب کے شمال میں سیناء کے قریب جبل النار کے پاس تھا۔ (حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ اعراف: 85)

❶ خالد مسعود صاحب کی ''امام فراہی سیمینار'' میں شرکت کی تمنا تو پوری نہ ہو سکی، تاہم 1997ء میں انھیں ''مولانا اصلاحی سیمینار'' میں شرکت کے لیے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں حاضری کا اہم موقع مل گیا۔ (حسان عارف)

Marfat.com

نظمِ قرآن کے نظریہ کی مقبولیت

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کی تفسیر تدبر قرآن کے منفرد انداز بیان اور طریقہ تفسیر نے قرآن فہمی کے شائقین اور اہل علم و دانش کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کا ایک اندازہ اندرون ملک یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی، ایم۔فل اور ایم۔اے کی ڈگری کے لیے لکھے گئے مقالہ جات کی ایک بڑی تعداد سے ہوتا ہے۔ادھر پچھلے چند ماہ کے دوران بعض ایسے شواہد سامنے آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر نے بیرون ملک بھی اہل علم کا اعتماد حاصل کیا ہے اور یہ تیزی سے اپنا مقام پیدا کر رہی ہے۔

بیرون ملک تفسیر تدبر قرآن پر سب سے پہلا کام ڈاکٹر مستنصر میر نے امریکہ کی یونیورسٹی آف مشی گن میں کیا تھا۔ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں تدبر قرآن کا ایک مطالعہ پیش کیا جس میں تفسیر میں اختیار کردہ اصول نظم قرآن کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا۔انہوں نے دکھایا کہ مولانا کا سورتوں کو جوڑے جوڑے قرار دینا اور پورے قرآن کو ایسے سات حصوں میں تقسیم کرنا جن میں سورتوں کے مجموعے الگ الگ مرکزی مضمون کے حامل ہیں، نظم قرآن کے تصور میں ایک اضافہ ہے جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی اور جس سے حکمت قرآن کے فہم کی بے شمار راہیں کھلتی ہیں۔تدبر قرآن نے قرآن کی سورتوں میں نہ صرف معنوی ربط واضح کیا ہے بلکہ اس کی ترتیب کو بھی معنی خیز ثابت کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اب کتابی شکل میں ربط قرآن (Coherence in the Quran) کے نام سے امریکہ سے شائع ہو چکا ہے۔

بھارت میں پہلی مرتبہ تفسیر تدبر قرآن ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی اور قلیل مدت میں اس کی تمام کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ یہ بات خود کتاب کے ناشرین کے لیے موجب حیرت تھی کہ نو ضخیم جلدوں پر مشتمل اس کتاب کے ایک ہزار نسخے اتنی کم مدت میں کیسے نکل گئے۔اس کی ممکنہ توجیہ یہ ہے کہ تدبر قرآن نے تفسیر کی مشکلات کے حل کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں۔اس نے قرآن کے اندر نظم کو ایسے مدلل انداز میں ثابت کیا اور فن تفسیر کو نیا رخ دیا ہے جس کی لوگوں نے دل سے قدر کی ہے، لہٰذا جو لوگ قرآن فہمی کے طالب تھے انہوں نے کتاب کے حصول کو یقینی بنایا۔

ایک پاکستانی نوجوان جناب عبدالقدیر ایاز جو عرصہ دراز سے سعودی عرب میں مقیم دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے، چند ماہ قبل پاکستان آئے تو مولانا مدظلہ سے ملاقات کی غرض سے بطور خاص لاہور پہنچے۔ان کو کتب تفسیر کے مطالعے کے دوران کسی شخص نے برسبیل تذکرہ تفسیر تدبر قرآن سے آگاہ کیا تھا۔انہیں کتاب حاصل کرنے کی جستجو ہوئی تو بمشکل تمام کہیں سے اس کی ایک جلد ہاتھ آئی۔اس کو پڑھا تو اس تفسیر کے گرویدہ ہو گئے۔اب انہیں یہ فکر لاحق ہوئی

Marfat.com

کہ ایسی نعمت سے عالم عرب ابھی تک کیوں بے خبر ہے۔ پاکستان آ کر انہوں نے کتاب بھی حاصل کی، مولانا سے بالمشافہ گفتگو بھی کی اور اپنا یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ وہ عربوں کو اس علمی خزانے سے روشناس کرانے کی تدابیر کریں گے۔ نیز اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ بھی اس سعادت میں شریک ہو جائیں۔

ترکی کے دارالحکومت استنبول میں دینی تحقیق کا ایک ادارہ ترکی موسسہ دینی (Turkish Religious Foundation) قائم ہے۔ اس کے مرکز اسلامیات کے ایک ریسرچ اسکالر...... برادر عبدالحمید برایشق...... پاکستان میں لکھی گئی اردو تفاسیر پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی تحقیق کے سلسلہ میں ڈیڑھ برس اسلام آباد میں مقیم رہے۔ اس دوران میں انہوں نے اردو زبان سیکھی اور اردو تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں تنقید و تبصرہ کے لیے جن چار تفاسیر کا انتخاب کیا ان میں تفسیر تدبر قرآن بھی شامل ہے۔ یہ نوجوان اسکالر تفسیر تدبر قرآن کے اصول و انداز بیان سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے لاہور آ کر مولانا سے بالمشافہ تفسیر کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا اور اس بات کے خواہاں ہوئے کہ اگر مولانا اجازت مرحمت فرمائیں تو وہ اس کو ترکی زبان میں منتقل کر دیں۔ مولانا نے بخوشی ان کو اجازت دے دی۔ اللہ کرے برادر عبدالحمید اپنے مقالے کی تکمیل کے بعد اس ملی خدمات کے لیے توفیق پائیں۔

حال ہی میں انگلستان کی یونیورسٹی آف لیڈز کے شعبہ دینیات و مذہبی علوم میں اسلامیات کے ایک پروفیسر ڈاکٹر نیل رابنسن (Dr. Neal Robinson) صاحب تدبر قرآن سے ملاقات کے لیے وارد لاہور ہوئے۔ ڈاکٹر مستنصر میر کی کتاب ربط قرآن ان کی نظر سے گزری تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو نہایت غور سے پڑھا اور اس کے مفاہیم کو اچھی طرح ہضم کیا۔ اس کی مدد سے ان کو مولانا کے نقطۂ نظر سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے مولانا کے اصول کی روشنی میں اپنے طور پر قرآن مجید پر تدبر شروع کر دیا۔ اردو سے ناواقفیت کے باعث کتاب سے براہ راست استفادہ ان کے لیے ممکن نہ تھا لہٰذا بہت سی مشکلات کو وہ اپنے طور پر حل نہ کر سکے۔ البتہ وہ دل سے قرآن میں نظم و ربط کے قائل ہو گئے۔ ان کے نزدیک قرآن میں نظم کے اس قدر شواہد موجود ہیں کہ ان کا انکار یا تو نہایت بلید ❶ شخص کر سکتا ہے یا کوئی کٹر معاند ❷۔ وہ نظم قرآن کے اثبات کے لیے مولانا کی خدمات کے دل سے معترف تھے۔ انہوں نے مولانا مدظلہ اور راقم سے نظم کی بعض مشکلات پر کئی نشستوں میں تبادلہ خیالات کیا اور بعض تصورات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رابنسن نے تفسیر تدبر قرآن کے عربی اور انگریزی ترجمہ کی ضرورت پر خاص طور پر زور دیا تاکہ یہ تفسیر قرآن کے ان طالب علموں کی رسائی میں آ جائے جو اردو زبان سے نابلد ہیں۔ ❸

چند ماہ کی قلیل مدت میں مولانا کے ساتھ ایسے لوگوں کے رابطے جو پہلے سے مولانا سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے، اور نہ ان کے خوشہ چین رہے ہیں، اس بات کا ثبوت ہیں کہ مولانا کی یہ خدمت قرآن عاقلوں کو متاثر کر رہی ہے۔ لوگ قرآن میں نظم کا مشاہدہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فہم قرآن کا یہ طریقہ مقبول ہو اور لوگ اس کی برکات سے فیض یاب ہوں۔

---

❶ بلید: کند ذہن، غبی ❷ معاند: عناد (دشمنی) رکھنے والا ❸ ڈاکٹر نیل رابنسن نے علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ سے ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں مگر ابھی اس کا اعلان نہیں کیا۔ (حسان عارف)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سپاس یزداں

1۔ اے فرازندۂ بلند سپہر — وے فروزندۂ ستارہ و مہر
2۔ آفرینندۂ جہاں از ہیچ — باچنیں کارگاہ پیچا پیچ
3۔ پہن ترزاں کشادۂ بازار — کہ خرد گرد او کشد پرگار
4۔ در محیطے کہ کلک صنع تو بست — چرخ چوں نقطۂ نہ نیست نہ ہست
5۔ دو جہاں را گرفتہ دریک مشت — نیستش ہم کنی بیک انگشت
6۔ ہرچہ جزتست آفریدۂ تست — نیک و بد ہر دو پروریدۂ تست
7۔ اے ہمہ از تو یافتہ آغاز — بازگشت ہمہ بسوئے تو باز
8۔ ہم تو پیدا دھم توئی پنہاں — ہم تو آغاز دھم توئی پایاں
9۔ ہرچہ جزتست نیست ہست نماست — بر تو ہستی راستیں شد راست
10۔ برسرِ ہر یکے نوشتۂ تست — ہر کجا گردنے برشتۂ تست
11۔ ای ز گنجائی خرد بیروں — پاک ز آلودگی چون و چگوں
12۔ چوں سویت رفت عقل دور اندیش — راہ خود بستہ دید از پس و پیش
13۔ نام تو خوانم و دلم لرزد — کانچنیں لب بداں نمی ارزد
14۔ من کہ باشم کہ باتو در سخنم — باد در دست و خاک در دہنم
15۔ اے زروئے تو خانہا روشن — وے زبوئے تو خاکہا گلشن
16۔ گرچہ دور از جہانیاں ہستی — اینت کاندرمیانِ جاں ہستی
17۔ گرچہ پاکاں نخواندہ یک رازت — تا مگس ہم رسیدہ آوازت
18۔ گرچہ یک کس ندید منزلِ تو — از ہمہ دل رہے است تا دلِ تو
19۔ نام تو مرہم ست بر دلِ ریش — یادِ تو شمع کلبۂ درویش

(حمید الدین فراہی رحمہ اللہ)

☆ ......سپاسِ یزداں (حمد خدا) کا اُردو ترجمہ جناب محسن فارانی نے کیا ہے جسے صفحہ نمبر 248 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

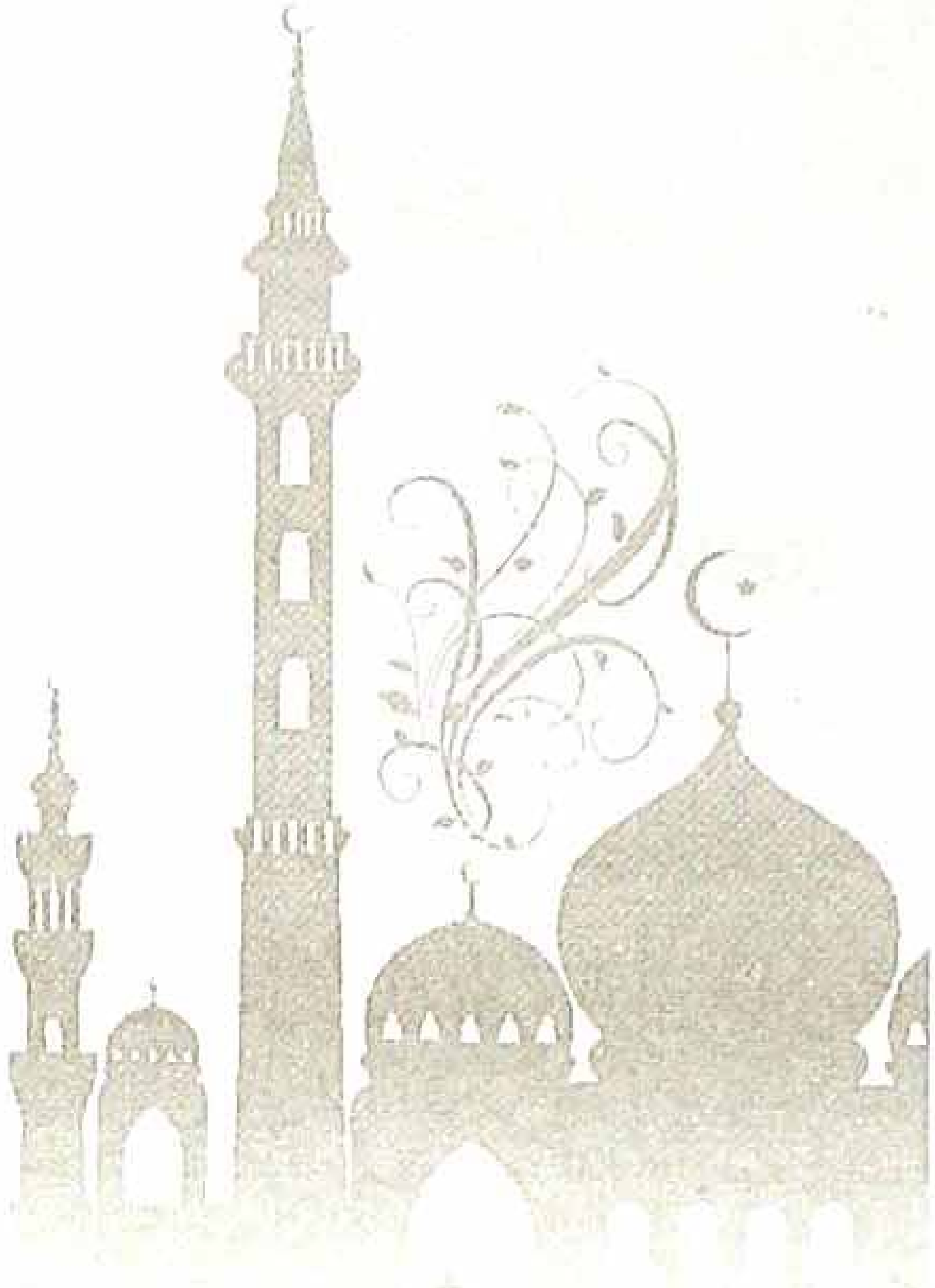

قومی و ملی مسائل

باب دہم

- نفاذِ شریعت
- ہماری سیاست کا بدنُما چہرہ
- اِنتخابی نتائج اور دینی جماعتیں
- دام ہمرنگِ زمیں
- مغرب کی ثقافتی یلغار
- مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ
- مِلت کے تحفظ کی ضرورت

Marfat.com

نفاذِ شریعت

1987ء کے آخر تک متحدہ شریعت محاذ کافی سرگرم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں شامل جماعتیں نفاذِ شریعت کے میدان میں کچھ کامیابی حاصل کر کے ہی دم لیں گی۔ ان کے لیڈروں کے بیانات کی گھن گرج اسلامی انقلاب کی آمد آمد کی منادی کر رہی تھی۔ خیال تھا کہ اگر حکومت نے اس وقت مجوزہ شریعت بل کی راہ میں روڑے اٹکائے تو ایک طرف ارکانِ پارلیمنٹ دھڑا دھڑ مستعفی ہونے لگیں گے اور دوسری طرف اسلامی انقلاب کے علمبردار اپنے کارکنوں کے جلو میں شہروں کی سڑکوں پر پکٹنگ کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم پر دینی جماعتوں کا اشتراکِ عمل اور جماعتی مصلحتوں سے بلند ہو کر امت کی خدمت کا عزم حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گا اور یوں نفاذِ شریعت کی راہ ہموار ہو جائے گی لیکن۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! چشم فلک نے یہ دیکھا کہ جب وقتِ قیام آیا تو رہنما سجدوں میں گر گئے۔ بعض نے بیرون ملک چلے جانے میں عافیت سمجھی۔ دوسرے اپنے جماعتی مصالح کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔ محاذ کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ شریعت بل ذہنوں سے اترنے لگا۔ اب قرائن بتاتے ہیں کہ متحدہ محاذ میں اتحاد نامی چیز بھی معرض خطر میں ہے اور محاذ کے ایک رکنِ رکین ڈاکٹر اسرار احمد نے تو شریعت بل کا مرثیہ بھی لکھ دیا ہے۔

شریعت بل میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ اس کے مجوزین شریعت سے قرآن و سنت کو مراد لیتے ہیں اور ان سے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے سنت خلفائے راشدین، تعامل صحابہ، اجماع امت اور مسلمہ فقہائے اسلام کی تشریحات سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ فقہی اختلافات کو نفاذِ شریعت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن یہ تاثر بالکل مصنوعی تھا۔ ہم نے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ علماء کے ذہنوں میں حقیقی وسعت پیدا ہوئے بغیر دلوں میں بُعد کے ساتھ اتحاد و اتفاق کی فضا زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ یہ اندیشہ اب حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ ماہنامہ البلاغ میں جناب محمد تقی عثمانی یہ فرما چکے ہیں کہ بنیادی طور پر شریعت کی اس تعبیر کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں جو ملک کے اکثریتی مکتب فکر کی تعبیر ہے اور عبادات، نکاح و طلاق اور وراثت جیسے امور میں ہر مسلم مکتب فکر کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد فکری ارتقا کے مراحل طے کرنے کے بعد اس وقت اسی نقطۂ نظر کے حامل ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے مخدوم مولانا حامد میاں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ جس طرح سعودی عرب میں فقہ حنبلی نافذ ہے اور حکومت ایران نے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کا مسلک فقہ جعفری ہے، اسی طرح حکومت پاکستان بھی اپنے فقہ حنفی پر ہونے کا اعلان کرے۔ 4 مارچ 1988ء کو جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) نے لاہور میں ایک کانفرنس

Marfat.com

منعقد کی جس میں نفاذِ شریعت کا مطالبہ دہرایا گیا۔ تقاریر میں جو بات نمایاں رہی وہ ملک میں فتاویٰ عالمگیری کے نفاذ کا مطالبہ تھا اور شریعت کے حق میں جس تحریک کے چلانے کا حکومت کو نوٹس دیا گیا وہ اب تنہا جمعیت چلانا چاہتی ہے۔ اہل حدیث اس بدلتی ہوئی فضا پر بہت جز بز ہو رہے ہیں اور جناب وزیر اعظم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ صرف اس شریعت کو نافذ کریں گے جو سب فرقوں کے لیے قابل قبول ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں جب تک فرقے متحد نہیں ہو جاتے موجودہ نظام برقرار رہے گا۔ شاید ان کا خیال یہ ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں نفاذِ شریعت کی راہ میں متعدد مشکلات حائل ہیں۔ حکمران طبقہ اس ذمے داری سے ہمیشہ جان چھڑاتا رہا ہے۔ یہ طبقہ معاشرے کے جس حصے سے آتا ہے اس میں شاید ہی کبھی یہ موضوع زیر بحث آتا ہو کہ ہماری زندگیاں شریعت کے دائرے میں آنی چاہئیں یا ملک کے نظام کو اس نظریہ کے مطابق تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ دین و شریعت کے مسائل کو یہ لوگ عملی زندگی سے الگ رکھتے ہیں اور ذہنی طور پر سیکولر ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لوگ عوامی تائید سے منتخب ہو کر ایوانِ حکومت میں پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کا کردار فی الجملہ وہی ہے جو ان کے منتخب کرنے والوں کا ہے۔ اگر عوام کے اندر دینی حس بیدار ہوتی تو وہ اپنے نمائندوں کے اندر بھی دین کی جھلک دیکھنا چاہتے اور جب وہ کرسیِ اقتدار پر ہوتے تو ان کو ان کی دینی ذمے داری یاد دلاتے رہتے۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ بس اتنا ہے کہ حکومت اسلام کا نعرہ تو برابر لگاتی رہتی ہے لیکن عملاً اس کی خاطر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔ لہٰذا نفاذِ شریعت، جب بھی ممکن ہوا، اس کی مصلحتوں کے علی الرغم [1] ہی ممکن ہوگا۔

جہاں تک علمائے کرام کا تعلق ہے وہ منصبی طور پر نفاذِ شریعت کے مطالبہ کا حق رکھتے ہیں اور انہی سے اس بات کی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ نفاذِ شریعت کی راہ ہموار کرنے میں معاون ہوں گے، لیکن بدقسمتی سے ان کا رویہ بھی ایسا ہے جس میں یہ کام نعرہ بازی تک ہی محدود رہتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ایک علماء کی تفرقہ بازی اور دوسری عملی ذمہ داری کے ادراک کا فقدان۔

تفرقہ بازی کے نتیجے میں نہ صرف علماء خود مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اُمت کو بھی انتشار کا شکار کیا ہوا ہے۔ انہوں نے فقہی مسلک کو اصل دین سمجھ لیا ہے اور اس کی خاطر قرآن و سنت کی نصوص تک کو قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اتحادِ امت کی کوئی کوشش ہوتی ہے تو وہ اپنے اپنے مسلک کا جھنڈا بلند کر کے میدان میں آ جاتے ہیں اور اس کی سرنگونی کو شریعت کی سرنگونی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا تفرقہ بازی کی ممانعت کا دوٹوک حکم تو انہیں کبھی یاد نہیں آیا لیکن اس کو جواز مہیا کرنے کے لیے ایک بے بنیاد حدیث...... (اختلافُ امتی رحمة) ''میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے'' ...... بڑے شد و مد سے پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دشمن اسلام کی گھڑی ہوئی ہے۔ ملا علی قاری نے اسے

---

[1] علی الرغم: برعکس، برخلاف

Marfat.com

الموضوعات الکبریٰ میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بے سند قول ہے۔

ہمارے نزدیک ہر فقہ، خواہ وہ حنفی ہو یا مالکی، امام شافعی کی ہو یا امام احمد کی، قرآن وسنت کے چشمۂ صافی سے پھوٹی ہے اور امت نے اسے سندِ قبول عطا کی ہے۔ دین ان فقہوں میں سے کسی ایک میں محصور نہیں ہے بلکہ ان سب میں اس کی نمود ہے۔ چونکہ ہر فقہ انسانی کوشش سے مرتب ہوئی ہے اور انسانی کوشش ناقص ہوتی ہے۔ اس لیے فی الجملہ ہر فقہ درست ہونے کے باوجود کمزوری کے بعض پہلو بھی رکھتی ہے اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام فقہوں کو پیش نظر رکھ کر ہر معاملے میں وہ بات متعین کرنے کی کوشش کی جائے جس کے حق میں قرآن وسنت کے دلائل زیادہ ہوں۔ ہمارے علماء اگر اس وسعتِ نظر کا مظاہرہ کریں تو ان کی صفوں میں وہ اتحاد پیدا ہوسکتا ہے جس پر آسمان کے فرشتے بھی ان کو ہدیہ تبریک پیش کریں گے۔ اس کے بعد ان کے مطالبہ نفاذِ شریعت میں ایسی قوت پیدا ہو جائے گی کہ حکومت آسانی سے اس سے جان نہیں چھڑا سکے گی۔

علماء کے عملی ذمے داری کے ادراک سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ ان دشواریوں کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیں جو نفاذِ شریعت کی راہ میں حائل ہیں اور عملی نوعیت کی ہیں، اور ان کو روکنے کے لیے وہ کام کریں جو ان کے کرنے کا ہے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ آپ بایں علم وتقویٰ اپنے لیے تو اجتہاد کا دروازہ بند سمجھیں لیکن ملک کے ہر مجسٹریٹ اور سول جج کو معاذ بن جبل، ابوالدرداء، سعید بن المسیب اور قاضی شریح کی مسند پر بٹھا کر چاہیں کہ وہ اجتہاد کرے۔ ججوں کے بس میں یہ کام اس وقت ہوگا جب آپ کچھ ایسی بنیادی دستاویزات ان کے حوالے کریں گے جن کی دفعات کے حوالے سے وہ فیصلے دے سکیں۔ اس کے لیے قلیل المیعاد منصوبہ یہ ہوسکتا ہے کہ ترکی کے مجلّہ احکام عدلیہ، فتاویٰ عالمگیری، اور مختلف اسلامی ممالک میں رائج شرعی احکام کے مجموعوں سے مدد لی جائے۔ ان میں کسی ممکنہ نزاع سے بچنے کے لیے تمام دینی جماعتوں کے نمائندہ اکابر کا ایک بورڈ ان مجموعوں کا جائزہ لے۔ اختلاف کی صورت میں وہ دلائل کی روشنی میں اُس بات کو اختیار کریں جو قرآن وسنت سے اوفق [1] ہو۔ اس کے اختیار کرنے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کریں۔ اجتہاد کا دروازہ اس مقصد کے لیے کھولنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ اگر ججوں کے بجائے یہ آپ کے ہاتھوں کھلے تو یہ زیادہ مبارک ہوگا۔ آخر جن لوگوں نے پہلے احکام کی تدوین کی ہے وہ بھی آپ جیسے علماء ہی تھے۔ اگر جذبہ صادق اور نیتیں نیک ہوں تو یہ کام نہایت قلیل مدت میں انجام دیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد حکومت پر زور دیا جاسکتا ہے کہ وہ اس متفق علیہ مجموعہ احکام کے نفاذ کے لیے اقدامات کرے۔ ان کے اس مطالبے کو نظر انداز کرنا حکومت کے لیے آسان نہ ہوگا۔ اگر علماء اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے ایک سیکولر ذہن کی حکومت سے قادیانی مسئلہ کا مذہبی نوعیت کا فیصلہ کروا سکتے ہیں تو نفاذِ شریعت کے لیے وہ اسی طرح کی فضا کیوں قائم نہیں کرتے؟ ہمیں خدشہ ہے کہ ذمے داریوں کے ادراک اور ان کی ادائیگی کے اقدام کے بغیر ہمارے ہاں شریعت بل جیسے ایلیے ہوتے رہیں گے اور احکام شریعت کے نفاذ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا، اور اس کی ذمہ داری محض حکومت پر نہ ہوگی بلکہ علمائے کرام خود اس کے ذمہ دار ہوں گے۔

[1] اوفق: سب سے زیادہ موافق

Marfat.com

ہماری سیاست کا بدنُما چہرہ

گزشتہ چند ماہ کے دوران ملکی سیاست میں جو ہیجان برپا رہا اس نے ہماری قوم کو جس کرب و اذیت میں مبتلا کیا اس کا تذکرہ اب تحصیل حاصل ہے۔ ① اس طویل اور روح فرسا کشمکش کے بعد ملک کی گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو بالآخر ساحل میسر آ گیا اور وقتی طور پر عوام نے سکون کا سانس لیا۔ یہ سکون حاصل کرنے کے لیے ملک کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی اس سے لوگوں کی اکثریت ناواقف ہے۔ حالانکہ یہ کھیل یونہی بلا مقصد نہیں کھیلا جا رہا تھا بلکہ اس سے خاص نتائج حاصل کرنا مطلوب تھا جو اب درجہ بدرجہ سامنے آ رہے ہیں اور ان کے ادراک کے لیے کسی گہری سیاسی بصیرت کی ضرورت نہیں، مثلاً بیس برس کی خوابیدگی کے بعد صنعتی میدان میں جو حرکت پیدا ہونے لگی تھی اس کا امکان پھر سے ختم کر دیا گیا۔ ملک میں بیرونی اثرات سے پاک آزاد معیشت کو رواج دینے کے لیے جو برے بھلے اقدامات کیے جا رہے تھے ان کو یک قلم روک دیا گیا۔ ملکی ترقی کے لیے ناگزیر طویل المیعاد منصوبوں پر قینچی چلائی گئی اور وہ منصوبے خاص طور پر زد میں آئے جن کا مقصد وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کو گرم پانیوں تک رسائی فراہم کرنا اور نقل و حمل کی سہولتیں مہیا کرنا تھا۔ ملکی انتظام کو ایسے ہاتھوں میں دے دیا گیا جنہوں نے آتے ہی قومی پالیسیوں کی باگ غیر ملکی اداروں کے ہاتھوں میں تھما دی، چنانچہ آج ہمارے اندرونی معاملات میں نہایت بدنما قسم کی غیر ملکی مداخلت جاری ہے اور محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی بڑے ملک کی نوآبادی ہیں۔

مذکورہ نتائج کی روشنی میں یہ کہنا قرین صواب ہوگا کہ کسی غیر مرئی قوت نے پاکستان کو اس بات کی سزا دی کہ اس نے نوآزاد وسط ایشیائی مسلم ریاستوں، بشمول افغانستان کو اسلامی تشخص کے ساتھ ایک اقتصادی بلاک میں شامل کرنے کی راہ ہموار کی اور ان کو گرم پانیوں تک رسائی کی سہولت فراہم کر کے ان کے مستقبل کو سنوارنے کا بیڑا اٹھایا۔ اسی غیر مرئی قوت نے غیر محسوس طریقے سے ملکی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملک و قوم کی بدقسمتی سے جلیل القدر مناصب پر فائز شخصیات اور ہمارے سیاستدان اس عمل میں اس قوت کے آلۂ کار بن گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

① اکتوبر 93ء میں ہونے والے انتخابات کی طرف اشارہ ہے۔ انتخابات سے ذرا پہلے مسلم لیگ کا ایک دھڑا عملاً پیپلز پارٹی کا ہم سفر اور معاون بن گیا اور بعض دینی جماعتوں نے بھی اسی پارٹی کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی آزاد ارکان اسمبلی اور دوسری چھوٹی پارٹیوں کی حمایت سے حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی کہ قوم انتخابات میں ایسے لوگوں کو منتخب کرتی جو قوم کو بیرونی اثرات سے آزادی دلانے کے ضامن ہوتے اور اقتدار کو محض اپنی تعمیر کے لیے استعمال نہ کرتے۔ (حسان عارف)

Marfat.com

قیام پاکستان سے لے کر اب تک یوں تو ہماری ملکی سیاست کبھی قابل فخر نہیں رہی لیکن پچھلے چند ماہ میں میدان سیاست کے شہ سواروں کی جو کج ادائیاں اور بے اعتدالیاں سامنے آئی ہیں انہوں نے ہر ذی شعور پاکستانی کو شرمسار کر دیا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ کیا ملک کا مستقبل بے اصول اور لا اابالی ❶ سیاست دانوں کے ہاتھوں میں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ اس سوچ کے لیے جن واقعات نے فضا پیدا کی وہ کچھ اس طرح ہیں:

(الف) ملک کے سب سے جلیل القدر منصب پر فائز شخصیت ❷ کے بارے میں اگر اس خوش فہمی میں بھی مبتلا رہا جائے کہ وہ کسی غیر ملکی طاقت کے مقاصد میں آلہ کار نہیں بنی، تب بھی یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس شخصیت نے محض اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے ایک مستحکم اور فعال حکومت کو ناکام کرنے کی ٹھان لی، ایک دستوری گنجائش کے ناروا استعمال سے اس کو رستے سے ہٹایا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس اقدام کے نتیجے میں ملک وقوم کا کتنا نقصان ہوگا۔

(ب) اس واردات کو جب عدالت عظمٰی نے دستور کے منافی اور ناروا قرار دے دیا تو اس شخصیت کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ اس نے اپنے گماشتوں کے ذریعے نظام عدالت ہی کا مذاق اڑوایا اور عملاً عدالتی فیصلے کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا خواہ اس میں ملکی سلامتی ہی کو داؤ پر لگانا پڑے۔

(ج) سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس شخصیت کے ڈفالی ❸ کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک مصنوعی بحران تشکیل دیا جس کا فی الاصل کوئی وجود نہ تھا۔ ان میں سے ہر شخص کو صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز تھا، قومی وملکی مفاد سے معاملات کو طے کرنے کی صلاحیت سے یہ گروہ عاری تھا۔

(د) اس نظریاتی ریاست کے اراکین کی سیاسی وابستگیاں کسی اصول، ضابطے یا نظریے کی پابند نہ تھیں بلکہ جس فریق کا ساتھ دینے سے ان کو اپنے مفادات پورے ہونے کی امید نظر آئی وہ اپنی جماعتی وفاداریاں راتوں رات تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہو لیے اور ملک کو غیر مستحکم کرنے کا باعث بنے۔

(ھ) قوم کے نمائندے جب تک ایوانوں میں رہتے ہیں ان کی اصل دلچسپی قوم و ملک کے مسائل حل کرنے کے بجائے اپنی ذات کی تعمیر کے کاموں سے ہوتی ہے۔ قیمتی پلاٹ سستے داموں خرید کرنا، درجنوں کاریں بغیر ڈیوٹی ادا کیے درآمد کرنا، مالیاتی اداروں سے قرض لے کر ان کی واپسی میں پس وپیش کرنا اور قرضے معاف کرانا، اپنے رشتہ داروں کو بلا استحقاق سرکاری ملازمتیں لے کر دینا، بیرون ملک علاج کروانے کے بہانے ملکی خزانے سے لاکھوں ہی نہیں کروڑوں روپے وصول کرنا، ان کے خاص مشاغل ہیں اور برسر اقتدار حکومتیں حکومت کے استحکام

---

❶ لا اُبالی: ''مجھے پروا نہیں'' مجازاً بے پروا، غیر ذمہ دار، بے باک

❷ یہ صدر غلام اسحاق خاں تھے جنھوں نے اپریل 1993ء میں ضد میں آ کر نواز شریف حکومت برطرف کر کے بدعنوان بے نظیر زرداری کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کی راہ ہموار کی۔ (حسان عارف)

❸ ڈفالی: دف یا طبلہ بجانے والا، طبلچی

Marfat.com

کے لیے اس معاملے میں ان کی دلجوئی پر مجبور ہوتی ہیں۔

(د) اس نظریاتی مملکت کی سیاسی پارٹیوں کے منشوروں میں اسلام کا تذکرہ محض برائے بیت ہوتا ہے۔ اس کی عملی تعبیر کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام ہے اور نہ کوئی پارٹی اس کو قرار واقعی اہمیت دیتی ہے۔ حتیٰ کہ دینی جماعتیں جو حزب اقتدار کو نفاذ اسلام کے مقصد سے بے وفائی کا طعنہ دیتے نہیں تھکتیں وہ اس کے لیے خود بھی کوئی بلیو پرنٹ نہیں رکھتیں اور نہ اس کے لیے انہوں نے کوئی ہوم ورک کیا ہے۔

یہ صورت حال اس مملکت خداداد کی ہے جو دشمنوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور وہ بڑی عیاری سے اس کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ اس مملکت پر اگر ایسے لوگ مسلط ہو جائیں جن کی آنکھیں اقتدار کے نشے اور حب دنیا نے حقائق سے بند کر رکھی ہوں تو قوم کی اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی [1] اور کیا ہوگی۔ آخرت کی جوابدہی کے احساس سے محروم ان سیاستدانوں کو شائد یہ سبق کسی نے نہیں دیا کہ نبی اکرم ﷺ نے رعایا کے ساتھ دھوکہ کرنے اور اس کی بدخواہی کرنے والے امرا کو جہنم کی خبر دی ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''حاکموں کے لیے ہلاکت ہے، سربراہوں کے لیے ہلاکت ہے، ذمے داروں کے لیے ہلاکت ہے۔ قیامت کے دن بہت سے لوگ ہوں گے جو تمنائیں کریں گے کہ کاش ان کی چوٹیاں ثریا سے بندھی ہوئی ہوتیں، وہ آسمان اور زمین کے درمیان لٹکے ہوئے ہوتے مگر کسی ذمے داری کے منصب پر مقرر نہ کیے گئے ہوتے۔''

اسلام میں بیت المال یا سرکاری خزانہ کو ذاتی جاگیر بنانے کا کوئی تصور نہیں۔ اس کا ایک ایک پیسہ قوم کی امانت ہوتا ہے۔ اس کو سیاسی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے حلیفوں میں حیلے بہانوں سے بانٹنا جائز نہیں۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''میں نے اللہ کے مال کو اپنے لیے یتیم کے مال کے درجہ پر رکھا ہے۔ اگر میں اس سے مستغنی [2] ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق اس سے اپنی ضرورت پوری کروں گا۔''

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ خلیفہ ہارون الرشید کی حکومت میں چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے خلیفہ کے حکم پر اسلامی مالیاتی نظام کے بارے میں جامع رپورٹ مرتب کی تو اس کے مقدمہ میں خلیفہ کو آداب حکمرانی کے باب میں کچھ نصیحتیں کیں جو ہر اس شخص کے لیے مشعل راہ ہیں جو مسلمانوں کے اندر اقتدار پاتا ہے۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امیر المؤمنین! میں آپ کو اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو امانت آپ کی حفاظت میں دی ہے اس کی حفاظت کیجئے اور جس چیز کی نگرانی کا بوجھ آپ پر ڈالا ہے اس کو پوری ذمے داری کے ساتھ اٹھائیے اور اس معاملے میں امداد اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف نہ دیکھئے۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امداد و رہنمائی حاصل کرنا چاہیں گے تو ہدایت کی سہل راہ آپ کے لیے دشوار گزار بن جائے گی اور اس

---

[1] حرماں نصیبی: بدقسمتی، بدنصیبی (حرمان: نا اُمیدی، مایوسی) [2] مستغنی: بے نیاز، جسے مال وغیرہ کی حاجت نہ ہو۔

Marfat.com

کے نشانات آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے، اس کی کشادگی آپ پر تنگ کر دی جائے گی، اس کا منکر معروف بن جائے گا اور معروف منکر بن جائے گا...... ہر آدمی سے اس نقصان کی بابت باز پرس ہوگی جو اس کے سپرد کیے ہوئے گلے میں واقع ہوگا کیونکہ اگر وہ چاہتا تو اس کو تباہی کے موقع سے دور رکھ کر اللہ کی توفیق سے اس کو نقصان سے بچا سکتا تھا اور اس کو زندگی اور نجات کے راستہ پر لا سکتا تھا...... آپ اس بات سے بچئے کہ آپ اپنی رعایا کو ضائع کریں اور اللہ تعالیٰ ان کا حق آپ سے وصول کرے اور چونکہ آپ نے اپنا اجر ضائع کر دیا اس لیے وہ بھی آپ کو ضائع کر دے۔ یاد رکھیے کہ عمارت کو سہارا دینے کی فکر اس کے گرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی سربراہ کاری اور حفاظت کا بار اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے آپ جو کچھ ان کے لیے کریں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا صلہ پائیں گے، اور ان کے جو حقوق آپ ضائع کریں گے اس کا وبال آپ پر آئے گا۔"

خدا کے خوف اور فکر آخرت سے عاری ہمارے سیاستدانوں نے ملکی سیاست کا چہرہ نہایت بدنما کر دیا ہے۔ اب قوم کو پھر ایک موقع ملا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اچھے لوگوں کو منتخب کرے۔ خدا کرے کہ انتخابات میں ایسے لوگ برسر اقتدار آ جائیں جو قوم کو بیرونی اثرات سے آزادی دلانے کے ضامن ہوں اور اقتدار کو محض اپنی تعمیر کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ ان کے لیے قوت محرکہ ایمان، اسلام، مسلمانوں کی دردمندی اور اصلاح احوال ہو تاکہ مملکت خداداد اقوام عالم میں عزت کا مقام حاصل کر سکے۔

دین حنیفی کی اصل

ذکر، شکر، صبر اور نماز۔

(تعلیقات، سورہ البقرہ: 151)

سورہ الاحزاب کی آیت (35) میں دس دینی اوصاف بیان ہوئے ہیں: اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، پاک دامنی اور کثرت سے اللہ کا ذکر۔ دین میں پہلی چیز اسلام ہے اور اس کی تکمیل ایمان سے ہوتی ہے اور یہ دونوں پورے دین کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ قنوت اسلام کی روح ہے اور صدق ایمان کی بنیاد ہے۔ صبر و خشوع مومن کی طبیعت کا حصہ ہیں۔ صبر کے اندر سختی ہوتی ہے اور خشوع کے اندر نرمی ہوتی ہے۔ انسان میں خیر و صلاح کی تکمیل انھیں دو متضاد صفتوں سے ہوتی ہے۔ اور قلب جب پوری طرح صالح بن جاتا ہے تو اس کے اندر سے اچھے پھل برآمد ہوتے ہیں۔ پاک دامنی روزہ سے حاصل ہوتی ہے اور یہ روزہ ہی کے قسم کی چیز ہے۔ جس طرح صدقہ مال کی پاکی ہے اسی طرح روزہ اور پاک دامنی نفس کی پاکی ہے۔ اور ذکر الٰہی کے لیے پاکی ضروری ہے نیز وہ خود بھی قلب کو پاک کرنے والی چیز ہے۔ یہ چاروں اعمال تزکیہ میں داخل ہیں۔

چنانچہ معاملات دین کو اسلام سے شروع کیا اور پاک نفسی پر ختم کیا جو راہ سلوک کی غایت اور منتہا ہے جیسا کہ فرمایا ہے ((قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا)) اور کثرت ذکر سے تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے جیسا کہ آگے چند آیتوں کے بعد واضح کر دیا ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، تعلیقات، سورہ احزاب)

Marfat.com

انتخابی نتائج اور دینی جماعتیں

اکتوبر 1993ء کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان پیپلز پارٹی دوسری چھوٹی پارٹیوں اور آزاد ارکان اسمبلی کی حمایت سے حکومت حاصل کرنے میں کامیاب رہی جبکہ پاکستان مسلم لیگ کو حزب اختلاف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ انتخابات سے ذرا پہلے مسلم لیگ کا ایک دھڑا عملاً پیپلز پارٹی کا ہم سفر اور معاون بن گیا اور بعض اہم دینی جماعتوں نے بھی اسی پارٹی کا ساتھ دیا اس لیے انتخابی نتائج کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں رہے۔ انتخابی تجزیوں سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ اگرچہ پیپلز پارٹی کے بارے میں پروپیگنڈا اور تاثر غریب عوام کی نمائندہ جماعت کا ہے لیکن ملک کے جاگیر دار طبقہ میں اسی پارٹی کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، چنانچہ جن علاقوں میں جاگیرداریاں اور بڑی زمینداریاں ہیں ان علاقوں سے وڈیرے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں۔

ہمارے لیے انتخابات کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان میں دینی جماعتوں کے نمائندے بہت کم کامیاب ہوئے ہیں، اس لیے خطرہ ہے کہ حکومت کے ایوانوں میں اہل دین کی آواز بہت کم پہنچے گی اور نہایت کمزور بھی ہوگی۔ ماہرین شماریات کے اندازے کے مطابق پورے ملک میں دینی سیاسی جماعتوں کو کل تیرہ لاکھ ووٹ ملے جو ڈالے گئے ووٹوں کا 6.7 فیصد یعنی صرف پندرھواں حصہ ہیں۔ اس طرح ان کے کل نو نمائندے قومی اسمبلی میں جا سکے۔ دینی جماعتوں کی اس ناکامی پر اسلام دشمن لوگوں نے بغلیں بجاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کی گرفت کمزور اور اسلامی بنیاد پرستی کو شکست ہوئی ہے۔ اس پروپیگنڈے کا جواب یہ دیا گیا ہے اور یہ ہمارے خیال میں درست بھی ہے کہ انتخابات میں اسلام بطور قضیہ پیش نظر تھا ہی نہیں۔ ووٹ اسلام کے رد وقبول کے لیے نہیں بلکہ انتظام مملکت کو چلانے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ عوام نے ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لیے جن لوگوں کو موزوں سمجھا ان کو منتخب کیا لہٰذا اسلام کے حوالہ سے انتخابی نتائج کو کسوٹی بنانا ایسا کرنے والوں کی بدنیتی کا مظہر ہے۔

تاہم چونکہ مذہبی جماعتیں سیاسی اکھاڑے میں اتریں اور ان کے ہاں کامیابی کا تناسب کم رہا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اہل دین اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھنے کے لیے ان وجوہ کا تعین کریں جن کے باعث مذہبی طبقہ کو انتظام حکومت کے لیے موزوں نہیں پایا گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجوہ حسب ذیل ہیں:

(الف) علماء منبر و محراب سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ بالعموم مساجد ہی کو انتخابی مہم کا محور و مرکز بناتے ہیں۔ عملاً صورت حال یہ ہے کہ عوام کی کثیر تعداد مساجد کی حاضری سے کوئی رغبت نہیں رکھتی لہٰذا اس تک علماء کی آواز بھی نہیں

Marfat.com

پہنچتی۔ انتخابات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ امیدوار اپنے حلقے کے ایک ایک ووٹر تک پہنچے اور جہاں برادریاں موثر ہوں وہاں جوڑ توڑ کے ذریعے برادریوں کی معاونت حاصل کرے۔ علماء چونکہ ایسا کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس لیے ان کو عوام الناس میں پذیرائی نہیں ملتی۔

(ب) علماء نے اپنے منشوروں میں بالعموم جن مسائل کو اجاگر اور اپنی مہم کا موضوع بنایا وہ نہایت محدود نوعیت کے تھے جن کی افادیت عوام الناس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے بالعموم یہ تاثر قائم ہوا کہ علماء میں قومی تقاضوں کے شعور کا فقدان ہے۔ قوم ان سے وسیع دائرے میں رہنمائی کی طالب تھی اور وہ اس طلب کو پورا نہ کر سکے۔

(ج) جن دینی جماعتوں نے اپنے منشوروں میں قومی مسائل کا تذکرہ کیا بھی تو اس کو سیاسی پارٹیوں کی نقالی سمجھا گیا اور ان کو محض انتخابی نعرے اور خالی دعوے سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دینی جماعتوں کے پاس قومی مسائل کے حل کے لیے کوئی واضح پروگرام نہیں تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ نعروں اور دعووں کو حقیقت بنانے کے لیے جس ہوم ورک کی ضرورت ہے وہ علماء نے خود نہیں کیا اور اس کے لیے جو منصوبہ بندی مطلوب ہے وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس کی بڑی وجہ جدید نظام معیشت کے مسائل سے ان کا ناآشنا ہونا اور ریاست کے تقاضوں کو نہ سمجھنا ہے۔

(د) بعض دینی جماعتوں نے دین و اخلاق ہر چیز کو خیر باد کہہ کر دنیا دار سیاست دانوں کے طور طریقے اپنا لیے۔ انہوں نے عوام کو متاثر کرنے کے لیے جھوٹے نعروں، فلمی طرز کے گانوں، سوانگ اور رقص تک کا سہارا لیا۔ [1] ان کی نہایت غیر سنجیدہ بلکہ غیر اخلاقی مہم یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ یہ لوگ خود دینی و اخلاقی اقدار کا کتنا لحاظ رکھنے والے ہیں اور ان کی اصول پسندی کی حدود کیا ہیں۔ ان کے اخلاق باختہ رویہ نے عوام کو دینی طبقہ سے مایوس ہی نہیں بلکہ متنفر کیا، اس نفرت کا اظہار انہوں نے دینی جماعتوں کے نمائندوں کو ووٹ نہ دے کر کیا۔

فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان انتخابات نے دینی جماعتوں کو یہ سبق دیا ہے کہ عوام اپنے دینی رہنماؤں کو باوقار، بااخلاق اور بااصول دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ علماء ان کے لیے علم دین کی شمع روشن رکھیں، ان کی تعمیر سیرت کے کاموں میں منہمک ہوں، ملک کو درپیش جدید مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کریں اور سیاست کے شیطانی کھیلوں میں ملوث ہو کر اپنے آپ کو بے آبرو نہ کریں۔ یہ کام ظاہر ہے انتخابی سیاست سے نہیں ہو سکتے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گہرے علم اور مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ اگر علماء یہ ذمہ داری پوری کر سکیں تو قوم ہی نہیں پوری امت ان کی مرہون منت ہوگی۔

---

[1] امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد نے نواز شریف کی دشمنی میں "اسلامک فرنٹ" بنا کر اس کے پلیٹ فارم سے انتخابی مہم چلائی، سولہ گھوڑوں کی بگھی پر سوار ہوئے، مسلم لیگ سے سیٹ ایڈجسٹمنٹ سے بھی گریز کیا، بے نظیر کے ہمدرد میڈیا نے قاضی صاحب کے جلسوں کو بڑے کر کے دکھایا جس سے قاضی صاحب نے تیسری سیاسی قوت ہونے کا دعویٰ کر ڈالا۔ یوں ان کی منفی سیاست کا سارا فائدہ بے نظیر زرداری کو پہنچا اور وہ اکتوبر 1993ء میں دوسری بار وزیر اعظم بن گئیں جب کہ اسلامک فرنٹ کو قومی اسمبلی کی صرف تین نشستیں ملیں۔
(محسن فارانی)

Marfat.com

دامِ ہمرنگِ زمیں

جمہوریت بہترین طرز حکومت ہے جس میں عوام الناس مملکت کے انتظام میں خود شریک ہوتے ہیں، اپنی مرضی کے فیصلے کرتے، اپنی فلاح و بہبود کے منصوبے تشکیل دیتے اور ان کو عمل میں لاتے ہیں۔ جمہوریت کے سوا ہر طرز حکومت قابل مذمت ہے کیونکہ اس میں عوام کی رائے کو دخل نہیں ہوتا۔ ملک و وطن سے محبت جزو ایمان ہے۔ نسلی طور پر اپنی قوم سے وابستگی، اس کو دوسری قومیتوں پر ترجیح دینا اور ہر قیمت پر اس کو فائدہ پہنچانا ایک اعلیٰ جذبہ ہے۔ اس کے منافی کام اپنی قوم سے غداری ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اس حیثیت کی بنا پر اس کو تقریر و تحریر، شغل و تفریح، کام کاج، ہر چیز میں آزادی کے حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق کو سلب کرنا یا ان پر پابندی عائد کرنا ظلم اور بے انصافی ہے۔ خواتین انسانی آبادی کا نصف ہیں۔ نصف آبادی کو معطل کر دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں۔ ان کے ساتھ برابری کا سلوک ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ان کو مردوں کے مساوی قرار دینے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ قابل نفرت ہے اور خواتین کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ بزور اس سے اپنے حقوق منوائیں۔

مذکورہ بالا تمام خیالات کا ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے پرچار اس قدر تسلسل کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ان کا قائل ہو چکا ہے۔ وہ ان کو بالکل سامنے کی حقیقتیں تسلیم کرتا ہے جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان یقین رکھتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں عوام الناس کو اسلام نے اتنا اعتماد دیا کہ وہ حکومت کے سربراہوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے اور ان کا محاسبہ کرتے۔ اسلامی ریاست کی عدلیہ ایک عام آدمی اور اشراف کے درمیان کسی امتیاز کی روادار نہ تھی، وہ ہر شخص کو اس کا حق دلاتی تھی، لہٰذا اسلام سے زیادہ جمہوریت پسند نظریہ اور کون سا ہے؟ اسی طرح ارباب اختیار اور عوام الناس کے لیے نصح و خیر خواہی کا جذبہ تو ہر مسلمان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ ایک مسلمان اپنی قوم کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے؟ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو با اختیار اور آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے حقوق کو سلب کرنا یقیناً ظلم ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں نہایت ناپسندیدہ ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کی پاسداری سے ایک مسلمان کس طرح پہلو تہی کر سکتا ہے؟ خواتین کو دین نے بلند مرتبہ دے رکھا ہے۔ ان کی خدمات بحیثیت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی نہایت شاندار ہیں۔ ان کے ساتھ ظلم اور زیادتی کا رویہ وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کا مطلق احساس نہ ہو۔ اسلام کی ان تعلیمات کی روشنی میں ایک مسلمان متذکرہ بالا تصورات کو اپنے لیے اجنبی نہیں سمجھتا اور جب وہ میڈیا میں ان کا

Marfat.com

پروپیگنڈا سنتا ہے تو ان تصورات کی تائید کرنے لگتا ہے۔

لیکن معاملے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب سے آئی ہوئی جمہوریت، نیشنلزم، بنیادی انسانی حقوق اور آزادی نسواں کی اصطلاحیں ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں جس سے اسلام کا کوئی تعلق ہے اور نہ مسلمانوں کا ذہن اس سے آشنا ہے۔ مثلاً مغربی تصور جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا حق انسانوں کا ہے۔ ان کی اکثریت اگر کسی باطل کو حق کہنا شروع کر دے اور کسی حق کو باطل قرار دے دے تو یہ بات مملکت کا دستور بن جائے گی۔ امر واقعی بھی یہی ہے کہ بعض خلاف فطرت گھناؤنے جرائم کو مغربی معاشروں نے محض اس لیے درست تسلیم کر رکھا ہے کہ عوامی نمائندوں کی اکثریت کی رائے ان کے حق میں تھی۔ اس کے برعکس اسلام میں کوئی بھی حکومت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو چیلنج نہیں کر سکتی اور نہ کوئی مسلمان یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی قرار دے دے۔ پس اسلام میں جمہوریت کا تصور اس سے مختلف ہے جو آج مغربی ممالک میں رائج ہے۔

نیشنلزم کے مغربی فلسفے میں یہ بات شامل ہے کہ حق و انصاف نام کی کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ اپنی قوم صحیح یا غلط جو چاہتی ہو، اس کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ عقیدہ و مذہب کی بنا پر قوم میں وحدت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اسی فلسفے کے زہر نے مسلمانوں کے نظام خلافت کو نابود کرنے میں موثر کردار ادا کیا اور عربوں کو تقسیم کر کے ان کی قوت ختم کر دی۔ آج بھی مغرب جس بڑے ملک کی قوت ختم کرنا چاہتا ہے اس میں ایسی تحریکوں کی پشت پناہی کرتا ہے جو قومیت کے جذبات کو ابھارنے والی اور ملکی وحدت کو ختم کرنے والی ہوں۔ اس کے برعکس اسلام نے ایک آفاقی نظریہ دیا ہے اور عقیدۂ دین کی بنیاد پر ایک امت بنائی ہے۔ کسی بھی جغرافیائی حدود میں رہنے والے، کسی بھی رنگ اور نسل کے اور کوئی بھی زبان بولنے والے افراد اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے خونی و نسلی رشتوں اور قومیتوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی نصیحت کی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دائرے میں بھی مغربی نیشنلزم کا تصور اسلام سے متصادم ہے۔

یہی صورت حال بنیادی انسانی حقوق کی ہے۔ اسلام ہر شخص کو حقوق عطا کرتا ہے لیکن چونکہ انسان کی خواہشات اس کو غلط رخ پر بھی لے جا سکتی ہیں اس لیے وہ اس پر پابندیاں بھی عائد کرتا ہے تاکہ وہ دوسرے انسانوں کے حقوق تلف کرنے والا نہ بن جائے اور اس کی آزادی اس کو تباہی کی طرف نہ لے جائے، اسلامی شریعت ایسی پابندیوں سے عبارت ہے۔ اس کے برعکس مغرب انسان کو ایسے بنیادی حقوق دینا چاہتا ہے جس کے تحت وہ مادر پدر آزاد ہو جائے، اس کے اندر اعلیٰ اخلاقی قدروں کا کوئی پاس ولحاظ نہ ہو اور ہر شخص صرف اپنے مفاد کو عزیز رکھے۔ ظاہر ہے کہ مغرب اور اسلام کے دیے ہوئے بنیادی حقوق میں زمین اور آسمان کا بُعد ہے۔

یہی حال خواتین کی حیثیت کا ہے۔ اسلام نے جس طرح انسانی بنیادی حقوق میں آزادی اور پابندی کا امتزاج رکھا ہے اسی طرح خواتین کے حقوق و فرائض میں اس نے توازن قائم کیا ہے۔ اسلام میں عورت کو گھر کے اندر وہ

Marfat.com

حقوق دیے ہیں جو آج تک مغرب بھی اپنی خواتین کو نہیں دے سکا لیکن بیرون خانہ اس پر بعض پابندیاں بھی عائد کی ہیں جن کا مقصد اس کی عزت و عفت کا تحفظ ہے۔ اس کے برعکس مغرب عورت کو بے محابا آزادی دے کر اس کو نکاح تک کی پابندی سے آزاد کر کے سبھا [1] کی پری بنانے کا قائل ہے۔ مغرب کے اس نقطۂ نظر کی اصل بنیاد تو اخلاقی فساد اور شیطنت ہے جس کی سزا عائلی نظام کی تباہی کی صورت میں اس نے پا لی ہے۔ تاہم وہ اس فساد کو تمام دنیا میں پھیلانے کا خواہشمند ہے تاکہ اس پر انگلی رکھنے کا کسی کو موقع نہ ملے اور وہ ساری دنیا کی ناک کٹوا دے۔

تہذیب مغرب اور اسلام کے تصورات کا اختلاف انہی چند اصطلاحات تک محدود نہیں بلکہ آج میڈیا میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ الفاظ بظاہر بے ضرر نظر آئیں لیکن حقیقت میں ان سے مراد وہ معنی لیے جائیں جو اہل مغرب ان کو پہناتے ہیں۔ یہ دام ہم رنگ زمین ہے۔ مغرب ہمیں غلط فہمی میں ڈال کر اپنا بندۂ بے دام بنانے پر تلا ہوا ہے۔ مثلاً بنیاد پرستی اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور اس کا مفہوم اس حقیقی اسلام کو اختیار کرنا ہے جو قرآن و سنت میں ہے، لیکن مغرب نے اس کو ایسی گالی بنا دیا ہے کہ مسلمانوں کے زعما اس کے ساتھ نسبت سے ڈرتے اور یہ وضاحتیں کرتے ہیں کہ وہ فنڈامنٹلسٹ نہیں ہیں۔ دہشت پسندی اسلام میں ہرگز پسندیدہ نہیں ہے لیکن مغرب اس لفظ کا سیاسی استعمال کرتا ہے اور ان قوموں کو دہشت گرد قرار دیتا ہے جو اپنے قومی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ اسلام کا تصور جہاد بھی اس کے نزدیک دہشت گردی ہے جبکہ اسرائیل اگرچہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ملک ہے لیکن اس پر اس لفظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔

مغرب کے اس انداز تعبیر سے دوسرے مذاہب والوں کو فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان کے پاس مغربی تصورات کے مقابل پیش کرنے کے لیے کوئی نظام موجود نہیں۔ اسلام چونکہ زندگی کے ہر دائرے میں واضح حدود مقرر کرتا ہے اس لیے وہ مغرب کی اس شیطنت کا اصل ہدف بنتا ہے اور ہمارے ارباب اختیار مغرب کے آلہ کار بننے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ وہ ان باطل تصورات کی ترویج عوامی پیسے کے زور سے کرتے اور اس کے بدلے میں بڑے ممالک کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

حال ہی میں بیجنگ میں خواتین کی بہبود کے نام پر منعقد ہونے والی کانفرنس نے خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں جو فیصلے کیے ہیں وہ نہ صرف اسلام بلکہ ہر اس نظام کو للکارتے ہیں جو عورت کی عصمت و عفت کو اس کی قیمتی متاع سمجھتا ہے۔ یہ فیصلے دنیا میں شیطان کا ناچ شروع کرنے کا باعث ہوں گے اور ان کا نتیجہ اس صورت میں نکلے گا کہ آج مغرب جس عائلی فساد اور اخلاقی انتشار میں مبتلا ہے، وہ متعدی ہو کر پورے عالم پر چھا جائے گا۔ ہماری وہ محترمات جنہوں نے کانفرنس میں اپنے اسلامی ملک کی نمائندگی کی تھی وہ آج کانفرنس کے نتائج کے بارے میں منقار زیر پر [2] ہیں۔ ان کا کوئی بیان یا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ حالانکہ انہیں اب کامیابی کا کریڈٹ لینے کے لیے سرگرم ہونا

---

[1] سبھا: مجلس، اسمبلی [2] منقار زیر پر: پروں کے نیچے چونچ دبائے ہوئے، خاموش

Marfat.com

چاہیے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ اس انتظار میں ہیں کہ عوام کے حافظہ سے کب اس کانفرنس کے نتائج محو ہوتے ہیں کہ وہ اگلے مراحل پر کام شروع کر سکیں۔

بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اور اقوام متحدہ کی آشیر باد سے ہونے والے فیصلوں کا خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام اگلے مراحل میں ان فیصلوں کو حکومتی اہل کاروں کی مدد سے قانون کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جو ممالک اس پر آمادہ نہیں ہوتے ان پر بین الاقوامی پابندیاں لگا کر ان کو بے دست و پا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہمیں ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنی آنکھیں موند لیں تو ہماری مرضی۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ عوام مغرب کے اس دام ہم رنگ زمین کو پہچان جائیں اور اس کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ارباب اختیار آسانی سے مغرب کے آلہ کار بن جائیں۔ دوسری صورت میں انہیں تیار رہنا چاہیے کہ مغرب ان کے دین و اخلاق کی جڑیں کاٹنے سے باز نہیں آئے گا اور وہ اپنی متاع دین و ایمان گنوا بیٹھیں گے۔

اسم اللہ کا مفہوم

''اللہ'' میں الف، لام تعریف کے لیے ہے۔ یہ نام صرف اللہ واحد کے لیے مخصوص ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اسلام سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی اس کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ وہ مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے برابر قرار نہیں دیتے تھے اور اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے دیوتاؤں کو وہ صرف اس وجہ سے پوجتے تھے کہ ان کے خیال میں وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی سفارش کریں گے۔

قرآن شریف میں ان کے اقوال نقل ہیں:

(مثال کے طور پر دیکھئے سورہ یونس:18، سورہ زمر:3، سورہ العنکبوت:61۔63)

بعض مسیحی اہل قلم کا خیال ہے کہ اس نام (اللہ) کی اصل ''ایل'' ہے جو اکثر عبرانی ترکیبوں میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً اسرائیل (اللہ کا بندہ)، اسماعیل (اللہ نے سنی)، عمانول (اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔

پہلا لفظ جس سے تورات شروع ہوتی ہے ''الوھیم'' کا لفظ ہے، یہ لفظ تورات میں اکثر آیا ہے اور یہی ''ایل'' کا اصل ہے۔

لفظ اللہ دین صحیح کے ان باقیات صالحات میں سے ہے جو عربوں کو وارثت میں ملی تھیں۔ یہود و نصاریٰ نے اس لفظ کو ضائع کر دیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کے یہاں کوئی خاص لفظ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ وہ اللہ کا لفظ غیر اللہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لفظ اللہ ان کے یہاں ''سید'' کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، تفسیر نظام القرآن، تفسیر آیت بسم اللہ۔ ص:73۔74)

Marfat.com

مغرب کی ثقافتی یلغار

قرآن مجید کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزول کے بیشتر حصے میں اہل کتاب کی دلداری خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی۔ ان کی جانب سے جب کوئی مثبت جواب نہ ملا تب ان کے لیے سخت لب ولہجہ استعمال کیا گیا، تاہم ان سے مشرکین عرب سے الگ معاملہ کیا گیا اور جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر ان کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے فی الجملہ اہل کتاب کے ساتھ حسن سلوک ہی کا معاملہ کیا۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ مدینہ منورہ کی اسلامی مملکت کی شمالی و مغربی سرحدیں رومی سلطنت کے ساتھ ملتی تھیں اس لیے نصاریٰ کا مسلمانوں کے مقابلے پر آنا ناگزیر ہو گیا اور وہ جنگوں میں بحیرہ روم کے گرد واقع اپنے زیرنگیں بعض علاقے گنوا بیٹھے۔ یہ علاقے جب مسلمانوں کی عملداری میں آئے تو ایمان وتقویٰ، عدل وقسط اور مساوات پر مبنی نظام حکومت نے رعایا کو نئی حکومت کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ مثال دوسرے علاقوں کے لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی اور وہ بھی خواہشمند ہوئے کہ مسلمان ان کو حکومتوں کے ظلم واستبداد سے نجات دلائیں۔ چنانچہ اسلامی مملکت کی سرحدیں سال بسال آگے بڑھتی چلی گئیں حتیٰ کہ ہسپانیہ، سسلی اور موجودہ ترکی کے علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے۔ یہ تمام علاقے پہلے نصاریٰ کے زیرنگیں تھے لہٰذا ان کو زخم خوردگی کا احساس ہوا۔ اس کا جواب انہوں نے شدید تعصب، جھوٹے پروپیگنڈے، سازشوں اور جنگ وجدل سے دیا۔ قرآن مجید اور پیغمبر ﷺ کی ذات کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور تحقیر آمیز بے بنیاد افسانے گھڑ کر لوگوں میں پھیلائے گئے۔ پورے یورپ میں عیسائیوں کے جذبات مشتعل کر کے ان کو مسلمانوں کے مرکزی علاقوں پر چڑھا لایا گیا جس کے نتیجے میں صلیبی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سسلی اور ہسپانیہ کے علاقے عیسائیوں نے مسلمانوں سے واپس لے لیے تو انہوں نے ترکی کے راستے یورپ میں پیش قدمی کر لی اور جنوب مشرقی یورپ کے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔ اس طرح نصاریٰ کے دلوں میں انتقام کا جذبہ سرد نہ ہو سکا اور وہ نئے ولولے سے ترکوں کو نابود کرنے کی راہیں سوچنے لگے۔

سترھویں صدی عیسوی میں بالعموم امت مسلمہ پر ادبار کے سائے منڈلانے لگے تو یورپ کو اس سے ہمہ گیر انتقام لینے کا موقع ملا۔ مسلمانوں پر سیاسی تفوق حاصل کرنے میں انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی فنی برتری کے بل بوتے پر ان کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اس تسلط کے باعث ان کو مسلمانوں کے معاشی استحصال کا موقع تو ملنا ہی تھا، اس کے علاوہ انہوں نے سیاست، تعلیم اور معیشت میں ایسی دوررس تبدیلیاں کر دیں جن کے باعث مسلمانوں کو ان کی دینی تعلیمات اور اخلاقی اقدار سے بے گانہ کرنے کے مقصد کے حصول میں نصاریٰ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ کوشش بھی کی گئی

Marfat.com

کہ پادریوں کے ذریعے تبدیلیٔ مذہب کا رجحان پیدا کیا جائے لیکن جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو ایسے طریقے اختیار کیے گئے جن کے نتیجے میں مسلمان اگر عیسائی نہ بھی ہوں تو کم از کم وہ مسلمان بھی نہ رہیں۔

بیسویں صدی کے وسط میں مغربی اقوام نے اپنے مصالح کے تحت مسلمانوں کے علاقوں سے اپنا براہ راست تعلق ختم کر لیا لیکن اس سے پہلے ایسے ادارے قائم کر دیے جن کے ہوتے ہوئے ان ریاستوں میں بالواسطہ حکومت کرنا ممکن رہے۔ چنانچہ ہر جگہ زمام کار ایسے لوگوں کے سپرد کی گئی جو اہل مغرب کے تربیت یافتہ اور آزمائے ہوئے تھے۔ مغربی دنیا کے دانشور آج غیر مبہم الفاظ میں لکھتے ہیں کہ اس وقت امت مسلمہ ہمارے شکنجے میں ہے۔ جس طرح ایک کیکڑا اپنے بہت سارے پنجوں میں شکار کو دبوچ لیتا ہے تو وہ جب چاہے اور جدھر سے چاہے اس پر اپنی گرفت مضبوط کر سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح امت مسلمہ آج مغرب کے پنجوں میں گرفتار ہے اور وہ جب اور جیسے چاہیں اس کو ہر طرح سے زک پہنچانے پر قادر ہو چکے ہیں۔ کسی اسلامی ملک کی فوج کو شکست سے دوچار کرنا ہو، اس کی معیشت کو تباہ کرنا ہو، اس کے حکمرانوں کو تبدیل کرنا ہو، اس کی پالیسیوں کو اپنے مفاد میں ڈھالنا ہو، یہ سب کچھ نہایت آسانی سے کرنا ممکن ہو چکا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈپلومیسی کی زبان سے وہ عناد اور تعصب ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیا جاتا جو اہل مغرب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف پایا جاتا ہے اور یہ تمام کام بالواسطہ طریقہ سے کر لیے جاتے ہیں۔

سوویت یونین کے متعلق اب یہ رائے بھی دی جاتی ہے کہ وہ امریکہ ہی کی پالیسی کے تحت قائم رہی اور جب اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو گئے تو اس کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ اس کے خاتمے کے بعد امریکہ کے صدر کا یہ بیان آیا کہ اب امریکہ کا مقابلہ اسلام سے ہے [1] اور نیو ورلڈ آرڈر [2] کے تحت مسلم ریاستوں کے ساتھ اب معاملہ سختی سے کیا جائے گا۔ اس بیان میں اس انتقامی جذبہ کی جھلک موجود ہے جو اہل مغرب کے دلوں میں اسلام کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اس پالیسی کے تحت مشرق وسطی کے مسلم ممالک کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ ہر صاحب ایمان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اس سے بھی شدید تر عذاب وہ تہذیبی و ثقافتی یلغار ہے جو میڈیا یعنی اخبارات و رسائل، فلموں، ٹی وی، اور انٹرنیٹ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ اس یلغار کے مقاصد میں مسلمانوں کو مرعوب کرنا، اسلامی تعلیمات کو بے وقعت قرار دینا، اسلام کے دشمنوں کے قصیدے پڑھنا، دین کے خادموں کے لیے دہشت گرد اور تخریب کار کے القاب استعمال کرنا اور مغربی ثقافت اور رسوم و رواج کو قابل تقلید رویہ کی حیثیت سے روشناس کرانا شامل ہے۔ اس ثقافتی یلغار کا مشاہدہ ہر ملک میں ہو رہا ہے۔ ہمارے اپنے ملک کا میڈیا اس وقت سب سے زیادہ جس طبقے کو معزز بنا کر پیش کر رہا ہے وہ ناچنے والوں، اداکاروں، گانے والوں اور گانے والیوں کا طبقہ ہے۔ یہ اپنے پروگراموں میں شعائر اسلام کا برملا مذاق اڑاتے اور بداخلاقیوں کا پرچار کرتے ہیں۔ جو غیر اخلاقی مناظر پہلے

---

[1] یہ بیان سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے دیا جو جنوری 1969ء سے اگست 1974ء تک برسر اقتدار رہے تھے۔

[2] نیو ورلڈ آرڈر کا نظریہ سی آئی اے کے سابق سربراہ اور امریکی صدر جارج ہربرٹ واکر بش کا تھا جو جنوری 1989 سے جنوری 1993ء تک وائٹ ہاؤس میں مقیم رہے۔

(حسان عارف)

Marfat.com

سینماؤں تک محدود تھے اب ان کو کیبل کی نشریات نے گھر گھر پہنچا دیا ہے اور ان سے نفرت کا احساس روز بروز مردہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ میڈیا بڑی تیزی سے ہمیں دینی اقدار سے بے گانہ کر دے گا۔

اہل مغرب ہر کام ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو سکرین کی راہ سے بداخلاقی کی ترغیب دینے میں کامیابی ہوئی ہے اور یہ امت اس چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکی تو اب انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور عین امت مسلمہ کے قلب میں نام نہاد بہبود آبادی کانفرنس منعقد کی۔ اس میں کثیر تعداد میں مسلمان ممالک کو کانفرنس کے معینہ مقاصد کے لیے کام کرنے پر تیار کیا گیا۔ اس کانفرنس کے مقاصد سراسر خلاف اسلام ہیں جن کی تفصیل پریس میں آ چکی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک کے وفود نے ان کو بہ دل وجان قبول کر لیا۔ کانفرنس کی منظور کردہ قرارداد میں ایک شق جو بظاہر اس مقصد سے داخل کروائی گئی ہے کہ ہر ملک اپنے نظریہ حیات کی روشنی میں بہبود آبادی کا پروگرام وضع کرے گا، وہ حقیقت میں ایسی مٹھاس ہے جو کسی کڑوی گولی پر چڑھا دی جاتی ہے تاکہ اس کو نگلنے میں آسانی رہے۔ اس کانفرنس کے مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ جس طرح مغربی تہذیب نے اپنے ہاں لوگوں کو مادر پدر آزادی دے کر جنسی بے راہ روی عام کر دی ہے، لوگوں کے دلوں سے حرام کاری کے لیے احساس گناہ کو ختم کر دیا ہے اور کنبہ کا نظام تباہ کر کے انسانوں کو جانوروں کا ایک گلہ تصور کر لیا ہے، ٹھیک اسی طرح یہ وبا مسلم معاشرے میں بھی پھیلا دی جائے تاکہ مسلمانوں کی عفت و پاکیزگی کی روایات کو ختم کیا جا سکے۔ اگر ایسا کرنا ممکن ہو گیا تو مغرب مسلمانوں سے اپنا انتقام پوری طرح لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس تشویش ناک صورت حال میں جو تلخ حقیقت نہایت تکلیف دہ بن کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں حکومتوں کی تبدیلی کے لیے تو مارچ ہوتے اور مارکیٹیں بند ہوتی ہیں لیکن پورے ملک میں کسی گوشے سے اس اخلاقی فساد کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ ہمارے نام نہاد مصلحین ہوں یا علماء، ارباب سیاست ہوں یا ارباب تعلیم، سب کے سب اپنی اپنی دنیا میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ وہ اس خطرناک صورت حال کے مقابلے کے لیے مل بیٹھ کر کوئی راہ نکالنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ مسلمان معاشرے کے اندر فضا یورپی ثقافت کو قبول کرنے کے لیے خاصی تیار ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ایک مرتبہ اس نے جڑیں پکڑ لیں تو پھر اس کی اصلاح کرنا کسی کے بس میں نہیں رہے گا۔ مغرب کو عرصے سے یہ شکوہ تھا کہ دوسرے اہل مذاہب نے اپنے اپنے مذہب کو لادینیت میں ڈھال لیا ہے، مسلمان ایسا کیوں نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بداخلاقی کی راہ سے مسلمانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرنے کے امکانات خاصے روشن ہیں۔

اس صورت حال کا مقابلہ اس طور پر کیا جا سکتا ہے کہ دین کے علم کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی سعی کی جائے اور ان کو مغربی تہذیب کے مفاسد سے آگاہ کیا جائے، مسلم ممالک میں تعلیم کے اندر دین کی مقدار بڑھائی جائے اور اس میں اخلاقیات کا عنصر نمایاں کیا جائے، اپنے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں پر تنقید کی جائے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان کو معقول روش اپنانے پر مجبور کیا جائے۔ اس صورت میں یہ ممکن ہو گا کہ لوگوں کا ایمان و اخلاق محفوظ رہ جائے اور امت مسلمہ مغرب کی خوفناک یلغار سے بچ سکے۔

Marfat.com

مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ

امت مسلمہ کو مغرب کی طرف سے آج جس چیلنج کا سامنا ہے اس پر ہر حساس مسلمان اپنی کم مائیگی اور مغرب کی چیرہ دستیوں کے باعث فکر مند ہے کہ وہ اپنے ایمان و اسلام کی حفاظت کس طرح کرے اور صورت حال کے مضرو مہلک اثرات سے آئندہ نسلوں کو بچانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرے۔ ہماری وزیر اعظم صاحبہ نے حال ہی میں اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ [1] وہ سنگاپور کے دورے پر گئیں تو وہاں فارچون گلوبل فورم سے کثیر قومی ایجنسیوں کے انتظامی سربراہوں کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی پالیسیوں کی وضاحت کی اور فرمایا:

''ہم پاکستان میں جن اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ پوری اسلامی دنیا کے لیے ایک نمونہ بن سکتے ہیں۔ پاکستان عالم اسلام کے لیے جو مثبت ماڈل پیش کر رہا ہے اس کے نہایت فیصلہ کن اثرات علاقائی سیاست، علاقائی معیشت اور علاقائی حکمت عملی پر پڑیں گے۔''

اس کے بعد مشرق وسطیٰ، جنوب مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں بسنے والے ایک ارب مسلمانوں کا حوالہ دیتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا:

''وہ ماضی اور مستقبل میں سے ایک کو منتخب کر لیں۔ انہیں ترقی پسندی (Progressivism) اور بنیاد پرستی (Fundamentalism) میں سے لازماً ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ انہیں علم اور جہل میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں جدید ٹیکنالوجی اور قدیم گھٹن میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' (روزنامہ دی نیشن لاہور 10 مارچ 1995ء)

وزیر اعظم صاحبہ کا یہ ارشاد اہل وطن کو دعوت فکر دیتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے عزائم کو سمجھیں اور ان اقدامات پر نظر رکھیں جو وہ ان کی خیر خواہی میں ان کی بہبود کے لیے کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم صاحبہ کے خطاب سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس شعور کے ساتھ کام کر رہی ہیں کہ ان کی پالیسیاں دوسرے اسلامی ممالک کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی، نیز ان کا گمان یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ ابھی تک ماضی سے اپنا تعلق توڑنے پر تیار نہیں ہوسکی جبکہ ان کے بقول یہ ماضی جہالت اور گھٹن سے عبارت ہے۔ وہ امت کو اس گھٹن سے نجات دلانے کے لیے یہ ضروری سمجھتی ہیں کہ وہ بنیاد پرستی کو خیر باد کہے اور ترقی پسند بنے، ورنہ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اخبارات میں یہ خبر بھی چھپی ہے کہ وزیر اعظم صاحبہ نے ملک کے لیے ایک نئی ثقافتی پالیسی کی منظوری دی ہے۔ اس پالیسی کے خدوخال ابھی تک صیغہ راز میں ہیں لیکن

---

[1] یہ بینظیر بھٹو کا ذکر ہے جو اکتوبر 1993ء سے نومبر 1996ء تک دوسری بار وزیر اعظم رہیں۔ (حسان عارف)

Marfat.com

ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں حد سے بڑھی ہوئی بے ہودگی اور بے حیائی اس راز سے پردہ اٹھا رہی ہے۔ گورنر پنجاب الطاف حسین صاحب نے بھی قوم کو یہ نوید سنائی ہے کہ ہمارا معاشرہ سخت گھٹن کا شکار ہے اور حکومت اس کو اس گھٹن سے نجات دلانے کا عزم کیے ہوئے ہے۔

عالم اسلام اور اہل مغرب کی آویزش کوئی نئی چیز نہیں۔ صدیوں پر محیط اس آویزش میں جب دو صدیاں قبل اہل مغرب کو غلبہ حاصل ہو گیا تو مسلمان زعماء نے صورت حال کے مقابلہ کے لیے دو مختلف تدابیر اختیار کیں۔ امت کے دینی عناصر نے حقائق سے آنکھیں بند کر کے ایک جامد رویہ اختیار کیا۔ اجتہاد کا عمل تو پہلے سے ہی معطل تھا، اب انہوں نے جدید علوم کو بھی شجر ممنوعہ قرار دے دیا۔ انہوں نے صدیوں پہلے تجویز کردہ دینی نصاب تعلیم کو تقدس کا درجہ دیا اور اس میں شمہ بھر تبدیلی پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ اس سے اہل دین میں تنگ نظری اور جدید مسائل سے بے گانگی پیدا ہو گئی۔ دنیا کبھی جامد نہیں ہوئی، اس کے قدم برابر آگے کو بڑھتے رہے، سائنسی ترقی کے ساتھ نت نئے مسائل نے جنم لیا، چونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے باعث لوگوں کو نئے مسائل میں دین کی روشنی میسر نہ آئی اس لیے عملی زندگی کے ساتھ دین کا تعلق کمزور ہوتا چلا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لوگوں میں دین کا اسی طرح کا ایک محدود تصور قائم ہو گیا ہے جیسا مغرب میں کلیسا کے غلط رویہ کے باعث پیدا ہوا تھا۔ دنیاوی امور پر دین کی گرفت بے حد کم ہو گئی ہے حالانکہ اسلام میں دین اور دنیا کی یہ تفریق مطلوب نہ تھی۔ اسلام کو جسد بے روح بنانے میں ہمارے نزدیک دینی عناصر کی مذکورہ حکمت عملی کو بڑا دخل ہے۔

مغربی تہذیب کے چیلنج کے جواب میں دوسری تدبیر وہ تھی جو محدود پیمانے پر ہندوستان میں سر سیّد احمد خان نے اور بڑے پیمانے پر ترکی میں مصطفیٰ کمال نے اختیار کی۔ دوسرے مسلم ممالک میں بھی اس نقطۂ نظر کے نمائندہ لوگ معروف ہیں۔ سر سیّد کا کہنا یہ تھا کہ امت مسلمہ کو ترقی کرنے کے لیے قدیم کو چھوڑ کر جدید کا انتخاب کرنا ہوگا۔ انہیں مغربی علوم سیکھنے اور مغرب کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ مصطفیٰ کمال کو چونکہ ملک میں اقتدار حاصل تھا انہوں نے نہایت آمرانہ انداز میں مسلمانوں کا ان کے ماضی سے رشتہ توڑا، دینی علامات کو ختم کیا تاکہ مستقبل کو شاندار بنانے کی کوششوں میں وہ سد راہ ثابت نہ ہوں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس تدبیر سے کیا مطلوبہ نتائج پیدا کیے جا سکے؟ جہاں تک سر سیّد کا تعلق ہے ان کی زندگی ہی میں لوگوں کو شکایت ہوئی کہ ان کا ادارہ دین سے بے بہرہ ہی نہیں بلکہ ملحد افراد تیار کر رہا ہے۔ جو طلبہ اپنے خاندانی اثرات کے تحت الحاد سے بچ گئے وہ بھی ملی جذبہ سے عاری محض قوم پرست مسلمان ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کی تحریک کامیابی سے چلائی لیکن سیکولر ذہن کے باعث اس کو ایک اسلامی ملک بنانے پر کبھی آمادہ نہ ہو سکے۔ جس کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ پاکستانی قوم آج مختلف عصبیتوں کی تنگ ناؤں میں پھنسی ہوئی ایک راہ گم کردہ قوم بن چکی ہے جو پریشان ہے کہ معلوم نہیں کل وہ کس انجام سے دوچار ہو جائے۔ مصطفیٰ کمال کی پالیسیوں نے بہادر و غیور ترک قوم کو مغرب کی نقالی پر مجبور کیا تو وہ اپنا دینی و قومی

Marfat.com

تشخص ہی کھو بیٹھی اور اس قابل بھی نہ ہو سکی کہ دنیاوی طور پر دوسری یورپی اقوام کے ہم پلہ ہو جائے اور ان کے فورم میں اپنے لیے ایک نشست ہی حاصل کر سکے۔ معلوم ہوا کہ نتائج کے اعتبار سے یہ تدبیر بھی ملت کو نقصان پہنچانے اور اسے ذلت و پستی میں دھکیلنے کا باعث بنی۔ ہماری وزیر اعظم آج اسی تدبیر کو اختیار کرنے کے لیے اقدامات تجویز کر رہی ہیں اور دوسرے مسلمان ممالک کے لیے اس کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کر رہی ہیں۔

ہماری رائے میں مسئلہ کا حل ان دونوں انتہاؤں کے مابین اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام اور مغربی تہذیب دو بالکل متضاد نظام حیات ہیں۔ مغربی تہذیب لا مذہبیت کی پرچارک ہے۔ اگر کسی شخص میں مذہب کی اپج ہو تو اس کو اس کے ایک ذاتی معاملے کی حد تک برداشت کیا جاتا ہے۔ اس تہذیب کا مطمح نظر دنیاوی مفادات کا حصول اور خواہشات نفس کی آسودگی ہے۔ خدا اور آخرت کو اس نظام زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ اس کے برعکس اسلام میں اللہ کی وحدانیت، اس کے ساتھ ربط و تعلق اور تصور آخرت کو اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے اخلاقی اقدار مقرر کر دی ہیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی تنظیم کے لیے احکام دیے ہیں۔ اسلام میں دین اور دنیا کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں بلکہ اسلامی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والے شخص کی دنیاوی زندگی بھی دین قرار پاتی ہے۔ جب ایک مسلمان کسی دوسری تہذیب کو مکمل طور پر اپنا لیتا ہے تو وہ اپنا ملی تشخص کھو دیتا ہے، لہٰذا ہم مسلمان یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دوسری تہذیبوں کے نقال بن جائیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ قرآن و سنت کو ہر معاملہ میں اپنا رہنما بنائیں، ان کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول کریں اور اس کے لیے فضا کو سازگار بنانے کی خاطر دین کا علم زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ اسلام ہمیں ہر معاملہ میں جائز اور ناجائز میں امتیاز کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس اصول کو انفرادی معاملات ہی میں نہیں بلکہ دوسری تہذیبوں کو پرکھنے کے لیے بھی استعمال کریں اور دیکھیں کہ ان کا کتنا حصہ اسلامی اصولوں کے تحت قابل قبول اور کتنا حصہ رد کرنے کے قابل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جدید علوم پوری انسانیت کا سرمایہ ہیں۔ ہم ان کی تحصیل میں بخل سے کام نہ لیں۔ چونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ علوم لا مذہبیت کے تناظر میں مرتب کیے گئے ہیں، اس لیے ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم ان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حک و اضافہ کر کے ان کو اپنے لیے اور پوری انسانیت کے لیے مفید تر بنائیں۔ یہی ہمارے لیے ایمان و اسلام کے تحفظ کی راہ ہے، خواہ ہمارے مخالفین اس پر بنیاد پرستی کا لیبل لگائیں۔ ہمارے حکمرانوں پر بھی یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ نظریہ پاکستان...... اسلام...... سے بے وفائی کر کے وہ اس مملکت خداداد پر حکومت کا حق کھو دیں گے۔

Marfat.com

مِلّت کے تحفّظ کی ضرورت

قوموں کی عالمی برادری میں امت مسلمہ پر جو زبوں حالی طاری ہے اور اسے جن مسائل کا سامنا ہے، ان کا تذکرہ ہمارے عوام وخواص کی زبانوں پر ہے۔ ہر دردمند مسلمان اس کے لیے متفکر ہے اور چاہتا ہے کہ ملت کے تحفظ اور استحکام کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو اسے کر گزرے، لیکن اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ اہم کام کون سا ہے؟ اس سوال کے جواب میں رائیں الگ الگ ہیں۔ بعض لوگ مسلمان ممالک کے مادی وسائل کو ترقی دینے اور ان کو مجتمع کرنے کی ضرورت کے قائل ہیں، بعض اسلامی ممالک کے بلاک کے قیام کو امت مسلمہ کے مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ ایک طبقہ زمانے کی تہذیبی دوڑ میں مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کو اس کی زبوں حالی کا بنیادی سبب قرار دے کر یہ تجویز کرتا ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب وتمدن کو اپنائیں۔ دوسرا طبقہ اس کے برعکس دین کی کمزوری کو اصل سبب گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک دینی درس گاہیں، لائبریریاں اور تبلیغی ادارے قائم کر کے اس دور کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ سوال کہ ملت کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے اس وقت سب سے بڑی ضرورت کیا ہے، ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک اجتماع میں ادارہ کے صدر مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کی تقریر کا موضوع تھا۔ آپ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

> ''ماضی قریب کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغرب کے فکر وفلسفہ نے ہماری ملت کو چیلنج کیا ہے تو اس کے باوجود کہ ہمارے ہاں مسجدیں اور خانقاہیں آباد تھیں، مدرسے اور کتب خانے بڑی تعداد میں موجود تھے، تبلیغی ادارے قائم تھے، یہ چیزیں ملت کو بچا نہ سکیں۔ مغربی تہذیب کا جو سیلاب آیا وہ ملت کے تمام آثار کو اپنے ساتھ بہا لے گیا جس کے نتیجے میں ساری اسلامی اقدار تلپٹ ہو گئیں، پیمانے بدل گئے، مذہب کی جن چیزوں کی بڑی عزت ووقعت تھی ان چیزوں کو حقارت سے دیکھا جانے لگا اور جن چیزوں سے ہم نفرت کرتے اور اپنے دین، مذہب اور روایات کے خلاف سمجھتے تھے وہ ہمارے اندر گھس آئیں۔ مغربی زندگی کی تمام وبائیں اور آفتیں قوم پر مسلط کر دی گئیں۔ ہمارے عوام وخواص، علماء وفقہاء اور مدرسوں اور خانقاہوں والے سب کے سب اس سیلاب میں بہہ گئے۔''

مولانا نے تاشقند، بخارا اور سمرقند کے مسلمانوں پر روسیوں کی یلغار کا حوالہ دیا اور بتایا کہ وہاں کے مدرسے، خانقاہیں اور بخاری شریف کے ختم ملت کا تحفظ نہ کر سکے۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد کے حالات کا جائزہ

Marfat.com

لیتے ہوئے آپ نے بتایا کہ مغربی تہذیب کے سیلاب نے وہاں اسلامی قانون کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ اس کی جگہ سوئزرلینڈ کا پرسنل لا نافذ کیا گیا، تعزیرات میں اٹلی کی نقالی کی گئی، تجارت کا قانون یورپین اقوام سے لے لیا گیا اور اس طرح مغربی تہذیب کی تمام آفتیں ترکی کے مسلم معاشرہ میں سرایت کر گئیں۔ قوم کو اس حادثہ سے دوچار کرنے میں کوئی بیرونی طاقت دخیل نہ تھی۔ بلکہ یہ سب اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں پیش آیا اور ملت کے صدیوں کے آثار مٹا دینے کا باعث بنا۔

اس صورت حال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''جو چیز قوم کا تحفظ کرتی ہے وہ ان کا خودی کا شعور ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں اور دنیا میں کس لیے آئے ہیں، ہمیں دنیا میں کیا کرنا ہے اور کس مقصد کے لیے جینا ہے؟ خودی کے یقین و اذعان [1] سے ایک قوم، قوم بنتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اپنے ملکوں کے ذہین اور باشعور طبقہ کے اندر خودداری، انا اور ملت کا درد باقی نہ رکھ سکے۔ یہ چیز مذہب کے خالی نعروں سے باقی نہ رہ سکتی تھی بلکہ اس کے لیے دین کی محبت اور شریعت کی حکمت وقوت کو واضح کرنا ضروری تھا۔ یہ چیز ذہین طبقے کے رگ وپے میں جاری وساری ہوتی اور ان کے خون میں حرارت پیدا کرتی تو وہ مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ کر سکتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایسے بے جان مذہب کو جس کے متعلق لوگوں کا تصور یہ ہو کہ بس مان لینے کی چیز ہے، لوگ اسی وقت تک مانتے ہیں جب تک کوئی چیلنج پیش نہیں آتا۔ جب حقیقی چیلنج پیش آئے تو انٹیلی جنٹسیا بے بسی محسوس کرتا ہے اور جب وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے تو عوام ازخود اس سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔''

مولانا نے اسلام کے ماضی کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اسلام کی وہ قوت کیا ہوئی جس نے مصر، فارس اور روم کی تہذیب کے غرے [2] کو پامال کر کے رکھ دیا تھا؟ عربوں کی تلوار اتنی زوردار تو نہ تھی کہ وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ تلوار تو ایرانیوں اور رومیوں کی بھی زوردار تھی لیکن وہ قرآن کی حجت اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی بدولت عربوں کے فکر وفلسفہ میں آنے والی تبدیلی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عربوں نے انھیں نئے تمدن، نئے تصور زندگی اور نئے نظریات سے اس قوت اور دبدبے کے ساتھ آگاہ کیا کہ سب کو اپنا معتقد بنا لیا۔ مولانا نے عربوں کی طاقت کے سرچشمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے علم کا منبع اور فکر وفلسفہ کا سرچشمہ قرآن مجید تھا۔ اس عظیم خزانہ اور عظیم قوت سے ہم بے خبر ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے تخلیق آدم کی غایت واضح کی ہے، انسان کا مرتبہ ومقام متعین کیا ہے، انسان اور خدا کے تعلق کی اساسات نمایاں کی ہیں، انسان کی اجتماعی وسیاسی زندگی کے اصول بتائے ہیں، عائلی زندگی کی بنیادیں استوار کی ہیں اور اس تمام فلسفہ وفکر کی بنیاد عقل وفطرت، کائنات کے نظام اور آفاق وانفس کے دلائل پر رکھی ہے۔ اس کی ہر رہنمائی حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا اور اپنی بے شعوری اور حقائق سے غفلت کے سبب سے تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔''

---

[1] اذعان: اطاعت کرنا، اقرار کرنا، یقین کرنا
[2] غرہ: فریفتہ ہونا، غرور کرنا

Marfat.com

مولانا نے متنبہ کیا کہ اس وقت ہمارا ملک بھی میزان [1] میں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ وہ دور قریب آتا محسوس ہو رہا ہے جس میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی وہی کمی محسوس ہو رہی ہے جو دوسرے ممالک کے مسلمانوں میں تھی۔ ہم اپنے خزانہ، اسلحہ، طاقت اور دین کی محبت سے بے خبر ہیں۔ اس سے باخبر کرنے والے لوگ بھی موجود نہیں۔ اس وقت ملت کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے جس کو سب سے پہلے مہیا کرنا قوم کو زندہ و باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

وقت کی اس اہم ضرورت کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''ہمیں اللہ کی کتاب کی جو نعمت حاصل ہے اس کے اصلی خزانے سے واقف ہونا اور اس کے فکر کو اپنانا سب سے ضروری ہے۔ اس کا اہتمام جب تک نہ ہوگا تو آپ جو چیزیں بھی مہیا کریں گے وہ موجود رہیں گی اور قوم کو ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کریں کہ قرآن کا صحیح فکر و فلسفہ لوگوں کے سامنے آئے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے اندر سے نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ تیار کیا جائے جو قرآن مجید کے صحیح فکر و فلسفہ سے پوری طرح واقف اور موجودہ زمانے کے فلسفہ سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو تا کہ حق و باطل میں نہ صرف امتیاز کر سکے بلکہ ہر بات کی حکمت کو اجاگر کر سکے اور دین کی حجت کو اس طرح پیش کرے کہ ملک کا انٹیلی جنٹسیا اس سے متاثر ہو سکے۔ یہ ایک عظیم کام ہے جو پوری قوم کے مل کر کرنے کا ہے، لیکن اگر قوم میں یہ شعور پیدا نہ ہو تو جن لوگوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے ان کو یہ کام کرنا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ امتِ مسلمہ کو جو شرف حاصل ہے وہ قرآن مجید کی امانت ہی کی بدولت ہے۔ اسے اس بات سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا عروج و زوال اسی امانت کا حق ادا کرنے یا نہ کرنے ہی پر منحصر ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت قرآن مجید ہی وہ مظلوم کتاب ہے جس کو سمجھنے اور اس پر غور و تدبر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی، اس لیے اس کتاب کا تعلق مسلمان معاشرے کی عملی زندگی سے بڑی حد تک منقطع ہو چکا ہے۔ قرآن کے حقوق سے بے بہرہ امت مسلمہ کو اگر آسمانی رہنمائی کا تحفظ حاصل نہ ہو اور اسے مخالف اقوام کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سیم و تھور کے مسائل کو حل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ توانائی کی کمی کو دور کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرتے ہیں۔ سال بھر آبپاشی کے وسائل کو کارآمد بنانے کے انتظامات کرتے ہیں۔ تعلیمی اور ثقافتی میدان میں قلیل المیعاد اور طویل المیعاد اسکیمیں نافذ کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قومی سطح پر ہم نے امت کے فرض منصبی کو ادا کرنے کے لیے کسی اسکیم کا اجرا نہیں کیا۔ انفرادی سطح پر قرآنی فکر کی ترویج کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ بہت محدود ہیں اور قوم کو اس کے فرض سے سبکدوش نہیں کر سکتیں۔ ضرورت ہے کہ مولانا محترم کے خیالات کو واقعی اہمیت دی جائے اور ملی تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔

---

[1] میزان: ترازو

Marfat.com

سپاسِ یزداں (حمد خدا)

1۔ اے اونچے آسمان کو بلند کرنے والے، اے ستاروں اور سورج کو روشنی بخشنے والے!

2۔ اے دنیا کو ہیچ (کچھ نہ ہونے) سے پیدا کرنے والے، اس پیچ در پیچ کارخانۂ حیات کے ساتھ (پیدا کرنے والے!)

3۔ تو اس کشادہ بازارِ دُنیا سے کہیں وسیع تر ہے جس کا کہ عقل احاطہ کر سکتی ہے۔

4۔ ایک سمندر (کائنات) میں تیری کاریگری کے قلم نے آسمان کو اس طرح ایک نقطے کی شکل دی ہے کہ اس کا نہ نیست ہے نہ ہست ہے، یعنی وسیع کائنات میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

5۔ دونوں جہانوں کو تو نے ایک مٹھی میں پکڑ رکھا ہے۔ تو دنیا کے نیست کو بھی (جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا) ایک انگلی کے اشارے سے وجود میں لے آتا ہے۔

6۔ تیرے سوا جو بھی شے ہے، وہ تیری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔ اچھا اور بُرا ہر کوئی تیرا ہی پالا ہوا ہے۔

7۔ اے (خدا) ہر چیز کا آغاز تجھ سے ہی ہوتا ہے۔ ہر چیز تیری ہی جانب لوٹ کر جاتی ہے۔

8۔ تو ظاہر بھی ہے اور تو پوشیدہ بھی ہے۔ تو ہی آغاز ہے اور تو ہی انجام ہے۔

9۔ تیرے سوا جو کچھ ہے وہ زندگی کو وجود میں لانے والا نہیں ہے۔ صرف تجھے ہی وجودِ حقیقی کہنا درست ہے۔

10۔ ہر کسی کے سر پر تیرا ہی نوشتہ (قسمت کا لکھا) ہے۔ جو بھی گردن ہے اس میں تیری ہی بندگی کا رشتہ (پٹا) پڑا ہے۔

11۔ اے (خدا) جو عقل کی رسائی سے باہر ہے، جو کیوں اور کیسے کی آلودگی سے پاک ہے۔

12۔ جب دُور اندیش عقل تیری طرف جاتی ہے تو وہ پیچھے اور آگے سے اپنا راستہ بند دیکھتی ہے۔

13۔ میں تیرا نام لیتا ہوں اور میرا دل لرزتا ہے کہ یہ نام بُروں کے لب پر آنا درست نہیں۔

14۔ میرے ہاتھ میں ہوا اور میرے منہ میں خاک، کہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ تجھ سے گفتگو کروں۔

15۔ اے کہ تیرے چہرے سے کتنے ہی گھر روشن ہوتے ہیں، اور اے کہ تیری بو سے کتنی ہی زمینیں باغ بن جاتی ہیں۔

16۔ اگرچہ تو دنیا والوں سے دُور ہے، آفرین ہے کہ تو ہر جان کے اندر موجود ہے۔

17۔ اگرچہ نیک لوگ تیرا ایک راز بھی نہیں پا سکے مگر تیری آواز شہد کی مکھی تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ [یہاں اوحی ربك الی النحل) (تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی) کی طرف اشارہ ہے۔]

18۔ اگرچہ کسی نے تیرا ٹھکانا نہیں دیکھا۔ لیکن ہر دل تیری ذات سے منسلک ہے۔

19۔ تیرا نام میرے پارہ پارہ دل کے لیے مرہم ہے۔ تیری یاد درویش کی جھونپڑی کی شمع ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ...... فارسی سے اُردو ترجمہ: محسن فارانی)

Marfat.com

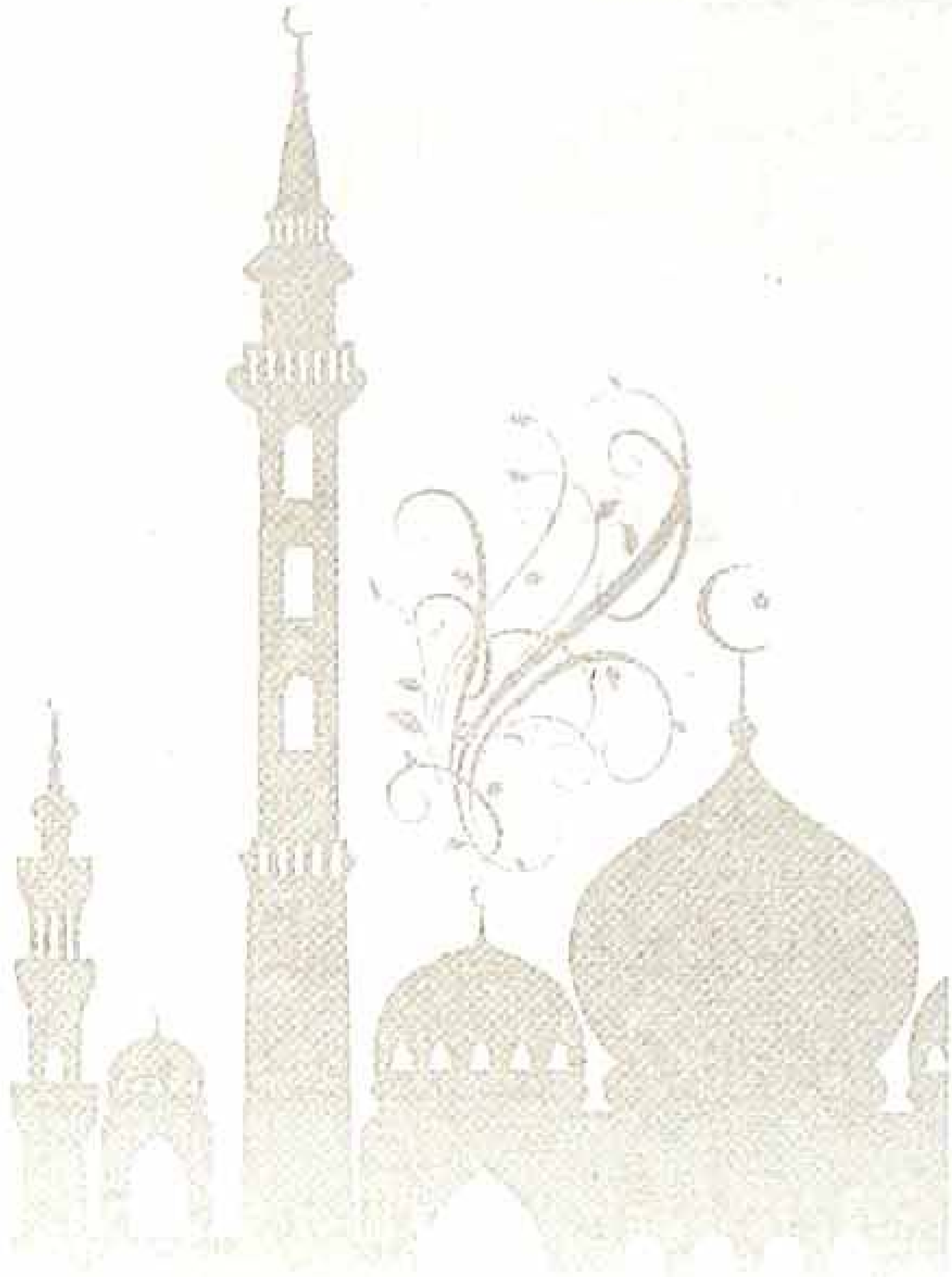

تبصرہ کتب

باب یازدہم

- فقہی اختلافات کا حل
- تحقیق عمر عائشہؓ
- ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت
- روایتِ افک
- بین الاقوامی برادری کی مسلم اقلیتیں
- تصوف کی حقیقت
- ضعیف احادیث کی معرفت اور اس کی شرعی حیثیت

Marfat.com

فقہی اختلافات کا حل

ہمارے ملک میں اس وقت کئی ادارے اس بات کا جائزہ لینے کے لیے قائم ہیں کہ رائج الوقت قوانین اسلامی شریعت سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔ ان اداروں کے کام کی پیش رفت اخبارات کے ذریعے عوام کو پہنچتی رہتی ہے۔ حکومت نے دین کے بعض ان احکام کو نافذ کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں جن پر ہمارا معاشرہ کسی اجتماعی نظم کے تحت عمل نہیں کر رہا تھا۔ حکومت کی یہ کوششیں مستحسن ہیں اور حامیانِ دین پوری دردمندی کے ساتھ ان کو کامیاب بنانے کے متمنی ہیں۔ جن لوگوں کی حالات پر گہری نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ نفاذِ شریعت میں سب سے بڑی رکاوٹ فقہی اختلافات کے سبب سے ہے جو علماء اور قانون سازوں کو بیشتر مسائل میں کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار نہیں کرنے دیتے۔ ایک فقہ کے ماننے والوں نے عملاً اپنے فرقہ کو شریعت کے طوق سے آزاد دیکھنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دینی فہم اور جذبہ رکھنے والے لوگ امت کے فقہی اختلافات کے پیچیدہ مسئلہ پر غور کریں اور ایسا طریق کار وضع کریں جو نفاذ شریعت کے مقصد کے حصول کو یقینی بنائے۔

اس اہم مسئلہ پر جو اس وقت ہمارے اربابِ حل وعقد کے سامنے ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک کتاب ''اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے مسئلہ کے تمام ضروری پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے درمیان جو فقہی اختلافات ہیں، اگرچہ وہ بالکل سرسری اور سطحی ہیں لیکن امتدادِ زمانہ سے ان کی جڑیں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ اب ان کا اکھاڑنا آسان نہیں رہا اور ان کے اکھاڑے بغیر نہ صحیح نہج پر اسلامی قانون کی تدوین ہی ممکن ہے اور نہ اس کے موثر نفاذ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت اس اصول پر مجتمع ہوں کہ ان کے قانون کے پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی قرآن و سنت ہیں اور ان پر یہ واجب ہے کہ وہ ان کسوٹیوں کو اپنے دوسرے تمام تعصبات و تعلقات سے بالکل دست بردار ہو کر تسلیم کریں۔

یہ اللہ تعالیٰ کے دین کا کام، بلکہ سب سے بڑا کام ہے۔ یہ اس شکل میں نتیجہ خیز اور بابرکت ہوگا جب اس کو پورے اخلاص کے ساتھ اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ پر کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ ان ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ کرے گا جو اس سے پہلے اس سلسلے میں ہو چکی ہیں۔''

Marfat.com

کتاب 120 صفحات پر پھیلے ہوئے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں صدرِ اول کے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور امت کے طرزِ عمل میں اس تبدیلی کی نشاندہی کی گئی ہے جو فقہ و حدیث کے مرتب ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ فقہی اختلافات کے اسباب متعین کیے گئے ہیں اور وہ حل تجویز کیا گیا ہے جس سے امت کو پھر صدرِ اول کے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر واپس لایا جا سکتا ہے۔ دو ابواب میں اسلامی ریاست میں فرقوں کی حیثیت اور اسلامی قانون کی تدوین کی سابقہ کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

صدرِ اول کے طرزِ عمل کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

''جب تک اسلامی نظام اپنی اصلی صورت میں قائم رہا، اس وقت تک امت میں اگرچہ ہر قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے، اہل علم ان اختلافات پر پوری آزادی کے ساتھ بحثیں بھی کرتے تھے، لیکن یہ اختلافات مسلمانوں کے اندر انتشار اور تفریق پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے تھے کیونکہ ہر اختلاف بالآخر خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا اور وہ اس کے بارے میں اپنی مجلس شوریٰ سے مشورہ کر کے کوئی منقح [1] بات طے کر دیتا جس کو سب تسلیم کر لیتے اور اگر اس طرح کے فیصلے سے کسی خاص شخص کو اختلاف بھی ہوتا تو اس اختلاف کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہوتی۔ قضا اور فتویٰ کے سارے معاملات خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق ہی انجام پاتے۔''

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بابرکت عہد کے بعد اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں نے غلو سے کام لیا۔ تخریج اور روایات کے مابین ایک جنگ شروع ہو گئی جس میں اہل فقہ نے اپنے علماء کے قرار دادہ اصول بجائے خود دین کا ماخذ بنا لیے اور تخریج کو اتنی اہمیت دی کہ بسا اوقات انہوں نے صحیح روایات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اہل حدیث کو اپنے اصولوں کی پاسداری میں اتنا غلو ہوا کہ وہ تخریج کی ضرورت ہی کے منکر ہو گئے اور روایات کو ان کے اصلی حق سے کہیں زیادہ وزن دے دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد اس کشمکش نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ تقلید جامد کو اپنے پنجے گاڑنے کا موقع مل گیا اور یوں امت اس قوت متحرکہ سے محروم ہو گئی جو شریعت نے اُسے عطا کی تھی۔

مولانا رحمہ اللہ کی تحقیق میں فقہ کے مختلف مذاہب میں اصولِ فقہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ دین کی اساسات اور موادِ اجتہاد کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ہے اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ قیاس اور تخریج مسائل کے اصول ایک جیسے ہیں۔ اس لیے اگر لوگ تعصب سے کام نہ لیں تو ان کو اسلامی قانون پر متفق کر لینا ناممکن نہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہاء کا علم اور احادیث کا پورا ذخیرہ مرتب صورت میں موجود ہے۔ اس لیے ہمیں یہ سہولت میسر ہے کہ ہر بات کے دلائل کو ہر قسم کے تعصبات سے آزاد ہو کر جانچ پرکھ سکیں اور ان میں سے جس کو کتاب و سنت سے قریب تر پائیں اس کو اختیار کر لیں۔ مولانا کے نزدیک فقہاء کے ذہن میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ وہ اس صورت میں اپنے اجتہادات کو وزن نہ دیں جب ایسی روایات مل جائیں جو کتاب و سنت کے عام مزاج

---

[1] منقح: پاک کیا گیا، صاف کیا گیا، وہ چیز جس میں جھوٹ نہ ہو۔

Marfat.com

سے موافق نظر آئیں۔ اسی طرح اہل حدیث کے اندر یہ آمادگی ہونی چاہیے کہ وہ اخبارِ آحاد کے اندر جو پہلو ضعف کے موجود ہوں ان کا اعتراف کریں۔ اس طرح فرقوں کے مابین ایک بڑا سبب اختلاف رفع ہوسکتا ہے۔ مولانا کے نزدیک ہمارے دین میں پیدائشی حنفی اور پیدائشی اہل حدیث کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ عوام کو ان گروہ بندیوں سے اس طرح آزاد کرنے کی ضرورت ہے جس طرح اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مسلمان ان گروہ بندیوں سے آزاد تھے۔ اس کی عملی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مدارس میں کسی ایک ہی متعین فقہ کی تعلیم دینے کے بجائے پوری اسلامی فقہ کی تعلیم دی جائے تاکہ لوگ فقہاء کے دلائل سے واقف ہوں اور ان کے اندر یہ اہلیت پیدا ہو کہ وہ دلائل کا موازنہ کر کے اس حکم کو اختیار کرسکیں، جو اوفق بالکتاب والسنۃ ہو۔

مولانا نے فقہی معاملات سے متعلق ایک صحیح اسلامی حکومت کے طرزِ عمل کو بھی واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حکومت کسی متعین امام کی تقلید کے اصول پر قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کی اساس براہِ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے ان جزوی امور سے کوئی تعرض نہیں کرتی جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس کا تعلق صرف ظاہری اعمال وعقائد تک محدود ہوتا ہے جو اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر شہری اس بات میں بالکل آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ میں جس فقہی وکلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہو اس کو اختیار کرلے، لیکن اجتماعی مسائل میں اُسے حکومت کے قانون اور فیصلے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنے فقہی مسلک کی بنا پر ان سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

مولانا کی یہ کتاب وقت کی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتی ہے اور اپنے موضوع پر شاید یہ واحد کتاب ہے جو کام کے لیے مثبت تجاویز پیش کرتی ہے۔ اس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا مواجہہ کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کے طلبہ اور اہل حل وعقد اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

فطرت کی گہرائیوں سے اوّل اور آخر یہی صدا بلند ہورہی ہے کہ شکر وتعریف سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان پروردگاری کو دیکھ کر پہلا اثر یہی مرتب ہوتا ہے کہ مخلوق اس کا شکر ادا کرے۔ یہ وہ ازلی وابدی نغمہ ہے جو پوری کائنات کے اندر گونج رہا ہے اور ہر جگہ جاری وساری ہے۔ جس طرح اس کی ربوبیت عام ہے اسی طرح اس کا ترانہ حمد بھی عام ہے اور ہر مخلوق کی زبان پر ہے: ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الروم: 18) چنانچہ آسمان وزمین میں سب کی نماز کا مغز یہی پاک کلمہ ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (بنی اسرائیل: 44)

(حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ فاتحہ)

Marfat.com

تحقیق عمرِ عائشہؓ

ام المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت کا ایک رخ جس سے دین سے بہرہ مند ہونے والا ہر مسلمان شناسا ہے یہ ہے کہ وہ اس امت کی ایک عظیم محسنہ ہیں۔ دین کا ایک بڑا حصہ ان کے ذریعے امت کو منتقل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق تو تقریباً تمام تر معلومات انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ بڑی زیرک، ذکی وفہیم خاتون تھیں جنھوں نے بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ رموزِ دین سے آگاہی حاصل کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا ایک ایک لمحہ تحصیل علم میں گزارا اور اس علم کو زندگی بھر مسلمانوں کو منتقل کرتی رہیں۔ وہ اتنی بڑی فقیہہ تھیں کہ امت کے زعماء ان سے دینی معاملات میں فتویٰ لیتے۔ متعدد مسائل میں انہوں نے بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کی رایوں سے اختلاف کیا اور اپنے موقف کے حق میں مسکت [1] دلائل دیے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت حدیث پر انہوں نے گرفت کی اور واضح فرمایا کہ اصل معاملہ یوں پیش آیا تھا لیکن ان صحابی نے اس کی توجیہ میں غلطی کر دی۔ ان کی اپنی روایت کردہ حدیثوں میں بھی ان کی ذکاوت وفطانت جھلکتی ہے۔ اس بات کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خاص مقام تھا۔ دوسری امہات المؤمنین بھی اس حقیقت سے واقف تھیں۔ وہ بھی ان کی قدر کرتیں اور ان کو مواقع فراہم کرتیں تاکہ وہ فیض نبوی سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو سکیں۔ ام المؤمنین کی شخصیت کے اس پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی رفاقت کا زمانہ ایسا ہو جس میں وہ اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے مالا مال ہوں اور ان کو بروئے کار لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئی ہوں۔

تاریخ کی کتابوں اور حدیث کی بعض روایات کی روشنی میں دیکھیے تو یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آتی ہیں۔ اس روپ میں چھ سال کی عمر میں ان کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نو سال کی عمر میں رخصتی کی نوبت آتی ہے۔ اس وقت تک وہ سنِ شعور کو نہیں پہنچتیں۔ رخصت ہو کر جاتی ہیں تو اپنے کھلونے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہاں بھی کھیل کے ساتھ ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کبھی مدینہ کی لڑکیوں بالیوں کو اپنے گھر بلا کر ان کے ساتھ کھیلتی ہیں اور کبھی گانے والیوں سے گانے سنتی ہیں۔ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار بھی کرتی رہتی ہیں کہ وہ کھیل کی بڑی رسیا ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت کی اس تصویر کشی سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ان کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت کا زمانہ ان کے بچپن کا غیر ذمہ دارانہ اور غیر سنجیدہ دور تھا جس میں ان کی اصل دلچسپی تحصیل علم کے ساتھ نہیں بلکہ کھیل کے ساتھ رہی۔ جب وہ سنِ رشد کو پہنچیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ

---

[1] مسکت: خاموش کر دینے والا، مضبوط، لاجواب کر دینے والا

Marfat.com

سے جا ملے۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ ام المؤمنین کی شخصیت کے اول الذکر بیان سے تو صرف وہ لوگ واقف ہیں جو دین کے علوم سے بہرہ ور ہیں۔ گویا اہل علم کا ایک محدود طبقہ انہیں اس انداز سے دیکھتا ہے۔ عوام الناس میں ان کے بارے میں جو رائے قائم ہوئی ہے وہ موخر الذکر روپ ہی پر مبنی ہے جس کا خوب خوب چرچا کیا گیا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو متضاد کردار ایک ہی شخصیت کے نہیں ہو سکتے۔ کسی المیے کے نتیجے میں بعض باتیں ام المؤمنین کی طرف غلط منسوب ہو گئیں جو ان کی شخصیت کو داغدار کرتی ہیں تاکہ امت مسلمہ میں ان کو جو عظیم مرتبہ حاصل ہے اس کو مجروح کیا جائے۔ یہ المیہ کب اور کیسے پیش آیا؟ یہ بات جاننے کا کوئی آسان ذریعہ موجود نہیں۔ صدیوں پرانی باتوں کی تحقیق کے لیے وسائل اور صلاحیت دونوں چیزوں کی ضرورت ہے اور ان کا یکجا میسر ہونا ایک مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اپنے کسی بندے کو توفیق دے دیتا ہے اور یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ توفیق جناب حکیم نیاز احمد صاحب کو حاصل ہوئی اور انہوں نے امّ المؤمنین کی عمر کے مسئلے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد وہ یہ سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے کہ ام المؤمنین کو کھلنڈری بچی بتانے والی روایات کے مآخذ کیا ہیں، ان روایات میں ضعف کے کیا کیا پہلو ہیں اور کیوں یہ قابل اعتبار نہیں سمجھی جا سکتیں۔ انہوں نے اپنی یہ تحقیق ایک ضخیم کتاب ''تحقیق عمر عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا'' میں بیان کی ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے پہلے حصے میں ان تمام روایات پر جرح کی ہے جو ام المؤمنین کو کم عمر بتاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم روایت جو بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور ابنِ ماجہ سب نے بیان کی ہے وہ تزوج عائشہ کی یہ روایت ہے کہ:

((نَكَحَ النَّبِيُّ عَائِشَةَ وَهِيَ بِنْتُ سِتِّ سِنِيْنَ وَبَنٰى لَهَا وِهِيَ بِنْتُ تِسْعِ سِنِيْنَ وَمَاتَ عَنْهَا وِهِيَ بِنْتُ ثَمَانِيْ عَشَرَ.))

''آنحضرت ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت نکاح کیا جب وہ چھ برس کی تھیں، ان کی رخصتی کرائی جب وہ نو برس کی تھیں اور وہ اٹھارہ برس کی تھیں جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا۔''

یہ ایک ایسی روایت ہے جس کے واحد راوی تمام معتبر کتب حدیث میں ہشام بن عروہ رحمہ اللہ ہیں جو اپنے والد عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کرتے ہیں۔ نہایت فاضلانہ بحث کے بعد مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس نادر روایت کا 145ھ سے پہلے کوئی راوی نہ تھا، اسی لیے وہ تمام کتب حدیث جو اس سے قبل مرتب ہوئیں اس روایت سے خالی ہیں۔ ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی ساری عمر مدینہ منورہ میں گزری لیکن وہاں کے حفاظ حدیث نے ان سے یہ روایت بیان نہیں کی۔ اس کے برعکس گیارہ حفاظِ حدیث جو تمام تر عراقی ہیں، ہشام سے اس روایت کے ذمے دار ہیں اور انہی کی روایت کتب حدیث میں نقل ہوئی ہے۔ ہشام نے عراق کا ایک سفر 145ھ میں 84 برس کی عمر میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ یہ روایت زبان پر لائے جسے عراقیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس وقت اس روایت کی غلطی پر

Marfat.com

گرفت کرنے والے یا متبادل معلومات فراہم کرنے والے دنیا میں موجود نہ تھے۔ اس لیے عمر عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہشام کے بیان کو حرف آخر تسلیم کرلیا گیا اور جب اس روایت نے صحاح میں راہ پالی تو گویا پوری امت کے نزدیک اس کو پایۂ قبول حاصل ہوگیا۔ اس سے الگ ہوکر تحقیق کی کسی نے زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اس کے بعد بعض محدثین نے روایت کے متن کو مستحکم کرنے کے لیے اسے اپنی محبوب اسناد کے ساتھ متعلق کر دیا۔ اس طرح کی روایتیں بظاہر ہشام کی روایت کی شاہد معلوم ہوتی ہیں لیکن جرح وتعدیل ① سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اسناد تدلیس ② کا شاہکار ہیں۔ فاضل مصنف نے تمام کتب حدیث کی ایک ایک سند پر بحث کر کے دکھایا ہے کہ ان میں انقطاع ③ اور تدلیس پائی جاتی ہے حتیٰ کہ بعض راوی بالکل غیر ثقہ، کذاب اور وضاع ④ ہیں۔

فاضل مصنف نے ان تمام روایات کو بھی پرکھا ہے جن سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کم عمری کا تاثر ملتا ہے مثلاً صحاح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان کہ میرے ساتھ گڑیاں کھیلنے کے لیے اڑوس پڑوس کی چھوکریاں آ جاتی تھیں۔ مصنف کی تحقیق میں یہ روایت بھی ہشام ہی سے مروی ہے۔ یہ ایک مستقل روایت ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مکی زندگی کے اس دور کا بیان تھا جب وہ فی الواقع کم عمر کی تھیں لیکن اسے تزوج والی حدیث کے ساتھ مربوط کر دیا گیا تاکہ اس کا بیان حقیقی نظر آئے۔ اگر یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ سہیلیاں غیر معروف نہ ہوتیں بلکہ تاریخ کا ایک حصہ بنتیں۔

عید کے موقع پر دو لونڈیوں کے جنگ بعاث کے گانے گانے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حبشیوں کے جنگی کرتب دیکھنے کی روایات کے بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ ان سے ام المؤمنین کا بچپن یا کھلنڈرا پن ثابت ہی نہیں ہوتا، بلکہ راویوں نے ان میں تلفیق ⑤ کی ہے یعنی مختلف موقعوں کی باتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جس سے ان واقعات پر ایک ایسا رنگ چڑھ گیا ہے جو ان کی اصل ماہیت کو واضح نہیں ہونے دیتا۔ مصنف نے اس بات کے بکثرت شواہد پیش کیے ہیں کہ بعض راویوں نے اپنی طرف سے اصل روایات پر اضافے کر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس ضمن میں انہوں نے شیعہ راوی عبدالرزاق کو خاص طور پر ذمہ دار گردانا ہے۔ انہی عبدالرزاق کو فاضل مصنف نے واقعہ افک کی روایت میں ان جملوں کے اضافہ کا ذمے دار قرار دیا ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کم عمر، کم عقل، غافل اور نہ جانے کیا کیا ثابت کرتے ہیں۔

تزوج ⑥ عائشہ کی روایت میں ضعف کے پہلو بیان کرنے کے باوجود فاضل مصنف نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ ہشام کی راویت میں نکاح اور رخصتی کی عمر میں چھ اور نو کے عدد کے ساتھ عشرۃ یا عشرین

---

① تعدیل: راوی کو درست یا عادل قرار دینا۔

② تدلیس: خریدار سے عیب چھپانا، اسنادِ حدیث میں اپنے اُستاد کے بجائے اُس کے اُستاد کا نام لینا جیسے خود اس سے حدیث سنی ہو۔

③ انقطاع: سند کا منقطع ہونا، درمیان سے کسی راوی کا ذکر نہ ہونا۔

④ وضاع: حدیثیں گھڑنے والا، موضوع روایات بیان کرنے والا۔

⑤ تلفیق: اکٹھا کرنا، دو باتوں کا ملا دینا۔ ⑥ تزوج: نکاح، شادی

Marfat.com

یعنی دہائی کے ہندسے بھی رہے ہوں گے یعنی عمر بوقت نکاح 16 یا 26 اور بوقت رخصتی 19 یا 29 برس بیان کی گئی ہو گی لیکن نقل کرتے وقت دہائی کے یہ ہندسے لکھنے سے رہ گئے۔ بعد میں اس غلطی پر اور ردے چڑھا دیے گئے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کی کم عمری لازم وملزوم بن گئی۔

ہمیں مصنف کے اس نتیجہ تحقیق سے تو اتفاق ہے کہ ام المؤمنین کی عمر بوقت رخصتی 19 یا 29 برس رہی ہو لیکن ہندسے چھوٹنے کی یہ توجیہ محل نظر ہے۔ روایت میں اگر عدد ایک مرتبہ بیان ہوتا تو یہ توجیہ بالکل فطری ہوتی لیکن یہاں عدد تین مرتبہ بیان ہوا ہے نیز اس میں ثمانی عشر (18) کا عدد بھی ہے جس کے ساتھ مزید عشرۃ یا عشرین کا اضافہ بے معنی ہوگا۔ لہٰذا اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ خود ہشام کو ذہول [1] ہوا ہو یا کسی نے باقاعدہ منصوبہ کے تحت اعداد میں رد و بدل کیا ہو اور ناقص صورت میں یہ روایت مشہور کر دی ہو۔ معاندین صحابہ کی اس طرح کی کارروائیوں سے ہماری کتابیں محفوظ نہیں رہی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں فاضل مصنف نے وہ قرائن جمع کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رخصتی کے وقت ام المؤمنین کی عمر 29 سال یا کم از کم 19 سال تھی، اگرچہ خود مصنف یہ رائے رکھتے ہیں کہ عمر کا تعین ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ثابت کرنا کافی ہے کہ رخصتی کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سن رشد کو پہنچی ہوئی تھیں۔ اس کے قرائن و شواہد مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق (جو ہشام بن عروہ کے ہم عصر ہیں) کی روایت سے قبول اسلام میں سبقت کرنے والوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبوت کے پہلے سال میں اپنی بہن اسماء رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایمان لائیں۔ قسطلانی کی مواہب لدنیہ، زرقانی کی شرح مواہب اور حیات سیّد العرب میں بھی ان کو سابق الایمان افراد میں شمار کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ 1 نبوی میں یہ اسلام لانا سنِ شعور میں ہونا چاہیے۔ اگر وہ دودھ پیتی بچی تھیں تو ایمان کی مکلّف نہ تھیں۔

(ب) سورہ قمر کی آیت: ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ﴾ کے بارے میں ان کی روایت موجود ہے کہ اس آیت کا نزول مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سورہ قمر کا زمانہ نزول 4 نبوی ہے گویا اس وقت وہ عمر کے اس دور میں تھیں جس میں آدمی چیزوں میں امتیاز کرنے کے قابل ہوتا ہے اور ان کو یاد بھی رکھ سکتا ہے۔

(ج) صحیح بخاری میں ہجرت حبشہ کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔ اس روایت میں وہ اسلام کے تیرہ سالہ مکی دور پر جامع تبصرہ کرتی اور چشم دید واقعات بیان کرتی ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جس ہجرت حبشہ کا ذکر اس روایت میں ہے وہ 5 نبوی میں پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ ایک عاقل و بالغ آدمی ہی اپنے مشاہدات اس قدر تفصیل سے بیان کر سکتا ہے۔ لہٰذا 5 نبوی میں ام المؤمنین کی عمر ایسی ہونی چاہیے جس میں آدمی معاملات کو سمجھتا اور گہرے مشاہدہ پر مبنی رائے دینے کے قابل ہوتا ہے۔

---

[1] ذہول: غفلت، بھول

Marfat.com

(د) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضور ﷺ کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ آپ کا گھر سنبھالنے کے لیے کوئی خاتون موجود ہوں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا بنت حکیم نے آپ کے لیے دو رشتے تجویز کیے، ایک حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا اور دوسرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا۔ اس وقت اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چند برس کی بچی ہوتیں تو خولہ کی یہ تجویز انتہائی غیر موزوں تھی کیونکہ آنحضرت ﷺ کو خانگی ذمے داریاں اٹھانے والی بیوی کی ضرورت تھی نہ کہ گڑیوں سے کھیلنے والی ایک بچی کی۔ خولہ رضی اللہ عنہا کی تجویز جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ کی بھتیجی کے حکم میں ہیں، یہ نکاح کے لیے کیسے موزوں ہو سکتی ہیں۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت بچی ہوتیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معقول عذر یہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کے گھر کی ذمے داریاں یہ بچی کیسے سنبھال سکتی ہے؟

(ہ) مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی تجویز کا مفصل بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح جبیر بن مطعم بن عدی سے ہو چکا تھا۔ جبیر اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اختلاف عقیدہ کی بنا پر مطعم بن عدی لڑکی کی رخصتی کروانے سے گریز کر رہے تھے۔ جب خولہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ تجویز کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مطعم کے پاس گئے اور رخصتی کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کرنے کو کہا۔ اس خاندان کو اسلام سے جو کد تھی اس کی بنا پر انہوں نے معذوری ظاہر کی چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حسن تدبیر سے طلاق دلوائی۔ اس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ سے نکاح کے لیے آزاد ہو گئیں۔ اس زمانہ میں جبیر ایک جوان آدمی تھا اور اسلام کے خلاف سازشوں میں حصہ لیتا تھا۔ نیز وہ رئیس مکہ کا بیٹا تھا جس کے لیے جوان رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسا کوئی سبب موجود نہیں کہ وہ ایک چند سالہ بچی کے ساتھ نکاح کے لیے آمادہ ہو گیا ہو جس کی بلوغت کے انتظار میں اسے مزید دس گیارہ برس تجرد کی زندگی گزارنی پڑے لہٰذا جبیر کا نکاح بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بلوغت کے بعد ہی ہوا ہوگا جو عرب کا معروف طریقہ تھا۔

(و) طبقات ابن سعد میں ہجرت مدینہ کا واقعہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بیان ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد جب کچھ عرصے تک آنحضرت ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی نہیں لی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خود پوچھا کہ رخصتی لینے میں کیا امر مانع ہے۔ آنحضرت نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں بچی کی بلوغت کا انتظار کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ میرے پاس مہر میں دینے کے لیے رقم نہیں ہے۔ گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بچپنے کا کوئی مسئلہ اس وقت نہ تھا۔

(ز) کتب حدیث میں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ 1ھ میں جب بہت سے مہاجرین بیمار پڑ گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان میں سے بعض کی عیادت کو گئیں۔ واپس آ کر انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے ان کی حالت کی صحیح تصویر کشی کی اور ان کی زبانوں سے جو حسب حال اشعار سنے تھے وہ بھی سنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا

Marfat.com

کرنا کسی نو سالہ بچی کے بس میں نہیں ہوتا۔

(ح) بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غزوہ بدر و احد میں موقع جنگ پر موجود تھیں اور سخت ترین حالات میں انہوں نے زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت سرانجام دی۔ ان غزوات میں نابالغ لڑکوں کو تو شرکت سے روک دیا گیا تھا، آخر کیا سبب تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کم سنی اس میں رکاوٹ نہ بنی اور انہوں نے کام بھی وہ کیے جو بڑوں کے کرنے کے تھے، لہٰذا کم سنی کا قصہ ہی خلافِ حقیقت ہے۔

(ط) آپ انساب کی ماہر تھیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا خاص فن تھا نیز آپ کو اشعار بکثرت یاد تھے جن کو وہ برمحل استعمال کرتی تھیں۔ انساب اور اشعار میں اس مہارت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنے والد سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا بھرپور موقع میسر آیا ہو۔ اگر وہ گڑیا کھیلتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آ گئی تھیں تو یہ فنی کمال انہیں کہاں سے حاصل ہو گیا اور اس تربیت کا زمانہ کون سا ہے!

(ی) احکام دین کی مصلحتوں، حکمتوں اور ان کے ارتقا سے جس قدر باخبر آپ ہیں، اتنا باخبر کوئی نہیں۔ ان کی فقیہانہ آراء سے کتب حدیث بھری ہوئی ہیں۔ کیا یہ فکری گہرائی اور گیرائی ایک کم سن بچی کی ہو سکتی ہے! ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت کے دور سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ذہنی و فکری اعتبار سے نہایت پختہ ہو چکی تھیں اور عمر کے اس حصے میں تھیں جب ان کی فکری صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ اس لیے وہ ہر معاملے کو اس کے صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے کے قابل ہوئیں اور اپنی صائب آراء سے امت کو فائدہ پہنچایا۔

اس فاضلانہ تصنیف میں علم حدیث سے متعلق بعض اہم مباحث بھی ملتے ہیں۔ اس میں ایک قابل قدر بحث میں درایت [1] حدیث کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ مصنف کے نزدیک تزوج عائشہ کے بارے میں ہشام کی روایت ان اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔

مصنف نے صدرِ اول میں علم حدیث کے ارتقاء کے ادوار بھی متعین کیے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں روایات کو پرکھنے کا رجحان تو پایا جاتا تھا لیکن نقدِ حدیث [2] کا باقاعدہ فن ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس دور میں روایات میں بکثرت تلفیق ہوئی یعنی مختلف روایتیں باہم گڈمڈ ہو گئیں۔ نقدِ حدیث کا فن نہ ہونے کے باعث حدیث کی ابتدائی کتابوں مثلاً موطا امام مالک رحمہ اللہ اور مسند امام ابی حنیفہ رحمہ اللہ میں مرسل روایات [3] بکثرت موجود ہیں اور ان ائمہ نے مرسلات ثقہ کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ نقد حدیث کا فن 180ھ کے بعد وجود میں آیا اور صحاح کی تدوین میں اس سے کام لیا گیا لیکن اس سے پہلے کی روایت میں جو تلفیق ہو چکی تھی وہ ثقہ کی روایت کی حیثیت سے صحاح میں بھی برقرار رہی۔

زیرِ نظر کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک ذہین قاری اس سے تحقیقِ حدیث کا طریق کار بھی سیکھ سکتا ہے۔

---

[1] درایت: روایت کو عقلی طور پر پرکھنے کے اُصول [2] نقد حدیث: احادیث کے تنقیدی جائزے کو نقد حدیث کہا جاتا ہے۔

[3] مرسل روایت: وہ روایت جو اس صحابی کا نام لیے بغیر بیان کی جائے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہو۔

Marfat.com

ام المؤمنین کی عمر کی تحقیق کی خاطر مصنف نے کس طرح ذخیرۂ حدیث کو کھنگالا، راویوں کی جرح و تعدیل کے لیے کون سے وسائل اختیار کیے۔ روایتوں کے اصل مضمون تک کس طرح رسائی حاصل کی، راویوں کے اضافوں کا سراغ کیسے لگایا اور کس طرح ان راویوں کا متعین کیا جو ان اضافوں کا باعث بنے، یہ معلومات کتاب کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں جس سے تحقیق حدیث کی عملی تربیت ہوتی ہے۔

فاضل مصنف اس گراں قدر تصنیف پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ام المؤمنین کی حیثیت ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ دراصل ان خلاف واقعہ باتوں کی بیخ کنی ❶ کی ہے جن کو دشمنانِ اسلام نے رسول اللہ ﷺ پر طعن کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اس دور میں ایسی کتاب کی ضرورت تھی جسے جناب حکیم نیاز احمد صاحب نے پورا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

آیت

آیت اسے کہتے ہیں جس سے آپ کسی چیز پر استدلال کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں مکمل دلیل نہیں ہوتی بلکہ اصل دلیل کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور آیت کے واضح ہونے کا مطلب ہے کہ جو اسے سمجھتا ہے اس کے لیے یہ ایک کھلی ہوئی چیز ہے۔ فرمایا ہے:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ۝﴾

(العنکبوت: 49)

''بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا کیا گیا ہے اور ہماری آیتوں کا صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو اپنی جانوں پر ظالم ڈھانے والے ہیں۔''

آیت اور منطقی دلیل میں کئی طرح کے فرق ہیں:

1۔ ایک فرق تو یہ ہے کہ آیت منطقی دلیل کے لیے بنیاد کا کام کرتی ہے، مثلاً منطقی استدلال میں کہا جاتا ہے کہ عالم تغیر پذیر ہے اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہوتی ہے، چناں چہ عالم کی تغیر پذیری اس کے حادث ہونے کی دلیل ہے۔

2۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ آیت فکر کو مہمیز کرتی ہے، ذہن میں سوال اٹھاتی ہے اور بھولی بات کو یاد دلا دیتی ہے۔ نیز انسان کی فطرت میں رحم دلی، تقویٰ اور صبر و شکر وغیرہ کی جو خصوصیات ودیعت ہیں ان کو ابھارتی ہے۔

3۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ آیت انسانی سوچ کی فطرت میں پائی جاتی ہے جب کہ منطقی دلیل ایک فرض کی ہوئی بات ہے۔ انسان کی سوچ ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف جاتی ہے جیسے عالم کی تغیر پذیری سے اس کے حادث ہونے کی طرف، جب کہ قضایا کی صورت میں اس کو پیش کرنا فرضی طریقہ ہے۔

(حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، مفردات القرآن (الآیۃ) ص: 134۔136)

---

❶ بیخ کنی: جڑ سے اُکھاڑنا، استیصال

Marfat.com

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

ایران میں رضا شاہ پہلوی ❶ کی حکومت کا تختہ الٹ کر جب آیت اللہ خمینی برسر اقتدار آئے تو پریس نے ان کی تحریک کو پاکستان کی اس ہم عصر تحریکِ نظام مصطفیٰ کے مماثل قرار دیا جس نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ عظمیٰ سے محروم کیا اور ملک میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق دینی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لگایا تھا۔ لہٰذا پاکستان میں انقلابِ ایران سے یہ توقع پیدا ہوگئی کہ وہاں خالص اسلام کے نفاذ کے لیے سازگار حالات پیدا ہو جائیں گے کیونکہ زمامِ اقتدار کلیۃً علماء کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ اس توقع کے پیدا کرنے میں جماعت اسلامی کا خاص طور پر بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے انقلابِ ایران کا بڑے جوش وخروش سے خیر مقدم کیا۔ انقلاب کے قائدین کو مبارک باد دینے کے لیے اپنے صفِ اول کے لیڈروں پر مشتمل وفود بھیجے۔ ان وفود نے اپنے بیانات اور رپورٹوں میں ان قائدین کی کامیابی کو اسلام کی کامیابی قرار دیا اور نئی حکومت کے بارے میں کچھ ایسا تاثر دیا، جیسے وہ آیت اللہ خمینی کی زیرنگرانی خلافتِ راشدہ کے طرز کی حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ چنانچہ پاکستان کے عوام کی نگاہیں ایران کی طرف اٹھنے لگیں کہ شاید اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب اسی سرزمین سے شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔

انقلاب کے کچھ عرصے بعد حکومت ایران کے طرزِ عمل سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ نہایت متعصب شیعی حکومت ہے جو اپنے مخالفوں کو کچل دینے پر یقین رکھتی ہے۔ اس نے سنی اکثریت کے علاقے پر باقاعدہ چڑھائی کر دی ہے اور قتل ونہب ❷ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض واقف کاروں نے یہ انکشاف کیا کہ ''آیت اللہ، اور رُوح اللہ'' جیسے القاب شیعہ مسلک کے ائمہ کے مناصب کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بعض مذہبی معتقدات وابستہ ہیں۔ ایرانی حکومت کی دعوت پر جانے والے بعض وفود کے ارکان نے بھی یہ رپورٹ دی کہ وہاں حکومت کی سرپرستی میں شیعیت کے نفاذ کی بھرپور مہم جاری ہے اور سنیوں پر سختی کی جا رہی ہے۔ تب جا کر اس نام نہاد اسلامی انقلاب کی حقیقت لوگوں پر کھلی اور انہیں مزید حالات جاننے کی جستجو ہوئی۔ چنانچہ اب تک بعض آنکھیں کھول دینے والی تحریریں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے بھی امتِ مسلمہ کو اس شیعی انقلاب کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے تین سو صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت'' ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا ابوالحسن علی

---

❶ یہ دراصل محمد رضا شاہ پہلوی (79-1941ء) تھے جن کا آیت اللہ خمینی نے تختہ اُلٹ دیا۔ ان کے والد جنرل رضا خاں تھے جو بادشاہ بن کر رضا شاہ پہلوی (41-1925ء) کہلائے۔ (حسان عارف)

❷ قتل ونہب: قتل وغارت، لوٹ مار (نہب: لوٹنا)

Marfat.com

ندوی نے لکھا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں تین موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ اول ایرانی انقلاب کی صحیح نوعیت، دوم آیت اللہ خمینی کے عقائد، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے خیالات اور فقہی آراء۔ سوم شیعیت کی حقیقت اور اثنا عشری شیعہ جو دوسرے شیعہ فرقوں کی نسبت معتدل قرار دیے جاتے ہیں، کے معتقدات۔ مولانا نے ان تین عنوانات کو اس لیے جمع کیا ہے کہ ان کے نزدیک انقلابِ ایران کی ایک مذہبی بنیاد ہے اور شیعہ مذہب کی حقیقت کو جانے بغیر انقلاب کی نوعیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سنی مسلک کے لوگ عام طور پر شیعی نقطۂ نظر سے واقفیت نہیں رکھتے۔ نہ ان کی بنیادی کتب تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور نہ وہ ان کا مطالعہ کر پاتے ہیں۔ چنانچہ وہ شیعہ کو بھی محض ایک فقہی مسلک قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے مولانا نے اس مذہب کو مفصل بیان کیا ہے۔

مولانا کی تحقیق میں شیعیت کا اولیں مصنف یمن کا ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا تھا جس نے سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا لیکن پس پردہ اس کا منصوبہ اسلام اور مسلمانوں کو اسی طرح کا نقصان پہنچانا تھا جس طرح کا نقصان سینٹ پال نے عیسائیت اور نصاریٰ کو پہنچایا تھا۔ اس نے زیر زمین ایک تحریک چلا کر سادہ لوح عوام کے اندر اس طرح کے خیالات پھیلانے شروع کیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبوت و رسالت کے حقیقی اہل تھے، اور فی الحقیقت جبریل علیہ السلام کو بھیجا بھی انہی کے پاس گیا تھا لیکن وہ محمد ﷺ کے پاس جا پہنچے اور وحی ان کے حوالے کر دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قالب میں خداوندی روح تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی نیابت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تھا۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جو اس کے بعد امت کا سربراہ بنتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وصی علی رضی اللہ عنہ تھے اور خلافت ان کا حق تھا جس کو منافقین نے سازش کر کے غصب کر لیا، وغیرہ۔ ان خیالات کو خفیہ طور پر پھیلایا گیا اور جتنا جتنا کسی نے قبول کیا اسی پر اکتفا کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کے مختلف فرقوں میں آگے چل کر اپنے عقائد کے بیان میں اختلاف پیدا ہو گیا لیکن جو چیز ان سب سے میں مشترک نظر آتی ہے وہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بشمول خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم کے لیے عناد۔

مولانا کی تحقیق میں شیعیت کا بنیادی عقیدہ امامت کا ہے، باقی عقائد اسی کے فروع ہیں۔ شیعہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت اور سربراہی کے لیے امامت کا ایک سلسلہ قائم کیا اور بارہ امام مبعوث کیے جو امامِ اول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔ یہ امام اللہ کی حجت اور معصوم عن الخطا تھے۔ یہ صاحبِ معجزات تھے۔ ان کے پاس ملائکہ آتے، ان کو معراج ہوتی، کائنات کے ذرے ذرے پر ان کی حکومت تھی۔ وہ دنیا اور آخرت کے مالک تھے، وہ ماضی اور مستقبل کے احوال کا علم رکھتے تھے۔ دنیا انہی کے دم سے قائم ہے، وہ بندوں میں سے جس کو چاہیں عطا کریں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ ان پر اللہ کی طرف سے کتابیں نازل ہوتی تھیں اور ان کو اختیار تھا کہ جس چیز یا عمل کو چاہیں حلال یا حرام قرار دے دیں۔ یہ تمام امام درجہ میں رسول اللہ ﷺ کے

Marfat.com

ہم پلہ اور دوسرے تمام انبیاء سے افضل و برتر تھے۔ ان کی امامت کو ماننا اور ان پر ایمان لانا شرطِ نجات ہے۔

شیعہ کے عقیدہ کے مطابق گیارہ امام یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے اور لوگوں کے درمیان رہے۔ لیکن بارہویں امام جن کو امام غائب، مہدی، الحجۃ، القائم، المنتظر اور صاحب الزمان کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ولادت کے بعد سے ہی مستور رہے اور اپنے والد امام حسن عسکری کی وفات سے دس دن پہلے معجزانہ طور پر غائب ہو کر ایک غار سرمن رأی ❶ میں چلے گئے۔ ساٹھ ستر برس تک انہوں نے وہاں سے شیعوں کے ساتھ اپنا تعلق چند خاص افراد کے ذریعے رکھا، ان کی معرفت لوگوں کے ہدایا و تحائف وصول کرتے رہے اور اپنے متبعین کو ہدایت دیتے رہے۔ یہ زمانہ ان کی غیبت صغریٰ یعنی چھوٹی غیر حاضری کا کہلاتا ہے۔ اس مدت کے بعد ان کے ساتھ مخصوص افراد کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا لہٰذا شیعہ ان کی ہدایات سے محروم ہو گئے۔ اس دور پر اب گیارہویں صدی جا رہی ہے۔ یہ امام کی غیبت کبریٰ یعنی بڑی غیر حاضری کا زمانہ ہے۔ شیعہ ان کی آمد اور ظہور کی دعائیں کرتے ہیں اور اس پورے عرصے میں ان کے منتظر رہے ہیں۔

امام غائب کے ظہور کے ساتھ شیعہ کی بڑی توقعات وابستہ ہیں کیونکہ جب وہ ظاہر ہوں گے تو پوری دنیا میں ان کی حکومت قائم ہو جائے گی اور ان کے مخالفین کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔ اہل سنت کے نقطۂ نظر سے امام غائب کے ظہور کے ساتھ بڑی ناگفتنی باتیں بھی وابستہ ہیں۔

شیعہ کے نزدیک سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پہلے امام علی رضی اللہ عنہ کی ولایت و امامت کا حق نہ پہچانا۔ اسی لیے شیعہ ان پر سب وشتم ❷ کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔

مولانا نے شیعہ مذہب کی اصولی تعلیمات میں کتمان اور تقیہ کا حکم بھی بتایا ہے۔ کتمان سے مراد اپنے اصل عقیدہ اور مذہب و مسلک کو چھپانا اور دوسروں پر ظاہر نہ کرنا ہے۔ تقیہ کا مطلب ہے اپنے قول یا عمل سے واقعہ اور حقیقت کے خلاف یا اپنے عقیدہ وضمیر اور مذہب و مسلک کے خلاف ظاہر کرنا تاکہ سننے یا دیکھنے والا دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو جائے۔ مولانا کی تحقیق میں یہ عقیدے اثنا عشری مذہب کی تصنیف کے وقت اس ضرورت کے تحت ایجاد کیے گئے کہ جن ابتدائی اماموں کو امامت کے منصب پر فائز بتایا گیا انہوں نے خود کبھی امامت کا دعویٰ نہ کیا تھا بلکہ وہ خود خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس کے ہاتھوں پر بیعت کرتے رہے۔ چونکہ ان کا یہ عمل مسئلہ امامت کے بے بنیاد و بے اصل ہونے کی ایک روشن واقعاتی شہادت تھا اس لیے یہ عقیدہ بنایا گیا کہ یہ ائمہ

❶ سرمن رأی: (عراق) دراصل دجلہ کے کنارے خلیفہ معتصم باللہ کا بسایا ہوا شہر ہے۔ سرمن رأی (جس نے دیکھا خوش ہوا) کا نام بگڑ کر سامراء بن گیا۔ شیعہ کے بارہویں امام مبینہ طور پر سامراء کے قریب ایک غار میں غائب ہو گئے تھے۔ (محسن فارانی)

❷ سب وشتم: گالی دینا اور توہین کرنا

Marfat.com

اس لیے خاموش رہے کہ مذہب کی اساس کتمان وتقیہ پر ہے۔

شیعہ کے نزدیک تقیہ ترک کرنے والا تارکِ نماز کی طرح ہے۔ شیعہ امام تقیہ کرتے ہوئے بسا اوقات حرام کو حلال بھی بتا دیتے، ایک ہی دینی مسئلہ میں مختلف لوگوں کو مختلف جوابات دیتے اور مخالفین کی نماز جنازہ پڑھتے تو اس میں مغفرت کی دعا کے بجائے لعنت وعذاب کی بددعا کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے۔

قرآن مجید میں امامت کے عقیدے کا کوئی خفیف سے خفیف اشارہ تک نہیں پایا جاتا جب کہ شیعہ کے نزدیک یہ ارکانِ اسلام میں سے ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنے اہم عقیدے کا ذکر قرآن نے کیوں نہیں کیا۔ اس کا جواب شیعہ یہ دیتے ہیں کہ قرآن کو مرتب کرنے والے صحابہ نے امامت کی تمام آیتیں اس میں سے نکال دی تھیں۔ قرآن کے اندر بھی اسی طرح کی تحریف ہوگئی جیسی تحریف تورات اور انجیل میں ہوئی ہے۔ اصل قرآن امام علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے اماموں کے حوالے کیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے رہے اور اپنے بعد کے نامزد امام کے حوالے کرتے رہے تا آنکہ امام غائب اسے غار سرمن رائی میں لے گئے۔ وہ اپنی آمد کے وقت اسے ساتھ لائیں گے۔

جہاں تک ایرانی انقلاب کا تعلق ہے مولانا کی تحقیق میں یہ انہی شیعی معتقدات پر مبنی ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ آیت اللہ خمینی نے ان کو اپنی کتابوں میں پوری قوت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو یہ نیا فلسفہ بھی دیا ہے کہ امامِ غائب کی غیبتِ کبریٰ کے زمانے میں شیعہ مجتہدین اور فقہا کا یہ فرض ہے کہ امام آخر الزمان کے نائب اور قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لینے کی جدوجہد کریں۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''جب کوئی فقیہ جو صاحب علم ہو، عادل ہو اور حکومت کی تشکیل وتنظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس کو معاشرے کے معاملات میں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو نبی ﷺ کو حاصل تھے اور سب لوگوں پر اس کی سمع وطاعت واجب ہوگی۔ یہ صاحب حکومت فقیہ ومجتہد حکومتی نظام، عوامی وسماجی مسائل کی نگہداشت اور سیاست کے معاملات میں اسی طرح مالک ومختار ہوگا جس طرح نبی ﷺ اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام مالک ومختار تھے'' ...... ''فقہاء ائمہ معصومین کے بعد اور ان کی غیبت کے زمانے میں رسول ﷺ کے وصی ہیں اور وہ ان سب امور ومعاملات کی انجام دہی کے مکلّف ہیں جن کی انجام دہی کے مکلّف ائمہ تھے'' اس نظریہ کی رو سے خمینی امام غائب کے قائم مقام، رسول اللہ ﷺ کے وصی اور امام اور نبی ﷺ کی طرح واجب الاطاعت ہیں۔ ان کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ پورے عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کو اپنے زیرنگیں لانے کی جدوجہد کریں اور اس میں شیعیت کو رواج دیں اور ان کی اس جدوجہد میں کوئی شخص یا ریاست رکاوٹ بنے تو اس کا قلع قمع کرنے کی ہر ممکن شکل اختیار کریں۔

مولانا منظور نعمانی نے آیت اللہ خمینی اور شیعیت کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مستند ہونے

Marfat.com

میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ آیت اللہ خمینی کی تین کتابیں...... الحکومۃ الاسلامیہ، تحریر الوسیلہ اور کشف الاسرار ......ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ مذہب کے بارے میں معلومات اس مذہب کے سب سے معتبر علماء کی کتابوں...... اصول کافی، فروع کافی، حق الیقین، فصل الخطاب، احتجاج طبرسی وغیرہ...... سے حاصل کی ہیں۔ انہوں نے نہایت فراخ دلی سے طویل اقتباسات نقل کر دیے ہیں تا کہ ہر بات شیعہ مصنّفین کے اپنے الفاظ میں قاری کے سامنے آ جائے۔ مولانا نے اپنی تصنیف کو ایک معلوماتی کتاب بنایا ہے اور جو خیالات اس میں نقل کیے ہیں ان پر تنقید سے ہر جگہ گریز کیا ہے۔ بس کہیں کہیں مجمل طور پر وہ چند اختلافی سطور لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ میں یہ کتاب ایرانی انقلاب اور شیعیت سے پردہ اٹھانے کے لیے لکھ رہا ہوں تا کہ اہل سنت اور اہل علم و دانش اس سے واقف ہو جائیں، اس پر تنقید کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

مولانا کے اس نقطۂ نظر کی وجہ سے کتاب یک طرفہ خیالات کا ایک ذخیرہ تو بے شک بن گئی ہے لیکن اس کے نتیجے میں ایک بڑی مصلحت نظر انداز ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت کی بہت بڑی تعداد شیعی پروپیگنڈا کا شکار ہو چکی ہے۔ یہ لوگ اہل بیت انہی افراد کو سمجھتے ہیں جن پر شیعہ اہل بیت ہونے کا اطلاق کرتے ہیں اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے الگ ان کی اسی طرح کی خصوصی حیثیت مانتے ہیں جیسی شیعہ بتاتے ہیں۔ اماموں پر نہ صرف ان کا عقیدہ ہے بلکہ ان کے نام کی نیاز بھی دیتے ہیں اور اگر ان کے نام پر کوئی نئی بدعت جاری کر دی جائے تو اس میں پورا پورا حصہ لیتے ہیں۔ تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ و حسنین رضی اللہ عنہما کے قائل آپ کو اہل سنت میں بھی ملیں گے۔ ان کا ایک بہت بڑا حصہ جو تصوف کا قائل ہے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر اپنا ہادی و مرشد صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو مانتا ہے۔ امام مہدی کے منتظر شیعہ ہی نہیں بلکہ سنی علماء تک بھی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھیے تو بیسیوں روایتیں نقل کر کے آپ کو اس بات کا قائل کرتے نظر آئیں گے کہ امام مہدی کی آمد پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے ہمارا گمان یہ ہے کہ بہت سے اہلِ سنت کتاب کے اکثر مندرجات میں کوئی اجنبیت نہیں پائیں گے۔ وہ اس کو پڑھ کر یہ سوچیں گے یہ باتیں تو ہم بھی مانتے ہیں۔ اگر شیعہ بھی ان کو مانتے ہیں تو ٹھیک تو مانتے ہیں۔ مولانا کو اہلِ سنت سے یہ خوش گمانی رہی ہے کہ وہ اپنے دین سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور شیعی معتقدات سے متاثر نہیں۔ اس خوش گمانی کے نتیجے میں کتاب ادھوری رہ گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اس صورت میں کہیں زیادہ مفید ہو سکتی تھی جب ہر شیعی نقطۂ نظر کے پہلو بہ پہلو اہل سنت کا صحیح علمی نقطۂ نظر مدلل طریقہ سے آ جاتا۔ اس صورت میں ہمارے عوام و خواص کو معلوم ہو سکتا کہ وہ شیعی دامِ تزویر [1] میں کس بری طرح آ چکے ہیں۔

[1] دامِ تزویر: جھوٹ کا جال

Marfat.com

روایتِ افک

حکیم نیاز احمد صاحب کی کتاب ''تحقیق عمر عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا'' کی دوسری کتاب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منسوب واقعہ اِفک کی تحقیق میں منظر عام پر آئی ہے۔ سوا چار سو صفحات کی اس کتاب میں ان تمام روایات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں واقعہ افک کی طرف کوئی اشارہ تک بھی ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اس سلسلہ کی اصل روایت وہ ہے جو صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں سورہ نور کے تحت بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قافلے سے پیچھے رہ جانا، صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ہمراہ سفر کر کے قافلہ کو پہنچنا، منافقین کا اس واقعہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کا ذریعہ بنانا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیمار ہونا اور ایک ماہ بعد منافقین کے پروپیگنڈا پر مطلع ہو کر والدین کے گھر اٹھ آنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ کی تحقیق کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ، اسامہ رضی اللہ عنہ اور لونڈی بریرہ رضی اللہ عنہا سے استفسار کرنا، آپ کی تقریر پر اوس اور خزرج میں جھگڑے کی نوبت آنا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بریت پر مشتمل آیات کا نازل ہونا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اپنے عزیز مسطح رضی اللہ عنہ کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لینا کہ انہوں نے افک کے پروپیگنڈے میں حصہ لیا اور قرآن مجید میں اس پر زجر آنا بیان ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں (اور صحیح مسلم میں بھی) یہ روایت ابن شہاب زہری کے واسطہ سے آئی ہے جنہوں نے اس کو عروہ بن الزبیر، سعید بن المسیب، علقمہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔

فاضل مصنف نے روایت پر اس کی سند اور نفس مضمون دونوں کے لحاظ سے مفصل بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک زہری کا عروہ بن الزبیر سے سماع ثابت نہیں۔ سعید کے بارے میں روایات میں اضطراب ہے کہ یہ ابن المسیب ہیں یا ابن جبیر۔ عروہ اور علقمہ کی الگ روایت جو کتابوں میں نقل ہوئی ہے وہ انتہائی ضعیف سند سے ہے اور وہ ان تفصیلات سے بھی خالی ہے جو روایت زیر بحث میں ہیں۔ اس میں روایت کا صرف آخری حصہ آیا ہے۔ سعید اور عبید اللہ کی کوئی الگ روایت اس موضوع پر نقل نہیں ہوئی۔ ان مشاہدات سے فاضل مصنف اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ زہری نے بعض متفرق معلومات کو یک جا کر کے ان حضرات کی طرف نسبت کر کے بیان کر دیا ہے اور اس واقعے کی حقیقتاً کوئی روایت ان کے سامنے نہ تھی لہٰذا اس روایت کو زہری کا ایک طبع زاد افسانہ قرار دینا چاہیے جو انہوں نے غالبًا دوسری صدی ہجری کے پہلے ربع میں اس وقت تصنیف کیا اور اپنے شاگردوں میں پھیلایا۔ جب واقعہ کے اصل شاہد یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل کے روایات کے مجموعوں میں یہ روایت موجود نہیں۔ مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، جامع معمر، مسند ابو داؤد طیالسی، کتب الام وغیرہ میں یہ روایت بیان نہیں

Marfat.com

ہوئی حتیٰ کہ واقدی اور ابن سعد نے بھی اس کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ صحاح کی ترتیب و تدوین چونکہ بہت بعد میں ہوئی اس لیے ان میں یہ روایت جگہ پا گئی۔

فاضل مصنف کے نزدیک زہری ایک ذوالوجہین ❶ شخصیت ہیں۔ ان کے والد زندگی بھر علویوں کی طرف سے بنی امیہ کے خلاف برسرپیکار رہے۔ علویوں کے ساتھ ان کی عقیدت زہری کو بھی ورثے میں ملی۔ شیعہ محققین کے نزدیک زہری شیعہ تھے۔ روایات میں ان کی سب سے زیادہ مستند سند اہل سنت کے نزدیک بھی الزهری عن علی بن حسین عن ابیہ عن جدہ ہے۔ دوسری طرف فکرِ معاش نے ان کو بنی امیہ سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اپنی سیاست اور موقع پرستی کی بنا پر یہ دونوں گروہوں سے تعلقات رکھنے میں کامیاب رہے۔ تاہم علویوں سے اپنی وابستگی کے تقاضے سے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں زہری کو مدلس، مرسل اور مدرّج ❷ لکھا گیا ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک روایت اِفک کے گھڑنے میں بھی انہوں نے تدلیس، تلفیق، ارسال اور ادراج ❸ سب کمزوریاں ظاہر کی ہیں جن کی بنا پر ان کی یہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔

روایت اِفک کو درایت کے اصول پر جانچا جائے تو فاضل مصنف کی رائے میں یہ بہت سی منکرات پر مشتمل نظر آتی ہے۔ اس میں شانِ رسول اللہ کا استخفاف ❹ ہے، امہات المومنین رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین ہے، اور روایت خلاف واقعہ متضاد امور پر مشتمل ہے۔ چونکہ روایت ایک تاریخی واقعہ کو بیان کرتی ہے اور اس سے کوئی احکام برآمد نہیں ہوتے اس لیے فاضل مصنف کے نزدیک اس پر حجیت حدیث اور تلقی بالقبول ❺ کے حوالے سے بحث کی راہ مسدود نہیں ہوتی جبکہ یہ معلوم ہے کہ ائمہ نقد حدیث نے تاریخی روایات کی مناسب چھان بین نہیں کی اور اپنی تمام تر محنت احکام کی احادیث پر صرف کی ہے۔ فاضل مصنف کے اہم اعتراضات متن پر حسب ذیل ہیں:

(ا) روایت میں زہری ایک بات کرتے ہیں اور اس پر وارد ہو سکنے والے کسی متوقع اعتراض کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں۔ یہ انداز صرف اس روایت میں ہو سکتا ہے جو بعد میں گھڑی گئی ہو۔

(ب) روایت میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا حوالہ بھی ہے اور آیت حجاب کے نزول کا بھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزوہ بنی المصطلق شعبان 6ھ میں پیش آیا ہوگا جبکہ حقیقتاً یہ غزوہ شعبان 5ھ میں غزوہ احزاب سے پہلے پیش آیا تھا، اسی لیے اس میں منافقین بکثرت شریک ہوئے اور انہوں نے انصار اور مہاجرین میں جھگڑا پیدا کر کے متوقع

---

❶ ذوالوجہین: دو چہروں والا ❷ مدلس: جس کی روایت میں تدلیس ہو۔ مرسل: حدیث کا راوی جو اس صحابی کا نام لیے بغیر بیان کرے جس نے نبی ﷺ سے روایت کی ہو۔ مدرج: راوی جو حدیث کے متن میں اپنی طرف سے کوئی لفظ بڑھا دے جسے نبی ﷺ کا کلام سمجھا جائے۔

❸ ارسال: صحابی کا نام لیے بغیر روایت کرنا، مرسل حدیث بیان کرنا۔ ادراج: راوی کا متن حدیث میں ایسا لفظ بڑھانا جسے سننے والا قولِ رسول کی طرح مرفوع سمجھے۔ مدرج حدیث بیان کرنا۔

❹ استخفاف: حقیر جاننا، توہین کرنا۔ ❺ تلقی بالقبول: جسے اُمت میں قبول حاصل ہو (تلقی: پانا)

Marfat.com

جنگ احزاب کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی تھی، نیز بنو مصطلق کی غزوہ احزاب میں شرکت کسی طرح ثابت نہیں ہے اور نہ منافقین ہی کے اندر اس غزوہ کے بعد کوئی دم خم رہ گیا تھا کہ وہ وہ حرکتیں کرتے جو بیان ہوئی ہیں۔ پس آیت حجاب کا حوالہ خود ساختہ ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق واقعات اور ہودج کی سواری کے متعلق بیانات خلاف حقیقت ہیں۔

(ج) صفوان رضی اللہ عنہ واقدی کے بیان کے مطابق پہلی مرتبہ غزوہ احزاب میں شریک ہوئے اور 9ھ میں یا بقول دیگر 54ھ میں شہید ہوئے۔ اس صورت میں یہ غزوہ بنی المصطلق میں شامل ہی نہ تھے۔ مزید برآں اگر یہ واقعہ افک کا کوئی کردار تھے تو انہیں قرآن کے ذریعے اپنی بریت نازل ہونے پر اسی طرح فخر کرنا چاہیے تھا جیسا فخر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا روایات میں دکھایا گیا ہے، لیکن کسی روایت میں ان کا کوئی بیان نہیں۔ اسی طرح قافلوں کے پیچھے چلنے کی جس ذمے داری کو ان سے منسوب کیا گیا ہے وہ کسی دوسری مہم سے متعلق ثابت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے راوی نے افسانہ کو مکمل کرنے کی غرض سے یہ منصب تراشا اور اسے صفوان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا۔

(د) غزوہ بنی المصطلق کا موسم انتہائی سردی کا تھا۔ روایت کے واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے یہ واقعہ موسم گرما میں پیش آیا۔ یہ بھی مابعدی ذہن کی اختراع کا نتیجہ ہے۔

(ھ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فراست اور ذکاوتِ حس کے شواہد روایات میں بکثرت موجود ہیں لیکن روایت افک میں ان کا کردار بالکل مختلف دکھایا گیا ہے جیسے وہ ایک ماہ تک صورت حالات کو بھانپ ہی نہ سکی ہوں۔ یہ رویہ غیر حقیقی ہے اور ان کے معروف کردار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

(و) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ترکِ کلام اور بے التفاتی، ان کی بیماری میں مزاج پرسی نہ کرنا، پھر ارادۂ طلاق کر لینا محض اس بنا پر کہ دشمنوں نے ایک افواہ اڑا دی، نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ لوحی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے جس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید نے کمزور مسلمانوں کو سورہ نور میں جو سرزنش کی، اس کا رخ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف تھا؟ روایت کا یہ پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کے منافی ہے۔

(ز) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تحقیق و تفتیش کا انداز بھی غیر حقیقی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کیا کوئی شخص بارہ سالہ بچے (حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت بارہ سال تھی) اور لونڈی کی شہادت لیتا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ بعد میں پیش آنے والے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق واقعات کی روشنی میں کہلوایا گیا ہے۔

(ح) دوسری امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا کسی طرح سے روایت اِفک میں ملوث ہونا ثابت نہیں لیکن یہ روایت ام رومان کی زبان سے اسے سوکناپے کا شاخسانہ قرار دیتی ہے جو بالکل خلافِ واقعہ ہے۔

(ط) حمنہ رضی اللہ عنہا کا ذکر روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی بہن ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کی

Marfat.com

طرفداری میں روایت اِفک میں حصہ لیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غزوہ بنی المصطلق تک آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح ہی نہ کیا تھا۔ اس لیے حمنہ رضی اللہ عنہا کے لیے کوئی وجہ بہن کی حمیت وحمایت کی موجود نہ تھی۔

زہری کی روایت اِفک کے علاوہ اس واقعے سے متعلق دوسری روایات کو بھی فاضل مصنف زیر بحث لائے ہیں اور انہوں نے سند اور متن دونوں کے لحاظ سے بحث کر کے دکھایا ہے کہ یہ روایات زہری کی روایت سے متاثر ہو کر وضع ہوئیں، اور امام بخاری نے بھی انہیں متابع میں بیان کر دیا، مثلاً مسروق کی روایت جو ام رومان رضی اللہ عنہا سے ہے وہ مسروق کا ارسال ہے کیونکہ انہوں نے ام رومان رضی اللہ عنہا کو نہیں دیکھا۔ پھر مسروق جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعدد امور میں خود روایت کرتے ہیں تو اس واقعے کے بارے میں ان سے کیوں روایت نہ ملی۔ سند کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ 6ھ سے 136ھ تک یہ روایت بصیغہ راز واحد عن واحد چلی۔ اس کے تمام راوی کوفی ہیں، کوئی مدنی نہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک ایک ایسی روایت کو جو منقطع بھی ہو اور اس میں تدلیس بھی ہو محض اس بنا پر نہیں مانا جا سکتا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو قبول کر لیا۔

واقعہ افک کے بارے میں تمام روایات پر تنقید کر کے اور ان کے ضعف کو واضح کرنے کے بعد فاضل مصنف اپنا نقطۂ نظر یوں بیان کرتے ہیں کہ جنگ احزاب سے قبل منافقین نے ایک طرف غزوہ بنی المصطلق میں مہاجرین اور انصار کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی، دوسری طرف افک کا فتنہ اٹھا کر مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو خراب کرنا چاہا تاکہ مسلمانوں کی جمعیت منتشر ہو جائے اور ان کو عرب کی متحدہ طاقت کے ذریعے شکست دی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ افک کے بارے میں مسلمانوں کو زبان تک کھولنے سے قرآن مجید میں منع کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور اس کی کوئی روایت قرآن مجید کی خلاف ورزی کے ڈر سے نہیں کی۔ اگر زہری یہ روایت وضع نہ کرتے اور شیعہ اس کو ہوا نہ دیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا کوئی تذکرہ ہماری کتابوں میں ہوتا۔ جہاں تک قرآن مجید کی آیات کا تعلق ہے ان کا مدعا سمجھنے کے لیے اس واقعے کی تفصیلات کا ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ چونکہ قرآن مجید میں اس بات کا کوئی اشارہ ہے نہ کسی معتبر حدیث میں بیان ہوا کہ یہ واقعہ کیا تھا اور کس کے بارے میں تھا اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات سے اس کو متعلق کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ یہ واقعہ کسی اور صحابی اور صحابیہ کے بارے میں بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس کے امہات المؤمنین سے متعلق نہ ہونے کی ایک دلیل فاضل مصنف کے نزدیک یہ بھی ہے کہ یہ شتم رسول اور طعن فی الرسول کا ایک کیس ہوتا جس کی سزا قتل ہے۔ چونکہ نہ قتل کا کوئی حکم ہوا اور نہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے کسی کو معاف کرنا ثابت ہے۔ اس لیے یہ واقعہ حرم نبی سے متعلق تھا ہی نہیں۔

یہ کتاب لکھ کر فاضل مصنف نے خیر القرون [1] کے واقعات کو جانچنے کے لیے ایک نیا راستہ کھولا ہے۔ اس تحقیق سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ شیعوں کی روایت قبول کرنے کے بارے میں آدمی کو ہمیشہ حد درجہ محتاط ہونا چاہیے خواہ یہ روایت صحاح میں بھی موجود ہو۔ جامعین حدیث نے ان کی روایات قبول کر کے ان کو وہ ثقاہت دے دی جس کے وہ

---

[1] خیر القرون: زمانوں سے بہتر (زمانہ) یعنی نبی ﷺ کا زمانہ۔

Marfat.com

مستحق نہ تھے۔

☆☆............☆☆☆

❀ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، ضلع اعظم گڑھ (انڈیا) سے ہمیں مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، شیخ الحدیث جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ کی تفسیر سورۂ نور موصول ہوئی ہے جس میں فاضل مصنف نے آیات افک کے ذیل میں روایاتِ افک پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ داستان شیعوں نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مطعون کرنے کے لیے گھڑی ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سورۂ نور کی آیات افک میں منافقین کی پھیلائی ہوئی ان تہمتوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے پھیلایا کرتے تھے۔

فاضل مصنف کے بیشتر دلائل حکیم نیاز احمد صاحب کے دلائل سے ملتے ہیں اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ بعض پہلو قارئین کے لیے افادہ کا باعث ہوں گے۔ اس لیے صرف ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(ا) فاضل مصنف کی تحقیق میں روایت زہری، روایت ابو اسامہ اور روایت ام رومان رضی اللہ عنہا تینوں منقطع اور مرسل روایتیں ہیں جن کا آپس میں متعدد پہلوؤں میں اختلاف ہے۔ زہری کی روایت ''راوی معلوم مروی مجہول'' [1] کے قبیل کی ہے۔

(ب) آیاتِ افک کے نزول کے موقع کی تین روایتوں میں الگ الگ تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس اختلاف کی توجیہ ممکن نہیں، اس لیے تینوں روایتیں قابل رد ہیں۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسامہ رضی اللہ عنہ اور بریرہ رضی اللہ عنہا سے گواہی لینا منسوب کیا گیا ہے جبکہ اس وقت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی زندہ تھے۔ گواہی کے لیے ایک بچے کے بجائے وہ زیادہ موزوں تھے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا فتح مکہ کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں۔ ان کی گواہی تین سال پہلے کے واقعے میں کیسے لی جاسکتی تھی؟

(د) یہ تصور محال ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قافلے سے بچھڑ جانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں دوپہر کے پڑاؤ تک بھی نہ آسکا، حالانکہ معمولاً ام المؤمنین کا اونٹ سفر میں آپ کے اونٹ کے ساتھ ہوتا اور آپ باتیں کرتے ہوئے چلتے۔ دوران سفر نماز فجر کے لیے قافلہ رکا۔ اس وقت یہ کیوں معلوم نہ ہوسکا کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پیچھے رہ گئی ہیں، نیز جب وہ آملیں تو کسی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ سے کوئی پوچھ گچھ ہوئی یا نہ ہوئی۔ آخر ایک ماہ بعد اس واقعے کی جستجو کیوں ہوئی؟

(ھ) یہ واقعہ شعبان میں پیش آیا تھا۔ ایک ماہ بعد گویا رمضان میں یہ تحقیقات ہوئی۔ ہر رمضان میں جبریل امین علیہ السلام قرآن مجید کا مذاکرہ [2] کرتے۔ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مہینہ بھر وحی کا انتظار کیوں رہا، آپ نے جبریل امین ہی

---

[1] ''راوی معلوم مروی مجہول'': وہ روایت جس کا راوی معلوم ہو مگر مروی عنہ (جس سے روایت کی گئی) نامعلوم ہو۔

[2] مذاکرہ: دہرائی، یاد دہانی، باہمی ذکر

Marfat.com

سے کیوں دریافت نہ کرلیا۔ نیز انتظار کا ہے کا تھا۔ تہمت کے احکام تو پہلے سے نازل ہو چکے تھے، آپ ﷺ نے ان کے مطابق کیوں عمل نہ فرمایا؟

(و) ایسا واقعہ اگر پیش آتا تو آنحضرت ﷺ کے لیے انتہائی رنج و الم کا باعث ہوتا۔ اس رنج و کرب کے زمانے میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے شادی کیسے کرلی؟

فاضل مصنف نے زہری کو اس افسانے کا مصنف قرار نہیں دیا، بلکہ یہ کہا ہے کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں روایت کر دیں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ مرسل روایتیں ہیں ان کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی۔

ہمارے نزدیک اس معاملے میں حکیم صاحب کی تحقیق کے شواہد زیادہ موجود ہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک روایت میں حمنہ بنت جحش اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو واقعہ افک کے پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے تو یہ بھی شیعوں کی ان صحابہ سے نفرت کے باعث ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی بلکہ مدینہ چھوڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام چلے گئے تھے۔ حمنہ رضی اللہ عنہا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اور شیعہ طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف اور جنگِ جمل میں شریک قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ان کی زوجہ کو مطعون کرنے کا انہوں نے روایتِ افک میں ایک بہانہ پیدا کیا ہے۔

میرٹھی صاحب اور حکیم صاحب کی تحقیقات اصل مسئلے کے بارے میں کلی طور پر متفق ہیں اور ان کا یہ مستفاد [1] نہایت خوش آئند اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دامن کو شیعوں کے اڑائے ہوئے چھینٹوں سے پاک کرنے والا ہے۔

شہادت کا مفہوم

ہر امت واسطہ ہوتی ہے درمیان پیغمبر اور اخلاف کے۔ جس طرح پیغمبر حقائق کی شہادت دیتا ہے ویسے ہی اس کے فیض یافتہ اپنے اتباع کے لیے شاہد ہوتے ہیں ...... شہادت کے یہ معنی ہیں کہ زندہ نمونہ تلقین اور ایمان ہو۔ اعمال سے عقائد پر شہادت ہوتی ہے۔ عقائد کی پختگی مشاہدہ کی دلیل ہے۔ کشتۂ راہ خدا کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ اپنے یقین پر جان دیتا ہے...... شہادت فرض امت ہے، اور یہود نے اس فرض کو کھلم کھلا ترک کر دیا، پس انشاء امت جدیدہ ضروری ہوگیا۔ (ایک مکتوب کے جواب میں دیکھئے مکاتیب فراہی رحمۃ اللہ علیہ، ص: 98)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو ہمارے لیے ایک مثال اور نمونہ بنایا ہے اور ہمیں ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک امت چھوڑی جو بعد میں آنے والوں کے لیے نمونہ تھی، اور اس امت کے لوگوں کو تمام انسانوں پر گواہ بنایا جس طرح انبیاء علیہم السلام کو ان کے اصحاب پر گواہ ٹھہرایا تا کہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک کبھی نہ منقطع ہونے والا سلسلہ قائم ہو جائے، اور ایک حبل متین، ایک جادہ مستقیم اور ایک طریقہ بین ہمیشہ باقی رہے۔ گویا سلف سے لے کر خلف تک ایک ہی قافلہ ہے جس کے درمیان کوئی فصل نہیں اور از اول تا آخر روشنی کا ایسا حصار قائم ہے جس میں ظلمتوں کے در آنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ شہادت کا اصل اور حقیقی مفہوم یہی ہے۔ (حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، ،، القائد الی عیون العقائد: 17)

---

[1] مستفاد: جو چیز فائدے میں حاصل ہے، بطور فائدہ حاصل شدہ

Marfat.com

بین الاقوامی برادری کی مُسلم اقلیتیں

کرۂ زمین پر مسلمانوں کی صحیح تعداد کتنی ہے اور وہ کہاں کہاں آباد ہیں؟ دنیا کے کس کس حصے میں وہ اقلیت میں ہیں اور یہ اقلیت کن حالات سے دوچار ہے؟ یہ اقلیتیں کیسے وجود میں آئیں اور اب ان کے بطور مسلمان پنپنے کے کیا امکانات ہیں؟ مسلمانوں کے انتہائی سنگ دل معاند کون ثابت ہوئے ہیں؟ یہ سوالات ملت اسلامیہ کے ہر بہی خواہ کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن ان کا کوئی مدلل اور واضح جواب موجود نہ تھا۔ اب مراکش کے ایک فرزند ڈاکٹر علی الکتّانی نے خاص اس موضوع پر ایک کتاب لکھ دی ہے۔ جس میں اس طرح کے تمام سوالوں کا جواب قاری کو مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیشے کے لحاظ سے ایک انجینئر اور شمسی توانائی پر بین الاقوامی حلقوں میں ایک سند مانے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ جدہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اسلامی فاؤنڈیشن کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ وہ مدت سے مسلم اقلیتوں کے حالات و معاملات سے اپنے آپ کو منسلک رکھے ہوئے ہیں اور اس میدان میں بھی ان کی معلومات نہایت مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زیرنظر کتاب کا نام Muslim Minorities in the World Today ہے جو لندن سے مینسل پبلشنگ نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر الکتّانی کے اس جائزے میں وہ تمام ممالک شامل ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔ انہوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں 1982ء میں دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کا تخمینہ ایک ارب تین کروڑ لگایا ہے۔ پینتالیس ممالک اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں شامل ہیں۔ ❶ ان میں سے 23 ممالک براعظم افریقہ، 21 ایشیا اور ایک یورپ میں واقع ہے۔ ایک دو افریقی ریاستوں کے استثناء کے ساتھ ان سب میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں جن کی کل آبادی 64 کروڑ ہے۔ اس تنظیم سے باہر 49 ایسے ممالک ہیں جن میں 39 کروڑ مسلمان اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔ ان ممالک میں سے 18 ملک براعظم افریقہ، 12 یورپ، 11 ایشیا، 7 شمالی و جنوبی امریکہ اور ایک بحرالکاہل میں واقع ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا 3ء 68 فیصد حصہ براعظم ایشیا میں، 4ء 27 فیصد افریقہ میں اور 3ء 4 فیصد یورپ اور امریکہ وغیرہ میں آباد ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی چوالیس فیصد آبادی چھ بڑے مسلم ممالک...... انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی، مصر اور ایران...... میں مرتکز ہے۔ تیس فیصد آبادی چار بڑی اقلیتوں کی صورت میں چین، ہندوستان، نائیجیریا ❷ اور سوویت روس میں رہ رہی ہے اور 26 فیصد دنیا کے باقی

---

❶ اس وقت سلطہ فلسطینیہ سمیت 57 ممالک اسلامی کانفرنس (IC) میں شامل ہیں۔ ''اسلامی کانفرنس کی تنظیم'' کا نام اب صرف اسلامی کانفرنس ہے۔

❷ نائیجیریا 60 فیصد مسلم اکثریت کا ملک ہے، تاہم عیسائیوں کے غلبے کے باعث یہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کا رکن نہیں تھا۔ پھر 1986ء میں صدر ابراہیم بابنگیدا کے عہد میں یہ او آئی سی کا رکن بنا۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعداد دنیا کی کل آبادی کا ایک چوتھائی ہے جبکہ مغربی مصنفین عموماً اسے چھٹا یا ساتواں حصہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس تفاوت کا سبب صحیح اعداد و شمار تک رسائی کی مشکل ہے۔ مسلم اقلیت کے علاقوں میں حکومتیں سیاسی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کی تعداد کو کم ظاہر کرتی ہیں یا سرے سے ان کو الگ مذہبی گروہ کی حیثیت سے شمار ہی نہیں کیا جاتا...... ڈاکٹر صاحب نے ایسے ممالک کی اقلیتوں سے براہِ راست معلومات حاصل کی ہیں اور ان کی صحت کو جانچنے کے لیے انہوں نے مختلف طریقوں پر انحصار کیا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں قدرتی اضافہ تین فیصد سالانہ شرح سے ہو رہا ہے۔

دنیا کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتیں کبھی قائم رہی ہیں وہاں مسلمان آج بھی موجود ہیں۔ اگر وہ اکثریت میں ہیں تو بالعموم علاقے کی حکومت بھی انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ البتہ کہیں کہیں صورتِ حال ان کے موافق نہیں رہی مثلاً یورپ کے ملک البانیہ میں اکیس لاکھ مسلمان ہیں جو ملک کی کل آبادی کا تین چوتھائی حصہ ہیں لیکن وہاں 1946ء سے کمیونسٹ برسر اقتدار ہیں جو ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں اور انہوں نے مسلمان آبادی پر عرصہِ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ [1] بلغاریہ میں اس صدی کے ابتدائی نصف میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ کمیونسٹوں کے تسلط کے بعد ان کی نسل کشی کی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجے میں لاکھوں مسلمان ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ اقلیت میں ہیں اور حکومت کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ اسی طرح وسط ایشیا اور جنوبی روس کے بعض صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں تاہم روس میں ان علاقوں کے ضم ہونے کے باعث پورے ملک کی آبادی کے مقابلے میں وہ اقلیت میں ہیں۔ [2] چین میں سنکیانگ، اوئی غور [3] اور چنگ ہائی کے صوبوں میں بھی یہی کیفیت ہے اور علاقائی اکثریت کے باوجود ملک کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب دس میں ایک ہے۔ افریقہ کے ممالک...... ایتھوپیا، نائیجیریا اور تنزانیہ میں مسلمان اگرچہ اکثریت میں ہیں لیکن حکومتیں عیسائی یا کمیونسٹ ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ عملاً ایک اقلیت کا سلوک کر رہی ہیں۔

مسلمان اقلیتوں کے اس جائزہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام صوفیوں کے ذریعے سے ہی نہیں پھیلا، جیسا کہ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے بلکہ اس کے اسباب متعدد رہے ہیں۔ اسلام کے عروج کے زمانہ میں دنیا کے جو علاقے مسلمانوں کے زیرنگیں آئے وہاں اسلام کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ اس میں ایک نمایاں استثناء ہسپانیہ کا ہے جہاں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت سات آٹھ سو برس تک قائم رہی لیکن بالآخر ان کی حالت اس قدر دگرگوں ہوئی کہ عیسائی غالب آ گئے اور ملک میں کوئی مسلمان متنفس باقی نہ رہا۔ جنوبی ہند، سری لنکا، مشرقی افریقہ کے ساحلی

---

[1] البانیہ میں 1990ء کی دہائی میں کمونسٹ آمریت کے خاتمے پر صورتِ حال بدل چکی ہے اور اب وہاں منتخب جمہوری حکومت کا دور دورہ ہے۔

[2] 1991ء میں وسط ایشیا کے پانچ مسلم ممالک ازبکستان، قازاقستان، تاجکستان، کرغیزستان، ترکمانستان اور قفقاز (کوہ قاف) میں واقع آذربائیجان روسی تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں۔

[3] اویغور یا اوئی غور کوئی الگ صوبہ نہیں بلکہ یہ سنکیانگ (نیا نام شن جیانگ) میں آباد ترک قوم اویغور کہلاتی ہے۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

ممالک، برما، ملایا، انڈونیشیا اور چین کے بعض علاقوں میں مسلمان تاجر اسلام کا پیغام لانے کا ذریعے بنے اور انہوں نے وہاں کی آبادی کو متاثر کر کے مسلمان بنالیا۔ امریکہ دریافت ہوا تو ہسپانیہ اور پرتگال نے اس کی آبادکاری کے لیے اپنے باشندوں کو وہاں بھیجا۔ اس طرح جو لوگ امریکہ منتقل ہوئے ان میں عیسائی آبادی کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو دل سے مسلمان تھے لیکن حکومت نے زبردستی انہیں بپتسمہ دے رکھا تھا۔ نئے ماحول میں جا کر انہوں نے اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کر دی۔ چونکہ یہ لوگ اقلیت میں تھے اس لیے ہسپانیہ اور پرتگال کی حکومتوں نے وہاں بھی ان پر ظلم و زیادتی کی ہر قسم کو آزمایا، تاہم وہ اپنا وجود باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے اور ان کی نسل آج بھی ارجنٹائن، برازیل، میکسیکو، ٹرینیڈاڈ ٹوباگو، سوری نام اور گائیانا میں آباد ہے۔ ان ممالک میں اسلام کے داخل ہونے کا دوسرا اہم ذریعہ وہ افریقی بنے جن کو یورپی اقوام نے افریقہ سے پکڑ کر امریکہ کی منڈیوں میں غلام بنا کر بیچا۔ ان میں خاصی تعداد مسلمانوں کی تھی جنہوں نے وہاں اپنا اسلامی تشخص قائم رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے متحد ہو کر بغاوتیں بھی کیں لیکن عیسائی اکثریت کے مقابل میں ان کو کوئی پیش نہیں چلی۔ اس نے ہر ممکنہ طریقہ سے مسلمان نسل کو اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی۔ اس صدی میں امریکی گوروں کے اندر نسلی امتیاز کے احساس نے امریکہ کی سیاہ فام آبادی میں دوبارہ یہ شعور پیدا کیا ہے کہ وہ افریقہ کے غالب دین...... اسلام...... کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی تحریک برازیل کی سیاہ فام آبادی میں بھی چل رہی ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک پر کمیونسٹوں کے تسلط کے بعد یوگوسلاویہ، البانیہ، رومانیہ اور ہنگری کے لاکھوں مسلمانوں نے ہجرت کی اور وہ مغربی یورپ کے کئی ممالک، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں آباد ہو گئے۔ ان ممالک میں اسلام کا وجود ان مہاجرین کا مرہونِ منت ہے۔ بیسویں صدی میں انگلستان، فرانس، ہالینڈ وغیرہ یورپی ممالک کی نوآبادیاں ختم ہوگئیں تو ان نوآبادیوں کے باشندوں کو یہ موقع ملا کہ وہ سابق آقاؤں کے ملکوں میں ان کی سابق رعایا ہونے کے ناتے شہریت کے حقوق حاصل کر سکیں۔ چنانچہ برصغیر ہند، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک سے لاکھوں باشندے یورپ میں آباد ہو گئے۔ ان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

ان کی جمعیت کے باعث ان ملکوں میں مسلم اقلیت کے مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ جدید ترین مسلم اقلیت کوریا میں پیدا ہوئی ہے۔ 1950ء کے عشرے میں اقوام متحدہ کی جو فوج اس علاقے میں تعینات ہوئی۔ اس میں ایک دستہ ترک فوج کا بھی تھا۔ انہوں نے اپنی چھاؤنی میں ایک عارضی مسجد بنائی جس نے کوریائی باشندوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اسلام کے نظام زندگی نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ کوریا میں اسلام قبول کرنے کی ایک رو چل پڑی۔ اب وہاں مسلمانوں کی تعداد بائیس ہزار سے متجاوز ہے۔ [1] روس کی کمیونسٹ حکومت نے تاتاری نسل کے مسلمان باشندوں پر سخت ظلم و تشدد کیا تو ان میں سے کچھ لوگ جاپان کو نکل گئے۔ ان کے باعث اسلام جاپان میں داخل ہوا اور اس وقت

---

[1] یہ نئی مسلم اقلیت جنوبی کوریا کی ہے جہاں کوریا کی خانہ جنگی (53-1950ء) کے زمانے میں ترک فوج اقوامِ متحدہ کی افواج میں شامل ہو کر کمونسٹ شمالی کوریا کے خلاف لڑی تھی۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

جاپانی مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار ہے۔ چونکہ جاپان اور (جنوبی) کوریا میں مذہبی آزادی ہے اور یہاں کے باشندے تنظیم کا شعور رکھتے ہیں اس لیے ڈاکٹر الکتانی کو ان دونوں ممالک کے مسلمانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

مختلف ممالک میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتہائی متعصب اور کٹر دشمن عیسائی اور کمیونسٹ ثابت ہوئے ہیں۔ عیسائی تعصب کا سب سے بڑا تجربہ مسلمانوں کو اندلس میں ہوا۔ یہ علاقہ جرمنی سے اُٹھنے والے غارت گروں کی زد میں تھا جب یہاں کے باشندوں نے مسلمان جرنیل موسیٰ بن نصیر کو مدد کے لیے پکارا۔ 713ء میں اسے آزاد کرالیا گیا [1] اور اس کا انتظام المغرب کی مسلمان حکومت نے سنبھالا۔ 756ء میں یہاں اموی سلطنت قائم ہوگئی۔ اس علاقے میں شمالی افریقہ سے بھی مسلمان آ کر آباد ہو گئے لیکن زیادہ تعداد اندلس کے اپنے باشندوں کی تھی جو مسلمان ہو گئے۔ اموی حکومت نے کئی سو سال تک ملک کو متحد رکھا اور اس کو اتنی ترقی دی کہ ہسپانیہ دوسرے یورپی ممالک کے لیے روشنی کا مینار بن گیا۔ جب مسلمان حکومت کمزور ہوگئی تو نسلی امتیاز کے بھوت نے سر اٹھایا۔ ملک میں طوائف الملوکی [2] پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنا تحفظ نہ کر سکیں اور عیسائیوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ 1492ء میں آخری ریاست غرناطہ کی شکست کے بعد مسلمانوں کی حیثیت دوسرے درجے کے شہریوں کی ہوگئی جن پر ہر ظلم روا رکھا گیا۔ سولھویں صدی میں ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ ان زبردستی بپتسمہ دیے گئے مسلمانوں کو ''مورسکو'' Morisco کا نام دیا گیا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ دل سے مسلمان ہے تو اس کو سولی پر چڑھا دیا جاتا یا زندہ جلا دیا جاتا۔ ہزاروں مورسکو جنوبی امریکہ کی آبادکاری کے لیے لے جائے گئے اور مختلف حالات میں انھوں نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا لیکن عیسائی تعصب نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ خود اندلس میں مسلمانوں نے منظم بغاوتیں کیں لیکن وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بالآخر وہ 1609ء میں حکومت سے ملک چھوڑنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور پانچ برس میں انھوں نے ملک خالی کر دیا۔ یہی سلوک یونان اور مشرقی یورپ کے ممالک کی کئی عیسائی حکومتوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ کیا اور آج ایتھوپیا، میانمار (برما) اور فلپائن کی عیسائی ریاستوں میں بھی ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔

کمیونسٹوں کو جہاں کہیں بھی تسلط حاصل ہوا ہے انھوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ کا سنگ گراں سمجھا ہے اور ان کی بیخ کنی کے منصوبے بنائے ہیں۔ سوویت روس کے ایک تہائی رقبہ میں مسلمان بڑی تعداد میں تھے۔ ترکمانستان، ازبکستان، قازاقستان، تاجکستان، آذربائیجان اور کرغیز یہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر کمونسٹ روسی حکومت نے ان کو کھدیڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی آبادیوں میں دہشت پھیلائی گئی، لیڈروں کو قتل کیا گیا، املاک کو ضبط کر لیا گیا، مساجد اور دینی مظاہر کو تباہ کیا گیا، لاکھوں مسلمان مصنوعی قحط پیدا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، لاکھوں

---

[1] ساتویں صدی عیسوی میں اسپین (اندلس) پر جرمانک نسل کے گاتھ حکمران تھے جن سے راڈرک (رزریق) نامی ظالم شخص نے حکومت چھین لی تھی۔ موسیٰ بن نصیر کے جرنیل طارق بن زیاد نے 711ء میں شاہ راڈرک کو شکست دے کر اسلامی اندلس کی بنیاد رکھی تھی۔ (محسن فارانی)

[2] طوائف الملوکی: کمزور بادشاہوں (ملوک) کا یکے بعد دیگرے جلد جلد برسر اقتدار آنا۔

Marfat.com

کو ان کے علاقوں سے نکال کر دور دراز غیر آباد علاقوں میں بسنے پر مجبور کیا گیا۔ تاتاری نسل کے مسلمانوں کی تو قومی جمعیت ہی بالکل ختم کر دی گئی۔ یہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ ان ممالک میں ہوا جہاں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی حکومتیں قائم ہوئیں، مثلاً یورپ میں البانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور رومانیہ میں، افریقہ میں تنزانیہ اور موزمبیق میں اور ایشیا میں برما، کمبوڈیا، چین اور منگولیا میں مسلمان انتہائی ظلم و تعدی کا نشانہ بنے ہیں اور کمیونزم نے ان کو کبھی پنپنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق اس وقت دنیا میں سب سے بڑی مسلم اقلیتیں جن کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ حسب ذیل ممالک میں ہیں:

چین	مسلمان دس کروڑ ستر لاکھ	کل آبادی کا 5ء 10 فیصد
انڈیا	ساڑھے آٹھ کروڑ	12 فیصد
نائیجیریا	ساڑھے پانچ کروڑ	60 فیصد
روس	پونے پانچ کروڑ	8ء17 فیصد [1]
ایتھوپیا	دو کروڑ پانچ لاکھ	60 فیصد
تنزانیہ	ایک کروڑ چار لاکھ	55 فیصد
فلپائن	باسٹھ لاکھ	2ء12 فیصد
تھائی لینڈ	ساٹھ لاکھ	12 فیصد
کینیا	ترپین لاکھ	30 فیصد

ان ممالک میں نائجیریا، ایتھوپیا اور تنزانیہ میں اگرچہ مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن حکومت متعصب عیسائیوں یا کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا یہ ممالک اسلامی تنظیم میں شامل نہیں ہوئے اور مسلمان وہاں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود عملاً اقلیت ہی کے حقوق رکھتے ہیں لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے ان ممالک کو مسلم اقلیت ہی کا علاقہ شمار کیا ہے۔ [2]

موجودہ چین کا مغربی علاقہ پہلی ہجری میں اس وقت اسلام سے روشناس ہوا جب قتیبہ بن مسلم کے زیر کمان کاشغر کو فتح کیا گیا۔ چینیوں نے صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی جس کے باعث مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی، البتہ چین کے ساتھ ثقافتی تعلقات قائم ہو گئے جن کے نتیجے میں اس کے مغربی علاقوں میں لوگ اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ تیرہویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک منگول اور منگ خاندانوں کی حکومتوں میں ان مسلمانوں کو عزت و احترام حاصل رہا اور وہ حکومت میں دخیل رہے۔ 1644ء میں مان چو خاندان برسر اقتدار آ گیا جس نے ان پر بڑی سختیاں کیں۔ مسلمان رعایا حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ برسر پیکار رہی۔ بالآخر اس نے جمہوریت پسند طاقتوں

---

[1] 1991ء میں روس کے قبضے سے ترک نسل کے پانچ وسط ایشیائی مسلم ممالک اور آذربائیجان آزاد ہو چکے ہیں جب کہ دیے گئے اعداد و شمار پہلے کے ہیں۔

[2] نائیجیریا میں اگرچہ جنرل جانسن ارونسی، جنرل یعقوبو گوون، جنرل الوسیگن اباسنجو اور جوناتھن گڈ لک جیسے برسر اقتدار رہے ہیں مگر اس وقت وہاں جنرل (ر) محمد بخاری منتخب صدر مملکت ہیں اور نائیجیریا اسلامی کانفرنس کا رکن بھی بن چکا ہے۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

کا ساتھ دے کر 1911ء میں اس ظالم حکومت سے نجات پائی۔ اس کے بعد 38 سالوں میں احیائے دین کا نہایت مفید کام ہوا اور اقتدار میں بھی مسلمانوں نے حصہ لیا۔ 1948ء میں ماؤزے تنگ کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد پھر مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ ماؤ کے بعد چینیوں نے جب سے ''چار کے ٹولے'' سے نجات حاصل کی ہے، حکومت کی پالیسیوں میں قدرے تبدیلی آئی ہے اور اس وقت مسلمانوں کو پھر سے اپنے دین کے اظہار کا موقع حاصل ہے۔ چونکہ چین اور روس کے سرحدی علاقے میں دونوں جانب مسلمان اکثریت میں ہیں اس لیے دونوں حکومتیں ان کو اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتیں کہ وہ مشتعل ہو جائیں۔ یہ پوزیشن مسلمانوں کے لیے مفید نظر آتی ہے۔

برصغیر ہند کی تقسیم کے بعد بھارت میں مسلمان اگرچہ بارہ فیصد ہیں لیکن ہندوؤں نے ان کو آہستہ آہستہ ثانوی حیثیت میں لا ڈالا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی صرف دو فیصد ہے اور وہ بھی زیادہ تر ذمے داری کے عہدوں پر نہیں۔ اردو زبان کو نوے فیصد مسلمان سمجھتے ہیں اور اس میں ان کے بیشتر دینی علوم منتقل کیے جا چکے ہیں لیکن اس کو حکومت زبان کی حیثیت سے پنپنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی نئی نسل اپنے دینی ورثہ سے بے بہرہ ہو رہی ہے۔ مسلمانوں نے جتنے تعلیمی ادارے قائم کیے ان کو حکومت نے قبضہ میں لے کر ہندو منتظمین کے حوالے کر دیا ہے اور ان میں تعلیم اب زیادہ تر ہندو طالب علم ہی پا رہے ہیں۔ نصاب تعلیم خالص ہندوانہ ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ زرعی و صنعتی میدان میں حکومت کی پالیسی تعصب پر مبنی ہے۔ زراعت کے میدان میں ''سبز انقلاب'' کے اثرات سے مسلمانوں کی زمینوں کو فائدہ نہیں پہنچنے دیا گیا۔ ان صنعتوں کے بارے میں معاندانہ پالیسی اپنائی گئی ہے جن میں مسلمان قدرے نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ مزید برآں مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ 1964ء سے 1983ء تک بیس برسوں میں ہندوستان میں 7287 ہندو مسلم فسادات ہوئے جن میں ہندوؤں کو پولیس اور فوج کی پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے باہم مل کر مسلمانوں کا خون بہایا۔ بھارت میں اگرچہ سیکولر جمہوری نظام حکومت قائم ہے لیکن یہ سیکولرازم ایک پردہ ہے جس کے پیچھے مذہبی اقلیتوں کو ہندو اکثریت کے نقطۂ نظر میں ڈھالا جا رہا ہے اور یہ جمہوریت بھی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کی قائل نہیں۔ اس صورت حالات میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں رابطہ اور اتحاد کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور انہوں نے بعض امور میں مشترک لائحہ عمل اختیار کیا ہے۔

ایتھوپیا میں عیسائیوں کی متعصب حکومتوں کا سلسلہ شاہ ہیل سلاسی کے خلاف 1974ء کے فوجی انقلاب تک جاری رہا۔ اس کے بعد سوشلسٹ حکومت قائم ہوئی جس نے مسلمانوں کو دبانے کے لیے روس اور کیوبا کے سپاہیوں کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس ملک کے مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے۔ مختلف تنظیمیں الگ الگ اہداف رکھتی ہیں اس لیے نقصان اٹھائے چلی جا رہی ہیں۔ تنزانیہ میں مسلمان خاصے منظم ہیں لیکن اقتدار عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے اور حکومت مسلمانوں پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں کے کام میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے اور اسلامی جماعتوں پر پابندی ہے تاہم مساجد اور مدارس کام کر رہے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بھی اقلیت کے

Marfat.com

حکم میں نہیں آتے۔ کینیا کے حالات تنزانیہ کے مشابہ ہیں۔ ❶

فلپائن کا علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا جب اسپین نے سولہویں صدی میں اس پر قبضہ کر لیا۔ عیسائی حکومت نے مسلمانوں کے لیے وہی پالیسی اپنائی جو اس نے اسپین میں ان کے ساتھ روا رکھی تھی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ملک میں ظلم و تشدد کا دور شروع ہوا، اور مسلمان اس کے خلاف جدوجہد پر مجبور ہوئے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اس قدر کشیدگی ہے کہ وقتاً فوقتاً مسلح بغاوتوں اور فوجی مقابلوں کی نوبت آ جاتی ہے، تاہم مسلمان اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ تھائی لینڈ میں مسلمان اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن تھائی حکومت ان کو دبائے رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ ❷ کتنے ہی مسلمان لیڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نام بدلیں اور تھائی نام رکھیں۔ ان کے تعلیمی اداروں کو تباہ کیا گیا اور ان کی زبان سے ملائی اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں بھی مسلمان اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح مسلمانوں نے اپنے دین کو سنبھالا ہے یہ اسلام کی حقانیت اور عظمت کی ایک دلیل ہے۔ یہ دین دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں جس طرح پھیلا ہوا ہے خواہ بعض ریاستوں میں اس سے وابستہ لوگوں کی تعداد کتنی ہی کم ہو، اس سے اس کی آفاقیت کی شہادت ملتی ہے۔ یہ کسی خاص خطے یا خاص طبقے کا دین نہیں، یہ ہر اس شخص کا دین ہے جو اس کے بنیادی عقیدہ کو مانتا ہو اگرچہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ اور نسل سے ہو۔ لہٰذا پوری دنیا مسلمانوں کی ہے اور مسلم اقلیتوں کے ہمدرد ہر جگہ موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مسلم اقلیتوں کی جن کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سرفہرست اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے ساتھ وفاداری کا کمزور داعیہ اور ملی اتحاد کا فقدان وہ خطرناک بیماریاں ہیں جو ان کو مستقبل میں شدید نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک مسلم اکثریت کے ممالک ابھی تک مسلم اقلیتوں کے بارے میں صحیح پالیسی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے سفارت خانے ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن کے نتیجے میں مسلم اقلیتوں کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر سفارت کاروں کی کونسلیں بنا کر ان کو مساجد کا انتظام سونپنا، باہر سے اماموں کا تقرر کرنا اور غیر نمائندہ تنظیموں کی براہِ راست مالی امداد کرنا یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ مسلمان اپنی دھرتی کے فرزند نہیں بلکہ بیرون ملک کے نمائندہ ہیں جن کی وفاداری مشکوک ہے۔ اس طرح کے تاثر نے ان مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ معاملات میں مشکلات سے ہمکنار کیا ہے۔ سفارت خانوں کا تعلق سیاسی نوعیت کا ہرگز نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ثقافتی، مذہبی اور معاشی نوعیت تک محدود ہونا چاہیے۔ مالی امداد صرف منظم اداروں کو مخصوص منصوبوں کے لیے دی جائے۔ بعض فرقوں یا غیر نمائندہ افراد کو امداد دینے سے اجتناب کیا جائے۔ ماضی میں

---

❶ کینیا کے حالات مسلم اکثریتی تنزانیہ سے مختلف ہیں۔ کینیا میں مسلم آبادی 20 فیصد کے لگ بھگ ہے جو زیادہ تر صومالی نسل کے ہیں۔

❷ تھائی لینڈ کے زیر قبضہ خاکنائے کرا میں پٹانی کے علاقے میں ملائی نسل کے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

مغربی ممالک کی بعض یونیورسٹیوں کے اسلامیات کے شعبوں کو مالی امداد دی گئی جو انہوں نے اپنے خلافِ اسلام منصوبوں کی تکمیل میں صرف کی۔ اسی طرح جو امداد آفت زدہ علاقوں کی مسلمان آبادی کے لیے بعض بین الاقوامی اداروں کو دی گئی وہ عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دی گئی اور مسلمان اس سے محروم رہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مسلم اقلیتوں کی نمائندہ تنظیمیں قائم ہوں اور اس طرح کے مواقع پر مالی امداد ان کے محفوظ ہاتھوں میں جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی ممالک دوسری ریاستوں کے ساتھ اپنے روابط میں اس بات کو خاص اہمیت دیں کہ ان ریاستوں کا رویہ اپنی مسلم رعایا کے ساتھ کیسا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسلم اقلیتوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے ان کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجاہد بنائیں اور اس جہاد میں اگر حالات ان کے لیے سازگار نہ ہوں تو وہ ہجرت کے لیے تیار رہیں۔ اس بارے میں انہیں مکہ کے اولین مسلمانوں کا رویہ اپنانا چاہیے جنہوں نے کفر سے دب کر رہنے کے بجائے پہلے حبشہ کو اور پھر مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔ یہاں معلوم نہیں کیوں فاضل مصنف اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ صدر اول کے مسلمانوں کے لیے دین اصل سرمایہ تھا۔ وہ اس کا گہرا علم اور شعور رکھتے تھے۔ وہ اس کی خاطر دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا سکتے تھے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب کے اپنے تجزیہ کے مطابق اس وقت مسلمانوں کا سرفہرست مسئلہ دین سے بے بہرہ ہونا اور اس کے ساتھ وفاداری کا کمزور ہونا ہے۔ اس صورت حال میں ان کو جہاد اور ہجرت کی ترغیب دینے سے پہلے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دین کو محض ثانوی حیثیت نہ دیں بلکہ اس کی خاطر قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔ خود علم دین سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ اس طرح ان کی جمعیت مضبوط ہوگی اور اپنی تنظیم کے ذریعے وہ مستقبل میں اپنی نسل کو بہتر ماحول دے سکیں گے۔

علم وحکمت

قیامت پر ایمان علم وحکمت کی اصل ہے جیسا کہ ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ سے ظاہر ہے۔ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اسے علم کے دروازے کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کے اندر خشیت آخرت پر ایمان سے پیدا ہوئی ہے اور جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو اس عالم محسوس سے آگے کی باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ کبر اور استغناء سے اس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ آیَاتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ آیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا.....﴾ (سورہ اعراف:146......تعلیقات، سورۂ زمر: 27)

Marfat.com

تصوّف کی حقیقت

علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم ملک کی ایک سیاسی شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے لیکن ان کی یہ خاص علمی ذوق بھی تھا کہ وہ مختلف فرقوں کے بارے میں برابر مطالعہ کرتے رہتے اور پھر اپنے مطالعہ کا نچوڑ اعلیٰ تحقیقی کتابوں کی صورت میں پیش کرتے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر فرقہ کی اپنی کتابوں پر اعتماد کیا اور ان کے اقتباس نقل کرنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے بیشتر عربی زبان میں لکھا اور عربوں کو مختلف فرقوں سے خوب روشناس کرایا۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب "التصوف" بھی ہے۔

تصوف ایک عالمگیر طرزِ فکر اور طرز عمل ہے جس کا وجود ہر مذہب میں پایا جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی براعظم سے ہو۔ جہاں تک مسلمان صوفیا کا تعلق ہے، وہ صرف ہمارے ملک کے مختلف حصوں ہی میں نہیں ہوئے بلکہ آپ جس اسلامی ملک میں چلے جائیں وہاں آپ کو خانقاہی سلسلے بھی ملیں گے، پیروں فقیروں سے بھی سابقہ پیش آئے گا۔ مزاروں پر لوگوں کا جمگھٹا بھی ہوگا اور عرسوں کے مواقع پر آپ صوفیوں کے طور طریقوں کا مشاہدہ بھی کریں گے۔ کہیں قوالیاں ہوں گی، کہیں رقص اور دھمال کا انتظام ہوگا اور چلہ کشیوں اور اوراد و وظائف کا تذکرہ تو آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ بڑے سے بڑے روشن ضمیر صوفی کی کتابیں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسلام میں شریعت اور طریقت کی دو شاخیں مانتے ہیں۔ اول الذکر کو چھلکے سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کا وارث علماء کو سمجھتے ہیں۔ طریقت کو اصل مغز مانتے ہیں اور اس کے اجارہ دار وہ خود ہیں۔ قران وسنت کو ان کے ہاں وہ اہمیت حاصل نہیں جو اہمیت ان کے اپنے سلسلہ کے طریقوں کو حاصل ہے۔ صوفیاء کے ساتھ عوام الناس کو بڑی عقیدت ہے۔ ان کی ثقافتی سرگرمیوں کا بہت سا تعلق مزارات کے ساتھ ہے اور وہ اسلام کی جس تعبیر سے واقف ہیں اس میں تصوف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اسلام کی صحیح تعبیر اس سے کتنی مختلف ہے۔

علامہ صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بتایا ہے کہ تصوف کب وجود میں آیا، اس کے بانی مبانی کون تھے اور اس کے افکار ونظریات اور طور طریقے کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک صوفی کا اطلاق سب سے پہلے جن اشخاص پر ہوا وہ جابر بن حیان، عبدک اور ابو ہاشم کوفی تھے۔ جابر اور ابو ہاشم دونوں کوفی شیعہ تھے۔ عبدک کا تعلق مصر سے تھا اور وہ بھی موروثی امامت کا قائل تھا، یہ تینوں اپنے عہد میں زندیق کہلائے۔ ان کے سال وفات دوسری صدی

Marfat.com

ہجری کے نصف آخر اور تیسری صدی کے اوائل میں پڑتے ہیں۔ اس لیے اہل تحقیق کے نزدیک تصوف تیسری صدی میں روشناس ہوا ہے۔ صوفیاء خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کے دور میں صوفی اور تصوف کے الفاظ موجود نہ تھے۔ اس پاکیزہ دور میں لوگوں کو مسلم، مومن، زاہد، عابد، وغیرہ صفات سے پہچانا جاتا تھا جن کے مفہوم سے لوگ بخوبی واقف تھے۔

مسلم معاشرے میں تصوف کا آغاز کیسے ہوا؟ اس ذیل میں فاضل مصنف نے تین آراء بیان کی ہیں۔ خود صوفیاء کے نزدیک تصوف زہد کا دوسرا نام ہے جو ایک معروف اسلامی اخلاق ہے۔ اسی کی تربیت کے نظام کو تصوف کا نام دیا گیا۔ البتہ بعد میں اس میں اجنبی فلسفے بھی داخل ہو گئے۔ اس رائے کو ابن تیمیہ اور شوکانی نے بھی اختیار کیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تصوف کو اسلام سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح یہ نام اجنبی ہے اسی طرح اس کا مسلک بھی اسلام کے لیے اجنبی ہے۔ لہٰذا قرآن وسنت میں اس کی بنیادیں تلاش کرنا ایک بیکار کام ہے۔ اہل سنت کے بہت سے فقہاء و متکلمین اور مستشرقین کی اکثریت اسی رائے کی حامل ہے۔ تیسری رائے کے مطابق تصوف مختلف مذاہب کے افکار و نظریات کا ایک ملغوبہ ہے۔ اس میں جہاں اسلام کی بعض باتیں لی گئی ہیں وہیں یہودیت، عیسائیت، مانویت ❶، مزدکیت ❷، مجوسیت، بدھ مت، جین مت، ہندو مت اور فلسفہ یونان سے بھی خیالات لیے گئے ہیں۔ اس رائے کو بعض صوفیاء نے خود بھی بیان کیا ہے۔ فاضل مصنف اسی آخری رائے کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف میں خانقاہ کا تصور یہودیوں سے، رہبانیت کا تصور عیسائیوں سے، برہمنی نظام ہندوؤں سے، ترک دنیا کی تعلیم بدھ مت سے اور فکر مجوس اور یونانی فلاسفہ سے لی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ان تصورات کو ملا کر تصوف کی داغ بیل ڈالی گئی۔

فاضل مصنف نے اپنی رائے کے حق میں دلائل کا ایک انبار لگا دیا ہے، مثلاً ان کے نزدیک مشہور صوفی ابراہیم بن ادہم کے تحت حکومت سے فرار اور گوتم بدھ کے ترکِ حکومت میں گہری مشابہت ہے۔ صوفیوں کا مخصوص لباس اور ہیئت کذائی راہبوں کی طرح ہے۔ ان کی لاہوت اور ناسوت کی اصطلاحیں عیسائیوں سے آئی ہیں اور دنیا سے دور بھاگنا، شادی کو جنجال سمجھنا اور اپنے اوپر خدا کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام کر لینا رہبانیت کا اثر ہے۔ صوفیا میں اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرنا، فاقے کرنا، مراقبہ کرنا اور سانس روکنے کا عمل ہندو جوگیوں سے آیا ہے۔ جنید بغدادی کا قول ہے کہ ہم نے تصوف قیل وقال سے نہیں بلکہ فاقہ کشی، ترکِ دنیا اور مرغوبات سے اجتناب کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ سہل تستری کا قول ہے کہ ابدال پیٹ کو خالی رکھنے، راتیں جاگنے، خاموشی اختیار کرنے اور تنہا رہنے

---

❶ مانویت: ایران کے مشہور نقاش مانی (پیدائش 215ء) نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کا عقیدہ ''مانویت'' مجوسیت، بدھ مت اور عیسائیت کا ملغوبہ تھا۔ شاہ بہرام اوّل نے اسے قتل کرا دیا۔

❷ مزدکیت: ایران میں چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں مزدک نے ایک طرح کے سوشلسٹ معاشرے اور عورتوں میں مردوں کی شراکت کا پرچار کیا۔ اس کا فلسفہ مزدکیت کہلاتا ہے۔ نوشیرواں کے باپ شاہ قباد نے مزدک کو قتل کرا دیا تھا۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

سے بنتے ہیں۔ جوگیوں کے اثر کے تحت بعض صوفی غاروں میں کھانے اور پوشاک سے بے پروا رہتے رہے ہیں اور ان میں سے بعض مانگ کر کھانے کو نیکی سمجھتے رہے ہیں۔ مصنف کے نزدیک آپ شری شنکر اچاریہ کی ویدانت کی بحث پڑھیے اور پھر حلاج، ابن عربی اور جلال الدین رومی کے وحدت الوجود اور حلول کے فلسفہ کو پڑھیے تو کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کی وحدت الشہود کی تقریر اور اپنشد کے شارح رام نوج اچاریا کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ نروان حاصل کرنے کے لیے بدھوں کا گیان دھیان اور صوفیوں کی توجہ اور مراقبہ ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ معرفت، فیض، محبت اور اشراق کے فلسفے نو افلاطونیت [1] کی پیداوار ہیں۔ اہل فارس نے تصوف کے پھیلانے میں جو مستعدی دکھائی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اولین صوفیوں، ابراہیم بن ادہم، شقیق بلخی، بایزید بسطامی، یحییٰ بن معاذ رازی، سب کا تعلق اسی سرزمین سے ہے اور تصوف کا اہم مرکز خراسان [2] رہا ہے جو اسلام سے قبل بھی مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے باہم ملنے کی جگہ تھی۔

امتِ مسلمہ کے اندر زہد اور تربیتِ اخلاق کے نام پر غیر اسلامی افکار اتنے منظم طریقے سے کس طرح داخل ہو گئے؟ اس بارے میں علامہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ شیعہ مذہب کے پھیلاؤ کی راہ میں امت کے اندر پائی جانے والی عصبیت ایک رکاوٹ بنی ہوئی تھی جس کے باعث شیعیت کا اثر محدود تھا۔ شیعوں نے تصوف کی آڑ میں اپنے نظریات پھیلائے اور مسلمانوں نے صوفیوں کی ظاہری نیکی کو دیکھتے اور ان کو اہل اللہ سمجھتے ہوئے ان پر اعتماد کیا۔ اس طرح جو مقصد شیعہ اپنی سیاسی تنظیم سے حاصل نہ کر سکتے تھے وہ انہوں نے تصوف کے ذریعے حاصل کیا۔ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے مصنف نے بڑے مسکت دلائل فراہم کیے اور صوفیاء اور شیعہ مصنّفین کے خیالات کا تقابل کر کے دکھایا ہے کہ تصوف شیعیت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تجزیہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے رائج کردہ اسلام اور شیعیت کے نظریات میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس کا مشاہدہ ہم اپنے ملک میں کر سکتے ہیں۔

علامہ صاحب کی پہلی دلیل یہ ہے کہ تصوف کے سلسلوں کا آغاز، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوتا ہے جو شیعہ کے پہلے امام ہیں۔ صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ سب سے بڑے زاہد تھے اس لیے وہ اہل تصوف کے امام ہیں۔ حقیقت یہ نہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی سب سے زیادہ زاہدانہ تھی۔ ان کی وفات ہوئی تو کوئی دینار و درہم ترکہ میں نہ چھوڑا۔ ان کے کفن کے لیے ان کے مستعمل کپڑے ہی استعمال میں لائے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان کے لباس پر پیوند ہی پیوند نظر آتے تھے۔ سفر حج پر گئے تو خیمہ میسر نہ تھا۔ اپنی

---

[1] نو افلاطونیت: افلاطون کے نظریات پر مبنی مذہبی فلسفہ جس کا فلاطینوس نے تیسری صدی عیسوی میں پرچار کیا۔

[2] ماضی کا خراسان، سمرقند و بخارا، بلخ و ہرات (افغانستان)، مرو (ترکمانستان) اور مشرقی ایران پر مشتمل تھا۔ ان دنوں صرف مشرقی ایران کا علاقہ خراسان کہلاتا ہے جو تین صوبوں میں بٹا ہوا ہے: خراسان شمالی، خراسان رضادی اور خراسان جنوبی۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

چادر کسی درخت پر پھیلا دیتے اور اس کے سائے میں آرام کرتے۔ مرتے وقت وصیت فرمائی کہ گھر کا سامان بیچ کر وہ مال بیت المال کو لوٹا دیا جائے جو بطور خلیفہ وہاں سے لیا گیا تھا۔ اگر یہ ناکافی ہو تو ان کے قبیلہ بنی عدی سے اپیل کی جائے کہ وہ اس میں امداد دیں۔ اس کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار بیویاں، انیس (19) ام ولد کنیزیں، چوبیس (24) لڑکے لڑکیاں اور متعدد خدام چھوڑے جن کے پاس زمین کے وسیع قطعات تھے جن کی آمدنی سے وہ بسہولت زندگی بسر کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد انہی کی نسل کے کئی افراد اہل تصوف کے شیخ بھی کہلائے اور شیعوں کے امام بھی۔ محمد باقر، جعفر صادق ❶، موسیٰ کاظم اور علی رضا ❷ تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔ اِس کے بعد تصوف کے اکابر معروف کرخی، سری سقطی، داؤد طائی اور جنید بغدادی آتے ہیں۔ معروف نومسلم تھے جو علی رضا کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ دوسرے ان کے دوست یا رشتہ دار تھے۔ شفیق بلخی موسیٰ کاظم کے اور بایزید بسطامی جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ حسن بصری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد بتایا جاتا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک ان کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ پس تصوف کے سلسلوں کا آغاز جن لوگوں نے کیا وہ تمام شیعہ اماموں کے پروردہ لوگ تھے۔ لہٰذا اہل تصوف کے افکار میں شیعی معتقدات کا اثر نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً:

(ا) شیعہ کے نزدیک اماموں کو وہ روحانی کمالات حاصل ہوئے ہیں جو کسی مقرب فرشتہ اور نبی کو بھی حاصل نہیں ہوتے۔ چنانچہ جعفر صادق کا قول نقل ہوا ہے کہ اگر میں موسیٰ وخضر کے ساتھ موجود ہوتا تو ان کو بتاتا کہ میں ان دونوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اسی عقیدہ کو خمینی نے اپنی کتاب ولایت فقیہہ میں بدیں الفاظ بیان کیا ہے:

> ''ہمارے مذہب کی ضروریات میں سے یہ بات ہے کہ کسی شخص کو اماموں کے معنوی و روحانی کمالات حاصل نہیں ہو سکتے، حتیٰ کہ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی ان کو نہیں پا سکتا۔ ہمارے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ عالم کے وجود میں آنے سے قبل امام عرش کے سایہ میں بصورتِ نور موجود تھے۔''

یہی بات صوفیا کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اولیاء کو وہ تمام خصوصیات حاصل ہوتی ہیں جو انبیاء کو حاصل ہیں۔ اولیاء ملائکہ کو دیکھتے اور ان سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ شیخ الجیلی ❸ نے دعویٰ کیا کہ انہیں معراج ہوئی۔ انہوں نے

---

❶ جعفر صادق: اثنا عشریہ کے چھٹے امام جن سے فقہ جعفریہ منسوب ہے۔ یہ امام باقر کے فرزند تھے، جعفر صادق (وفات 128ھ) کے بیٹے امام موسیٰ کاظم تھے۔ جعفر صادق امام ابوحنیفہ کے ہم عصر تھے۔

❷ علی رضا: اثنا عشریہ کے آٹھویں امام جو امام موسیٰ کاظم کے فرزند تھے۔ ان کو خلیفہ مامون عباسی نے اپنا جانشین بنایا مگر وہ 203ھ میں مامون کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ امام علی رضا مشہد (ایران) میں دفن ہوئے۔

❸ شیخ الجیلی: عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی (768ھ۔811ھ) شیخ عبدالقادر جیلانی کی صاحبزادی کی اولاد میں سے تھے۔ ابن عربی کے پیرو کار تھے۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

سدرۃ المنتہیٰ دیکھی اور رب کی تجلیات کا مشاہدہ کیا۔ شیخ تاج الدین سے جب کچھ پوچھا جاتا تو کہتے ذرا صبر کرو، جبریل کو آ لینے دو۔ ابوالحسن خرقانی ❶، ابن عربی ❷ اور کئی اور صوفیاء نے بھی اپنے سفر معراج کا ذکر کیا ہے۔

(ب) جس طرح شیعہ امام غیب تک رسائی رکھتے ہیں، اسی طرح صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ جب حجاب دور ہو جاتے ہیں تو ہر وہ چیز روشن ہو جاتی ہے جو لوح محفوظ میں چھپی ہوتی ہے، اور قطب کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عرش، کرسی، آسمانوں، زمینوں اور تمام لوگوں کے نام ونسب، عمر اور اعمال تک سے واقف ہوتا ہے۔

(ج) شیعہ امام انبیاء کے مساوی ہیں بلکہ ان کو انبیاء پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ اولیاء انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں۔ بایزید بسطامی کا قول ہے کہ ہم ان سمندروں میں کود گئے، انبیاء جن کے ساحلوں پر کھڑے رہ گئے۔ اور اے گروہ انبیاء، لقب تو تمہیں مل گیا لیکن عطا ہمیں وہ کچھ ہوا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا۔ بسطامی کا یہ دعویٰ بھی نقل ہوا ہے کہ "اللہ کی قسم! میرا جھنڈا محمد ﷺ کے جھنڈے سے بڑا ہوگا۔ یہ نور کا ہوگا اور اس کے نیچے جن وانس ہوں گے جو سب کے سب نبی ہیں۔" ابن عربی کا قول ہے کہ رسول کے پاس صرف ظاہری علم اور شریعت ہوتی ہے جبکہ ولی کے پاس علم شریعت وعلم طریقت دونوں ہوتے ہیں۔ نبوت و رسالت نبی ورسول کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتی ہے جبکہ ولایت اس طرح منقطع نہیں ہوتی۔

(د) شیعہ کے نزدیک امام معصوم ہوتے ہیں۔ یہی دعویٰ صوفیاء کا اولیاء کے متعلق ہے اور ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں اس کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر صوفیاء کسی مرید کے لیے یہ جائز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے شیخ کے کسی فعل پر انگلی اٹھائے خواہ وہ کتنا ہی خلاف شریعت ہو۔

(ھ) شیعہ کے نزدیک زمین کبھی امام سے خالی نہیں ہو سکتی اور صوفیاء کے نزدیک زمانہ کسی ولی کامل کے بغیر نہیں ہوتا۔ اقطاب، اوتاد، ابدال وغیرہ دنیا کا انتظام سنبھالے ہوئے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

(و) شیعہ کا عقیدہ ہے کہ جس شخص نے امام زمانہ کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ صوفیاء کے ہاں یہ عقیدہ اس طرح موجود ہے کہ جو شخص کسی شیخ کی اطاعت کا قلادہ ❸ گردن میں ڈالے بغیر رہے گا اس کا امام شیطان ہوگا، نیز شیخ کے بغیر اللہ کی عبادت ایسے ہی ہے جیسے غبار جو اڑ گیا۔

(ف) شیعہ اور صوفیاء دونوں اپنے اماموں اور شیوخ کو ایک جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔

(م) شیعہ اور صوفیاء دونوں میں حلول اور تناسخ کا دعویٰ پایا جاتا ہے۔ دونوں شریعت کے ظاہر و باطن کو مانتے ہیں،

---

❶ ابوالحسن خرقانی: یہ خرقان (سمنان، ایران) میں 352ھ میں پیدا ہوئے اور 425ھ میں وفات پائی۔

❷ ابن عربی: محی الدین ابن عربی (وفات 638ھ) اندلسی صوفی "شیخ اکبر" کہلائے۔ دمشق میں وفات پائی۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

(محسن فارانی)

❸ قلادہ: پٹا، گلے کا ہار، گلوبند

Marfat.com

دونوں تقیہ سے کام لیتے ہیں۔

(ط) شیعہ اور صوفیاء دونوں اس بات کو مانتے ہیں کہ شریعت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ صوفیاء برملا اپنی کتابوں میں اپنے عشق ومحبت کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ کئی صوفی علانیہ رمضان المبارک کی بے حرمتی کرتے ہیں اور شریعت کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے مراتب اتنے بلند ہو چکے ہوتے ہیں کہ شریعت کی پابندی سے انہیں آزاد کر دیا جاتا ہے۔

ان دلائل کو بیان کرنے میں علامہ صاحب نے نہایت کثرت سے کئی کتابوں سے استشہاد ❶ کیا ہے اور پورے حوالے نقل کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کو ایک مستشرق محقق براؤن کی تحقیق کے اس خلاصے پر ختم کیا ہے کہ:

''شیعیت اور تصوف وہ دو اسلحہ تھے جن سے فارس نے عربوں کے ساتھ جنگ کی۔''

حقیقت یہ ہے کہ تصوف ایک الگ نظام حیات ہے۔ اس کے اپنے اصول اور قواعد ہیں۔ اس کی الگ بنیادیں ہیں۔ اس کو زہد کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ زہد میں ترکِ دنیا نہیں بلکہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ زہد شریعت کے احکام کی فرمانبرداری کی تعلیم دیتا ہے، وہ حرام کاموں میں پڑنا نہیں سکھاتا۔ زہد کتاب وسنت پر مبنی ہے جبکہ تصوف نے نہ جانے کہاں کہاں سے فکر جمع کر کے ایک نئے طرز حیات کی طرح ڈالی ہے جس میں ہر شخص خالق کے اوصاف اپنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کتاب عربی زبان میں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوتا کہ مسلمان ان مفاسد سے آگاہ ہو سکیں جو تصوف میں پائے جاتے ہیں، اور اس راہ سے عوام الناس کی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ امید ہے ادارہ ترجمان السنۃ اس سلسلہ میں کوئی اقدام کرے گا۔

عہد و میثاق

اسلام کی بنیاد عہد الٰہی پر ہے۔ (دلائل النظام: 106)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے عہد لے کر نافرمانی کرنے والوں سے ان کے رشتہ کو ختم کر دیا ہے۔ البتہ ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا حکم دیا ہے۔ (تعلیقات، سورۂ مائدہ)

میثاق الٰہی اتنی بڑی اور اہم چیز ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے ڈرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص عہد و میثاق کو توڑتا ہے تو لعنت کا حق دار بن جاتا ہے۔ (فی ملکوت اللہ: 39)

اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اس سے عہد باندھنے کے سبب سے ہی واجب ہوگئی ہے۔ (تعلیقات، سورۂ مائدہ: 7)

❶ استشہاد: شہادت (گواہی) پیش کرنا، حوالہ دینا

Marfat.com

ضعیف احادیث کی معرفت اور اس کی شرعی حیثیت

اس کتاب کے فاضل مصنف غازی عزیز کا تعلق مبارک پور، اعظم گڑھ (ہند) کے علمی خاندان سے ہے اور وہ فن حدیث پر اپنے مقالات کے باعث علمی حلقوں میں جانے پہچانے ہیں۔ ان کے پیش نظر نکتہ تحقیق یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث کیا ہے؟ اس کی روایت کے اصول کیا ہیں اور اس کے ردوقبول کے بارے میں علماء کے مابین کیا اختلاف ہے؟ اس تحقیق کی خاطر انہوں نے تقریباً پونے دوسو کتب کی مراجعت کی اور اپنی تحقیق زیادہ تر اقتباسات کی صورت میں پیش کی ہے جس سے ہر معاملے میں اہل فن کی آراء سامنے آجاتی ہیں۔ چونکہ کئی مقامات پر اقوال ایک دوسرے سے مختلف یا متناقض بھی ہیں اور ہر جگہ مصنف نے محاکمہ کر کے اپنی رائے نہیں دی اس لیے ایسے مقامات پر قاری شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ان اقوال میں سے کس کو اختیار کرے۔ یہ اختلاف خود ضعیف حدیث کی تعریف میں بھی موجود ہے۔ امام سیوطی کے نزدیک ضعیف حدیث وہ ہے جس میں صحیح اور حسن حدیث کی صفات و شرائط (یعنی سند کا اتصال، راویوں کی عدالت و ضبط، عدم شذوذ ❶، عدم علت وغیرہ) نہ پائی جائیں۔ اہل فن کے نزدیک ایسی حدیث کے طرق کی کثرت بھی پائی جائے تب بھی اس کو صحیح یا حسن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور نہ اس سے کسی چیز کا استحباب ❷ ثابت ہوتا ہے۔ محدثین کی اکثریت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب کسی حدیث کا ضعف بدلائل ثابت ہو جائے تو پھر امور شریعت میں اس پر عمل کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا، خواہ حدیث کا تعلق احکام وعقائد سے ہو یا فضائل اعمال، ترغیب و ترہیب ❸ اور مناقب ❹ وغیرہ سے۔ بعض دوسرے علماء ان کو فضائل اور ترغیب و ترہیب کے مضامین کی حامل ہونے کی صورت میں بشرائط یا بلاشرائط قبول کر لینے کے حق میں ہیں۔ فاضل مصنف کی اپنی رائے، جو بلاشبہ درست ہے، یہ ہے کہ احتیاط و ورع ❺ کا تقاضا یہ ہے کہ تمام ضعیف احادیث سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ جب تک کسی حدیث کی صحت ثابت نہ ہو جائے اس کی نشر و اشاعت اور روایت جائز نہیں ہے اور جو شخص ضعیف حدیث پر عمل کرے وہ کذب علیٰ رسول اللہ کے گناہ میں مبتلا ہے۔

ضعیف احادیث کے بارے میں علماء کی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے متعدد ایسی روایات نقل کی ہیں جو نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع ہیں لیکن علماء ان پر عمل کو مستحب یا سنت قرار دیتے ہیں۔ مصنف نے ان روایات

---

❶ شذوذ: اپنے سے زیادہ ثقہ راوی یا اوسط کی مخالفت میں روایت کرنا۔ عدم شذوذ: زیادہ ثقہ یا جمہور کی مخالفت نہ کرنا

❷ استحباب: کسی چیز کا مستحب (جائز) ہونا ❸ ترہیب: ڈرانا، ہیبت دلانا

❹ مناقب: منقبت کی جمع۔ منقبت: تعریف، نبیؐ، صحابہ یا اہل بیت کی تعریف وثنا ❺ ورع: گناہوں سے بچنا، پرہیز گاری

Marfat.com

کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے اور بدلائل ان کو رد کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فضائل اعمال، ترغیب وترہیب اور یہ احتیاط پسندی کہ کہیں قول رسول غلطی میں چھوٹ نہ جائے وہ چور دروازے ہیں جن کے ذریعے ضعیف روایات دین کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ نہایت دردمندی کے ساتھ کہتے ہیں کہ: ''حق بات تو یہ ہے کہ آج امت کے اندر چہار سو جو انتشار، خرافات، بدعات اور رسوم نظر آتی ہیں ان سب کی مادر ایجاد یہی ضعیف احادیث پر بلاتمیز عمل کی دعوت ہے۔''

فاضل مصنف نے ضمنی طور پر درایت حدیث کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح آٹھویں صدی ہجری میں وضع کی گئی اور اس سے مراد وہ علم ہے جس میں الفاظ حدیث کے معنی ومفہوم پر بحث ہوتی ہے۔ کوئی روایت خواہ اقتضائے طبیعت، قواعد لسانیات، زمانہ کی خصوصیات اور عقلی قرائن کے خلاف ہی کیوں نہ وارد ہو، اگر روایت حدیث کے معیار پر پوری اترتی ہے تو اسے صحیح اور حجت ہی قرار دیا جائے گا۔ فاضل مصنف کا یہ نقطۂ نظر ان محدثین کے نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے جن کا تمام تر اعتماد سند پر ہوتا ہے لیکن اس سے فہم حدیث کی مشکلات حل نہیں ہوتیں۔ ان کو درایت کے مفہوم کی ''نعمانوی تعبیر'' پر اعتراض ہے تو اس کو ترک کر دیں اور ابن الجوزی کے الفاظ میں کل حدیث راية يخالف المعقول، یا علامہ سخاوی کے الفاظ میں یکون مما یدفع الحس والمشاهده، یا ابن قیم کے الفاظ میں مخالفته الحديث لصريح القرآن کی تعبیر کو اختیار کر لیں لیکن نقد متن حدیث کی ضرورت کو سمجھیں۔ یہ چیز علم حدیث کو جلا دینے والی ہوگی، اس کی اہمیت کو کم کرنے والی نہ ہوگی۔

ہمارے نزدیک کتاب ایک اہم موضوع پر لکھی گئی ہے اور نتائج بھی اچھے حاصل کیے گئے ہیں لیکن یہ موضوع تشنہ رہ گیا ہے کہ ضعیف حدیث ہوتی کیا ہے۔ اصطلاحات میں لپٹی ہوئی دو تین تعریفوں سے ایک عام قاری اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکے گا۔ نیز متن کے ضعف کو برداشت کرتے ہوئے امت کو اس انتشار سے نجات نہیں دلائی جاسکتی جس کی طرف فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے۔

عدل واحسان

میرے خیال میں عدل کے معنی ایفاء حق کے ہیں، اور احسان کا مطلب واجب حق سے زیادہ دینا ہے۔ چنانچہ عدل کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اور یہ مقدم ہے۔ یہاں تک کہ کفار کے ساتھ بھی عدل کا حکم دیا گیا ہے اور احسان یہ ہے کہ اپنوں کے ساتھ معاملات اور گفتگو میں نرمی اختیار کی جائے اور فیاضی سے کام لیا جائے۔

توحید، آخرت پر ایمان اور رب کا شکر عدل سے متعلق اُمور ہیں اور شکر سے فکر ونظر کو وسعت ملتی ہے اور احسان کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ احسان کے دائرہ میں صبر، عفو اور بھلائی سے برائی کو دُور کرنے جیسی صفات آتی ہیں۔ سورۂ نحل کی آخری آیتوں کی طرف رجوع کیجیے۔ (حمید الدین فراہی، تعلیقات، سورۂ نحل:90)

Marfat.com

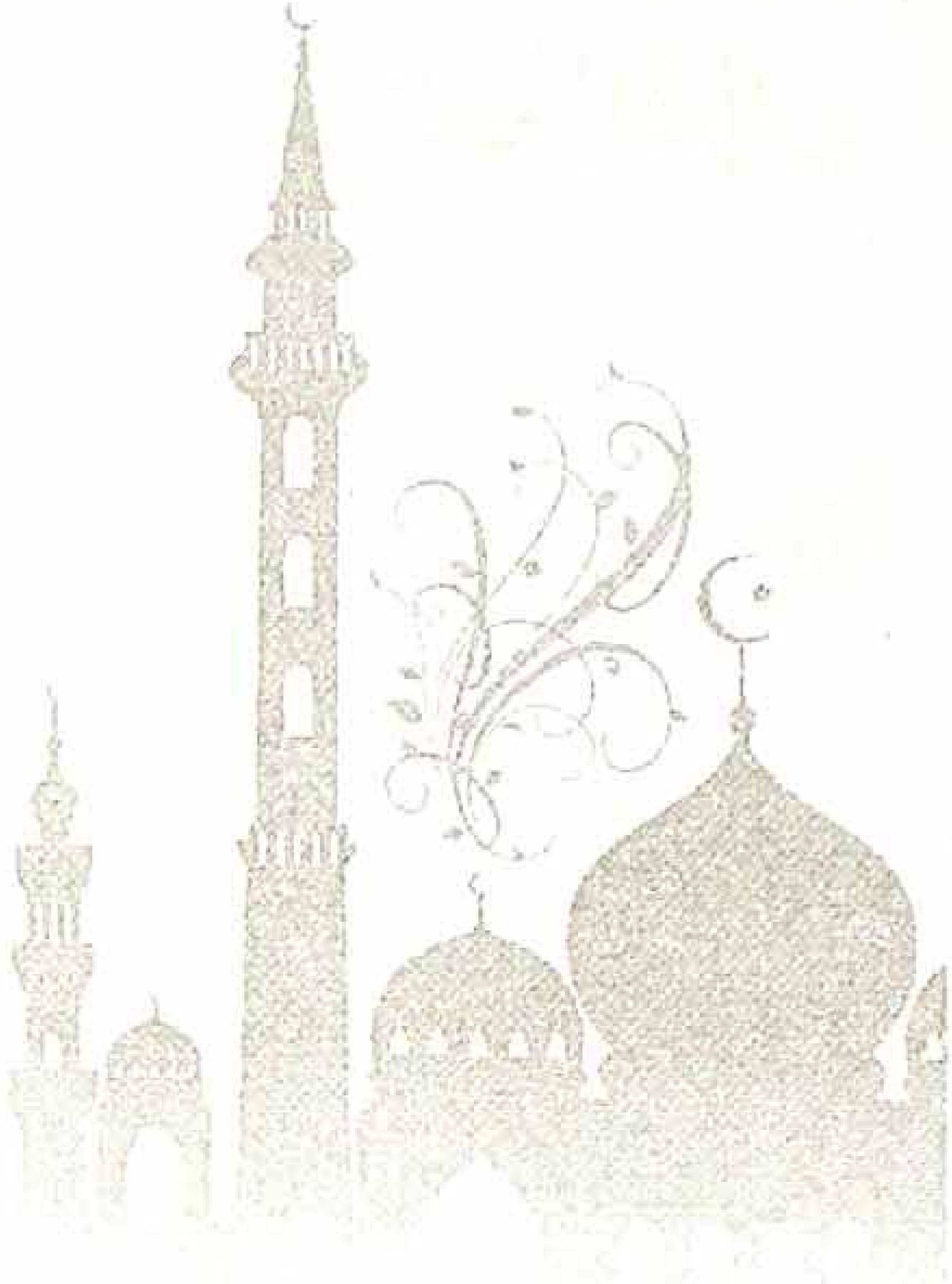

مکاتیبِ خالد

بابِ دوازدہم

- تفسیر تدبرِ القرآن
- مولانا امین احسن اصلاحی
- تدبرِ حدیث
- مسئلۂ رجم
- فکرِ فراہی شرقِ اوسط میں
- استفسارات
- علالت
- احوالِ وطن
- سفرِ حج
- متفرق

Marfat.com

تفسیر تدبرالقرآن

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

مولانا کی تفسیر تدبر قرآن کی کتابت شروع ہوگئی ہے، تقریباً ڈیڑھ سوصفحات لکھے جاچکے ہیں۔آفسٹ پر طباعت ہوگی۔کوشش ہے کہ معیار اچھا رہے۔کاپی کی تصحیح کرتے ہوئے جب میں حروف مقطعات کی بحث پر پہنچا تو دفعۃً مجھے آپ کی دلچسپی یاد آگئی۔مضمون کی یاددہانی کے بعد فی الواقع مجھے یہ تمنا ہوئی کہ کاش اس بحث کو آگے چلایا جائے۔آپ کے ذہن میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر تو ہوگا ہی، خلاصہ ایک مرتبہ پھر کہہ دیتا ہوں تاکہ آپ اپنے فارغ اوقات میں اس موضوع پر غور وفکر کرسکیں۔مولانا عربی کی اصل عبرانی کو مانتے ہیں اور عبرانی کے الفاظ کی تحقیق ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ خالی آواز کے علاوہ چیزوں کو تصور بھی کرتے تھے جس طرح جاپانی وغیرہ زبانوں میں ہے۔الف کا مطلب گائے کا سر، ط کا مطلب سانپ، م موجِ دریا، ن مچھلی، ب بیت وغیرہ لیا جاتا تھا۔قرآن کی جن سورتوں میں مذکورہ الفاظ آئے ہیں ان میں یہ مناسبت موجود ہے۔اس بنیاد پر اگر آپ غور کریں تو قرآن کے حروف مندرجہ ذیل ہوں گے:

ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ھ، ی۔

ان حروف کی تحقیق اگر آپ کرلیں تو سورتوں کے مضامین کے ساتھ ان کی مناسبت ان شاء اللہ دریافت کرلی جائے گی۔خدا کرے آپ کو اس سلسلے میں غیبی امداد میسر آجائے اور آپ علم قرآن کے اس بند دروازے کو وا کرنے کا وسیلہ بنیں۔

(23 جون 1966ء)

☆......☆......☆

بنام:...... صاحبزادہ ابرار احمد بگوی

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کی تفسیر تدبر قرآن ایک منفرد مقام کی حامل تفسیر ہے۔یہ فی الواقع قرآن پر مدتوں تدبر کرنے کے بعد لکھی گئی ہے۔یہ تدبر سورتوں پر ہی نہیں بلکہ مجموعہ ہائے آیات، جملوں، الفاظ، تراکیب، اسالیب، حروف اور اعراب ہر چیز پر کیا گیا ہے جس کا ثبوت تفسیر کا ایک ایک صفحہ پیش کرتا ہے۔آپ کو مطالعے کے دوران کوئی اشکال پیش آئے اور آپ تفسیر تدبر قرآن کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تفسیر نے اس اشکال پر غور کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہوئی ہے۔

تدبر قرآن نے تفسیر کا ایک نیا اسلوب روشناس کرایا ہے۔اس میں نہ تصنع پایا جاتا ہے اور نہ بات بنائی گئی ہے۔

Marfat.com

پڑھتے ہوئے دل گواہی دیتا ہے کہ آیات کی فطری تفسیر وہی ہونی چاہیے تھی جو مولانا نے لکھی ہے۔ صاحب تدبر قرآن کثرت تاویل کے قائل نہیں، وہ ہر جگہ ایک ہی تاویل اختیار کرتے ہیں اور سیاق کلام ❶ کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں اس پر پورا جزم ❷ ہوتا ہے۔

بالعموم تفاسیر میں مصنف کے سیاسی موقف یا عقائد میں کسی خاص مذہب کو دخیل کردیا گیا ہے۔ تدبر قرآن میں یہ بات نہیں بلکہ مولانا اس جستجو میں نظر آتے ہیں کہ قرآن خود کیا کہتا ہے اور کسی معاملے میں اس کا اپنا موقف کیا ہے۔ تفسیر کا انفراد قرآن کو ایک مربوط کلام کے طور پر سمجھنے اور نظائر قرآن پر مبنی استشہاد میں ہے۔ (23 جولائی 1993ء)

☆......☆......☆

مولانا امین احسن اصلاحی

بنام:...... الیاس نعمانی

سرائے میر کے سفر کے تاثرات پر آپ نے جو کچھ لکھا اس سے اس حسن ظن کا اظہار ہوتا ہے جو آپ میری ذات سے رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس کے لائق بنائے۔

مولانا اصلاحی کے نزدیک قرآن مجید کے زمانہ نزول میں صابئین ❸ قلیل تعداد میں موجود تھے۔ ان کی عبادات کی مشابہت ہی کے باعث قریش مسلمانوں کو ان کے طریقہ عبادت کا حامل کہتے۔ گویا یہ فرقہ اپنے وجود سے لوگوں میں معروف تھا، لیکن تعداد میں بے حد کم ہونے کی وجہ سے معدوم کے حکم میں تھا۔ صفحہ 193 کی عبارت میں مولانا اس فرقہ کو دوسرے اہم مذاہب اسلام، یہودیت اور نصرانیت کے بالمقابل غیر معروف قرار دے رہے ہیں۔ سیاق وسباق کے لحاظ سے میرے نزدیک مولانا کی بات میں تضاد نہیں۔

حدیث پر مولانا کے دروس مرتب ہو کر رسالہ تدبر میں چھپ رہے ہیں، لیکن ابھی کتابی شکل میں ان کو لانے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ ❹ ''مبادی تدبر قرآن'' اور ''مبادی تدبر حدیث'' ہندوستان میں شائع نہیں ہوئے۔

امام فراہی رحمہ اللہ کی کتب پر آج کل ہندوستان میں کام تو ہو رہا ہے اور مولانا مرحوم کے پوتے ڈاکٹر عبیداللہ فراہی صاحب اس سلسلہ میں کتابچے شائع کر چکے ہیں۔ مولانا کی کتاب ''حکمت القرآن'' کا ترجمہ بھی مدرسۃ الاصلاح سے شائع ہوا ہے۔ بہرحال یہاں بیٹھے ہوئے سرائے میر کے معاملات پر میرا کیا اختیار ہوسکتا ہے؟

(22 جون 1999ء)

---

❶ سیاق کلام: ربط مضمون، سلسلۂ کلام ❷ جزم: یقین، پختہ ارادہ

❸ صابئین: صابی کی جمع، عراق اور حران (ترکی) میں پایا جانے والا فرقہ جس کے عقائد ستارہ پرستی، یہودیت اور عیسائیت کا مجموعہ تھے۔ ثابت بن قرہ، ابواسحاق، البتانی، ابوجعفر خازن عہد اسلام کے مشہور صابی تھے۔ (محسن فارانی)

❹ حدیث پر مولانا اصلاحی کے دروس شرح بخاری (جلد اول ودوم) اور شرح موطا ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے زیراہتمام شائع ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

بنام:...... پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

آپ کا مکتوب مولانا مدظلہ، کو پیش کر دیا گیا۔ مولانا نے اس کا دوحرفی جواب دیا کہ مولانا نجم الدین صاحب چوں کہ حافظ تھے اس لیے مولانا فراہی رحمۃ اللہ کے درس میں قراءت وہی کرتے تھے۔ وہ شامل درس بھی رہے لیکن مولانا اصلاحی کا احساس یہ ہے کہ انھوں نے درس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا اور اس انداز تفسیر کو سمجھ نہیں پائے۔

مولانا کی جسمانی کمزوری روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اب تو اپنے کمرے یا اس کے سامنے بیٹھنے کی جگہ تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ سیڑھیاں چڑھنا اور باہر نکل کر لان میں بیٹھنا، جوان کا روزمرہ کا معمول تھا، اب ختم ہو چکا ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ ان کے لیے سفر بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ البتہ وہ اپنی مادر علمی اور فکر فراہی کے ساتھ وابستہ ساتھیوں کے لیے برابر دعا گو رہتے ہیں۔

امید ہے سیمینار اکتوبر کے پہلے ہفتے میں منعقد ہو کر کامیاب رہا ہوگا۔ ❶ میں نے اپنی مشکل سے آپ کو بروقت آگاہ کر دیا تھا۔ اس مرتبہ تو عین انہی دنوں حکومت نے سفر بھارت پر پابندی بھی لگا دی جواب تک برقرار ہے۔ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ کبھی بھارت آسکوں اور لوگوں سے ان کے پروگراموں کے بارے میں تبادلہ خیال کرسکوں۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ اس کی کوئی سبیل کب پیدا فرماتا ہے۔ (24 اکتوبر 1994ء)

☆......☆......☆

بنام:...... ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مولانا رحمۃ اللہ کے بارے میں مضمون آپ کو پسند آیا۔ ❷ اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے مفصل سوانح لکھنے کی فرمائش کی ہے اور اس کے لیے مجھے موزوں گردانا ہے۔ دوسرے کئی احباب نے بھی اسی طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن میرے پاس مولانا کی زندگی کے دو ادوار کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں جب کہ وہ دونوں بے حد اہم ہیں۔ ایک 1943ء تک مدرسہ میں قیام کا دور اور دوسرا جماعت اسلامی کا دور۔ اتنے بڑے زمانے کے حالات فراہم کرنا کیسے ممکن ہو، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آپ نے جو خط لکھا وہ جنوری فروری میں لکھا۔ اس کے بعد تدبر کا اصلاحی نمبر شائع ہوا۔ امید ہے ملا ہوگا۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے معلوم نہ ہوسکی۔ اس وقت مکاتیب اصلاحی نمبر تقریباً تیار ہے۔ میرا گمان یہ نہ تھا کہ مولانا کے خطوط بڑی تعداد میں حاصل ہوسکیں گے لیکن عملاً لوگوں نے خاصی دلچسپی لی ہے اور اصلاحی نمبر کی طرح ایک ضخیم شمارہ ان کے لیے مختص کرنا پڑا ہے۔ امید ہے یہ نمبر بھی آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ادھر انڈیا میں علوم القرآن والے اصلاحی نمبر نکالنا چاہتے ہیں۔ نیز شنید ہے کہ مدرسۃ الاصلاح سے ایک ماہنامہ

---

❶ امام فراہی سیمینار مراد ہے۔

❷ رسالہ تدبر کے شمارہ نمبر 58 میں مولانا اصلاحی کے سانحہ ارتحال پر لکھے جانے والے مضمون ''علم وعرفان کے ماہ کامل کا غروب'' کی طرف اشارہ ہے۔

Marfat.com

جاری کرنے کے ارادے ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے لوگوں میں کچھ حرکت پائی جاتی ہے۔ اللہ کریم اس کو مثمر [1] بنائے۔ (26 جولائی 1998ء)

☆......☆......☆

بنام:...... جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ

استاذ گرامی مولانا امین اصلاحی رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات کی اطلاع آپ کو مل چکی ہوگی۔ ہم سب تلامذہ عقیدت مندوں کے لیے یہ سانحہ بے حد صدمہ کا باعث ہے لیکن مولانا مرحوم اپنی زندگی کا ایک لمحہ دین کے لیے بالعموم اور کتاب الٰہی کے لیے بالخصوص جس طرح استعمال کر گئے اور تفسیر لکھ کر جس طرح زندگی جاوید پا گئے، اس میں ہم سب کے لیے بڑا سبق ہے۔

جن لوگوں کو کم یا زیادہ مولانا کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے ان کے پاس یقیناً اس کی یادداشت محفوظ ہوگی اور اگر خط کتابت کا موقع ملا ہے تو مولانا کے علمی مکتوب شاید سنبھالے ہوئے ہوں۔ رسالہ تدبر کی ایک اشاعت اس طرح کے تاثرات، مکاتیب اور مولانا کی علمی خدمت کے لیے خاص کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی طرف میری نگاہ اٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کی یاد میں کچھ وقت صرف کر کے اپنی یادداشتوں کو مرتب کر کے بھیجیں تاکہ قارئین کے سامنے مولانا کی شخصیت کے تمام پہلو آسکیں۔ آخر فروری 1998ء تک آپ کی طرف سے تحریر یا مکاتیب پہنچ جائیں تو عنایت ہوگی۔

(27 دسمبر 1997ء)

☆......☆......☆

بنام:...... ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

آپ کا رجسٹرڈ مکتوب موصول ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کا مفصل مضمون بھی ملا۔ امید ہے اس کی تحریر سے قبل رسالہ تدبر کا وہ شمارہ آپ کو مل چکا ہوگا جس میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی رحلت پر میرا مضمون شامل ہے۔ آپ کے مضمون میں بعض حقائق کی غلطیاں پائی گئی ہیں جن کے باعث گمان ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر تنظیم اسلامی کا حوالہ، میثاق کے اجراء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا حصہ وغیرہ۔ ڈاکٹر اسرار احمد 1966ء میں لاہور آئے۔ اس سے پہلے وہ کراچی میں مطب کرتے تھے۔ چوں کہ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہونے کے ناتے مولانا سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ لاہور آنے کے بعد مولانا سے ملے۔ وہ اپنا رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ اس وقت مولانا کے لیے میثاق پابندی سے نکالنا گھریلو پریشانیوں کے باعث ناممکن ہوگیا تھا لہٰذا انھوں نے رسالہ ڈاکٹر صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ہی ایک اسلامی تنظیم قائم کرنے کی کوشش ہوئی۔ اس کے لیے ایک مجلس مشاورت قائم ہوئی لیکن یہ تجویز نتیجہ خیز نہ ہوئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد فکری طور پر مولانا سے تربیت یافتہ نہیں تھے اس لیے بہت جلد مولانا کو ان کی تحریروں اور پروگراموں سے اختلاف پیدا ہوگیا جس کے باعث ایک طرح سے قطع تعلق

---

[1] مثمر: پھل لانے والا، بار آور

Marfat.com

کی نوبت آگئی۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودہ تنظیم اسلامی سے مولانا کو کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ (21 فروری 1998ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... ڈاکٹر منصور الحمید

غزوات کے سلسلہ مضامین کو آپ قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں نے بھی میری اپروچ کو پسند کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے قرآنی سیرت کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، ان میں انھوں نے اپنے علم کی حد تک قرآنی آیات کو مختلف عنوانوں کے تحت صرف جمع کر دیا ہے۔ سیرت کی قدیم کتابوں میں مصنفین اصل اعتماد روایت پر کرتے ہیں اور آخر میں یہ حوالہ دے دیتے ہیں کہ قرآن میں اس واقعے کا تذکرہ فلاں مقام پر ہے۔ میرے خیال میں روایتی سیرت کو قرآن پر پرکھنا اصل کام ہے جو کسی نے نہیں کیا۔ شاید میرا یہ حقیر کام اس مقصد کے لیے راہ کھول دینے کے باعث بنے۔

جن مقامات پر دھیما انداز اپنانے کی ضرورت نہیں تھی، اگر آپ ان کی نشان دہی فرما دیں تو میں نظر ثانی کر لوں گا۔ کتابی صورت میں لانے سے پہلے اس طرح کی اصلاح لازم ہوگی۔ [1]

مولانا کی صحت بے حد گر گئی تھی۔ اس وقت قدرے بہتر ہے، لیکن ناتوانی اور ضعف کے باعث اٹھنے بیٹھنے سے قاصر ہیں۔ پانی پلانے کے لیے بھی سہارا دے کر بٹھایا جاتا ہے ورنہ ہر وقت دراز ہی رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں پہچان کی صلاحیت ختم ہوگئی تھی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ پہچان رہے ہیں۔ گفتگو بھی ختم ہو چکی۔ کبھی مشکل سے سلام کا جواب دے دیتے ہیں ورنہ بالعموم اپنی دنیا میں ہی رہتے ہیں۔ ہم لوگ کبھی جاتے ہیں تو اب محض زیارت ہی کر پاتے ہیں۔ کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آتی۔ پیشاب کی نالی بدستور لگی ہوئی ہے۔ اس کے اپنے مفاسد ہیں۔ ان کی صحت کے لیے دعا کیا کریں۔

مولانا کا سقراط پر تبصرہ بہت شاندار اور جامع ہے۔ مجھے تو بظاہر اس میں کوئی بات نظر نہیں آئی جو مولانا کی فکر سے ہم آہنگ نہ ہو۔ (9 مئی 1996ء)

☆......☆......☆

تدبرِ حدیث

بنام: ...... ڈاکٹر محمد سلیم

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ رسالہ تدبر کے مضامین کو بڑی توجہ سے اور غور و فکر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مولانا اصلاحی مدظلہ، کے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اب وہ عمر کے جس حصے میں ہیں وہاں نہ کوئی چیز ان کو پڑھائی جاسکتی اور نہ سنائی جاسکتی ہے۔ یہ دروس جو تدبر میں چھاپے جارہے ہیں برسوں پہلے دیے گئے ہیں اور سعید احمد صاحب

---

[1] غزوات کے سلسلہ مضامین اور سیرت پر مقالات کتابی شکل میں ''حیات رسول امی'' کے نام سے شائع ہو گئے۔

Marfat.com

ٹیپ سے اتار کر ان کو شائع کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سے متعلق اشکالات کا حل اب مولانا سے حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

درس شروع کرنے سے قبل مولانا نے تدبر حدیث کے موضوع پر کچھ اصولی باتیں بیان کی تھیں جو اس وقت ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے کتابی صورت میں ملتی ہیں۔ معلوم نہیں یہ کتاب آپ کی نظر سے گزری یا نہیں۔ اس کتاب سے آپ کو روایات کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

آپ نے یہ جو باتیں لکھی ہیں کہ دین مکمل ہو چکا اب اس میں اضافہ کیوں قبول ہوگا، نبی ﷺ کی طرف کوئی جھوٹ کیوں منسوب کرے گا کیونکہ اس کا انجام دوزخ ہے، خواب میں دیا ہوا حکم کوئی کیوں قبول کرے گا وغیرہ، تو یہ اس شخص کے اقوال ہیں جو ان معاملات میں بے حد محتاط ہے۔ بالعموم یہ باتیں درست نہیں ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک عالم دین کے خوابوں کا ذکر اخبارات کی زینت بنا تھا اور ہر طبقے کی طرف سے اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں آنحضرت ﷺ کی تحقیر کا مجرم ٹھہرایا۔ آخر یہ بھی اسی دنیا کے واقعات ہیں اور پڑھے لکھوں کے۔ ان سے بھی تو عبرت حاصل ہونی چاہیے، نیز ہمارے ملک میں ایک بہت بڑی تعداد تو محض کشف پر دین کی بنیاد رکھ دینے کی قائل ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے فرمودات اور زیارت بھی ضروری نہیں۔ کشف کے ذریعے سے نامعلوم کتنی بدعات ہمارے معاشرے میں راہ پا چکی ہیں۔ آخر ان چیزوں کے بارے میں عوامی سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ مولانا کی تحریروں کو آپ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیے۔ دین کو بدلنے اور جھوٹ بولنے سے لوگ اتنا نہیں ڈرتے جتنا آپ ڈر رہے ہیں۔

سند سے مولانا اس لیے بحث نہیں کرتے کہ انھوں نے درس کے لیے جو کتابیں منتخب کیں ان کے متعلق دعویٰ یہ ہے کہ یہ سند کے لحاظ سے سب سے زیادہ عالی مقام ہیں۔ موطا نبی ﷺ سے سب سے زیادہ قریب العہد ہے اور بخاری سند کے لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز، لہٰذا مولانا کو ان کتابوں کے متن سے بحث ہے۔

آپ نے سوچ بچار کی عادت پائی ہے تو میری ان گزارشات پر بھی غور فرمایئے۔ باقی کسی تحریر کے قبول یا ناقبول کا فیصلہ آپ کو خود کرنا ہے۔ (15 جنوری 2001ء)

☆......☆......☆

مسئلۂ رجم

بنام:...... مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ آپ نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنے مطلب کی روایتیں استدلال کے لیے لے لی ہیں جب کہ دوسری صحیح روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ اثبات محض تحصیلِ حاصل ہے کیوں کہ مولانا نے اس حقیقت کو مخفی نہیں رکھا بلکہ تفسیر میں یہ نقطۂ نظر نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ روایات واقعہ رجم میں بڑا تعارض ہے جس سے دو متضاد صورتیں سامنے آتی ہیں۔ مولانا نے اس صورت

Marfat.com

حال میں ایک طرح کی روایات کو اختیار کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ نبی ﷺ نے جو فیصلہ فرمایا وہ ان روایات کو مبنی بر حقیقت قرار دیتا ہے۔ یہ وجہ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو اپیل نہ کرتی ہو لیکن دوسروں کو اپیل کرتی ہے۔ آپ اپنے مضمون میں صرف اس نکتے پر زور دینے کے بجائے نفس مسئلہ پر اگر نئے دلائل پیش فرماتے تو شاید زیادہ مفید ہوتا۔

اسی طرح اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی کہ آخر امام بخاری رحمہ اللہ نے رجم کی روایات کتاب المحاربین ❶ میں کیوں لی ہیں۔ کہیں وہ بھی زنا کے بعض مجرمین کو محاربین کے زمرے میں تو نہیں سمجھتے جس طرح مولانا سمجھتے ہیں۔

میری ناچیز رائے میں مولانا کی رائے کے حق میں دو مزید قرائن موجود ہیں۔ ایک سورہ نور کی آیت 8 میں عذاب پر الف لام (العذاب) جو آیت 2 کی روشنی میں اس عورت کے لیے کوڑوں کی سزا کے لیے ہے، حالاں کہ ایسی عورت محصنہ ❷ تھی۔ اس کے لیے رجم کی سزا بیان ہونی چاہیے تھی اگر رجم کی بنیاد احصان ❸ ہوتی۔ دوسرا قرینہ سورہ نساء کی آیت 25 میں لونڈیوں کے لیے سزا محصنات کی نصف ہونا ہے۔ رجم کا نصف کیا ہوگا؟ اگر محصنات کو غیر شادی شدہ شریف زادیوں کے معنی میں لیجیے تو شادی شدہ لونڈی کا اس سے تقابل سمجھ میں نہیں آتا۔ مزید برآں اگر تقتیل ❹ کے معنی میں رجم نہیں آتا تو کیا یہ کہنا مقصود ہے کہ رجم کی بنیاد موجود قرآن میں نہیں ہے، صرف سنت سے ثابت ہے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ مولانا نے رجم کی سنت کو قرآن سے ماخوذ ثابت کر دیا تھا لیکن ان کے معترضین کو یہ ناگوار ہے۔ شاید وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ اس کا وجود وہ الشیخ والشیخہ والی روایت ہی سے ثابت کریں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔

مولانا! ہم طالب علم لوگ ہیں اور کسی مدرسے میں نہ پڑھنے کے باعث ہماری وابستگی کسی کے ساتھ جذباتی طور پر نہیں ہے۔ اپنے علم کی حد تک غور کرتے ہیں اور اپنی رائے قائم کرتے ہیں کہ علماء کے باہمی مباحث میں دلیل کس کے ساتھ ہے۔ مولانا اصلاحی سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ہماری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ مولانا اپنے استادوں سے بعض امور میں مختلف رائے رکھتے ہیں اور اس کے ان کے پاس دلائل ہیں۔ ہم بھی مولانا سے سنتے ہیں تو ان کی بات کو پیر جی کی بات نہیں سمجھتے بلکہ ان کی دلیل سنتے ہیں۔ میں اپنی حد تک تو سمجھتا ہوں کہ جہاں مولانا کی کسی دلیل کا وزن سمجھ میں نہیں آتا تو میں اس رائے کو اختیار کرنے میں توقف کرتا ہوں اور کہیں الگ رائے بھی قائم کرتا ہوں۔ ہاں میں ہاں ملانا جائز نہیں سمجھتا۔ اس کا عملی ثبوت تدبر کے تازہ شمارہ میں بھی آپ کو مل جائے گا۔

منکرین حدیث سے زخم کھانے کے بعد علماء کرام کی احتیاط سمجھ میں آتی ہے، لیکن مولانا اصلاحی کو اٹھتے ہی ان کی صف میں شامل کر دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں۔ ان لوگوں کا موقف بدنیتی پر مبنی ہے جب کہ مولانا کے جہاں اعتراضات ہوتے ہیں، ان کی بنیاد علم پر ہوتی ہے۔ علمی اشکالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اصل حقیقت تک پہنچنے کی راہ مسدود کر

---

❶ کتاب المحاربین: محاربین (اہل اسلام سے جنگ کرنے والوں) کے بارے میں احادیث پر مشتمل کتاب

❷ محصنہ: شادی شدہ عورت ❸ احصان: شادی شدہ ہونا، پاک دامن ہونا

❹ تقتیل: بری طرح قتل کرنا، صورت بگاڑ دینا

Marfat.com

دینے کے مترادف ہے۔ رسالہ تدبر میں تحقیق عمر عائشہ کا جو تذکرہ کیا گیا یا حالیہ شمارہ میں روایت افک پر جو اشکالات بتائے گئے ہیں کیا ان سے محض یہ کہہ کر جان چھڑائی جا سکتی ہے کہ حکیم نیاز احمد نے منکرین حدیث کی ہمنوائی کر دی ہے؟

امید ہے مزاج گرامی اب بخیر ہوں گے۔ اللہ کریم آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ تا دیر رکھے کہ ہم آپ کے علوم والطاف سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔ ناچیز کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے گا۔ (25 اگست 1984ء)

☆......☆......☆

فکرِ فراہی شرقِ اوسط میں

بنام:...... ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

گرامی نامہ موصول ہوا اور اس کے ساتھ مفردات القرآن بھی نظر نواز ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی میں برکت دے۔ آپ کے ہاتھوں بہت عمدہ کام انجام پا رہے ہیں۔ اوپر نیچے امام فراہی رحمہ اللہ کی کتب نہایت دیدہ زیب چھپی ہیں اور ان میں آپ کی محنت، جو حواشی اور تعلیقات ❶ کی صورت میں ہے، اپنے منہ خود بول رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور آپ سے اس طرح کی مزید خدمات لے۔

یہ خبر نہایت باعث مسرت ہوئی ہے کہ آپ کی علمی خدمات کی پذیرائی مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ہوئی ہے اور اعلیٰ سطح پر اس کو سراہا گیا ہے۔ میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

رسالہ تدبر سہ ماہی وقفہ کے ساتھ آپ کو برابر بھیجا جاتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ 11 ستمبر کے واقعے کے بعد سعودی حکومت نے دینی جرائد پر کوئی پابندی لگا رکھی ہے کیوں کہ دمام میں جن دوستوں کو رسالہ جاتا ہے انھوں نے بھی اس کے نہ ملنے کا شکوہ کیا ہے۔

مولانا منظور نعمانی کے خطوط شائد محفوظ نہیں رہے۔ وہ اس زمانے میں آتے رہے جب مولانا رحمٰن آباد چلے گئے تھے۔ میرے علم میں جو کاغذات آئے ان میں صرف ایک مکتوب شامل تھا جس میں تکمیل تدبر قرآن کے سلسلے میں اپنے خواب کا انھوں نے ذکر کیا تھا۔ اس مکتوب کا اقتباس میں نے اپنے مضمون میں چھاپ دیا تھا۔

حسان عارف نے کئی سال قبل اردو ڈائجسٹ کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ آج کل لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں سٹور آفیسر کا کام کر رہا ہے۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے رفقا بخیر ہیں۔ میری صحت اتار چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ مجھے ہیپاٹائٹس سی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے ❷ اور مرض مزمن ❸ ہے۔ دو سال قبل مفصل ٹیسٹوں کے بعد اس کا پتہ چلا اور تب سے اس کا علاج ہو رہا ہے۔ تین مرتبہ اسی کی پیچیدگیوں کے

❶ تعلیقات: تعلیقہ (حاشیہ) کی جمع، حواشی

❷ علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ "ہیپاٹائٹس سی" کے عارضہ سے مقابلہ کرتے رہے اور آخر کار یکم اکتوبر 2003ء کو اس بیماری کے ہاتھوں ہار گئے۔

❸ مزمن: پرانا، دیرینہ

Marfat.com

باعث ہسپتال میں داخل ہو کر علاج کروانا پڑا۔ ان پیچیدگیوں نے بے حد نقاہت پیدا کر دی ہے۔ کبھی کبھی تو مسجد تک آنا جانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ تیسری مرتبہ کا ہسپتال میں آٹھ دن کا قیام تو اڑھائی ماہ قبل رہا۔ دعا فرمائیں اللہ کریم صحت کامل عطا فرمائے۔ (22 رمضان المبارک 1423ھ)

☆......☆......☆

اِستفسارات

بنام:...... اکرم رضا

بیشتر خواب جو ہم آپ دیکھتے ہیں وہ ہمارے اپنے خیالات ہی کا عکس ہوتے ہیں۔ فی الجملہ اچھے خواب سے اچھا شگون اور برے خواب سے برا شگون لینا چاہیے۔ البتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام اور بشارت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ وحی کے قبیل سے ہوتے ہیں۔

ارواح اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ دنیا کی زندگی کے بعد ان کو عالم برزخ میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں نیک ارواح کے لیے بشارت اور بد ارواح کے لیے برے انجام کے آثار موجود ہوتے ہیں۔ قیامت میں ان ارواح کو محاسبہ کے لیے اٹھایا جائے گا۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس گواہی کا ذکر ہے جو وہ اپنی امت کے اعمال کے سلسلے میں قیامت کے روز دیں گے۔ وہ برملا کہیں گے کہ جب تک میں لوگوں میں موجود رہا میں نے ان کو فلاں فلاں تعلیم دی۔ جب تو نے مجھے بلا لیا تو پھر جو کچھ یہ کرتے رہے اس کا علم مجھے نہیں، تو خود ان کا نگہبان تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ظاہر و باطن کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے جو سمیع و بصیر و علیم ہے۔ کوئی دوسرا، خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، خدا کی اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتا۔

قرآن نے مرنے کے بعد عالم برزخ کی حیات کا تصور دیا ہے جو ظاہر ہے اس دنیا کی حیات کی طرح نہیں ہے۔

امید ہے یہ اشارات آپ کے سوالوں کے جواب میں کفایت کریں گے۔ (28 ستمبر 1991ء)

☆......☆......☆

بنام:...... الیاس نعمانی

اصحاب کہف کا واقعہ مفصل سنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلائی ہے کہ اپنے سوال کا مفصل جواب پا کر بھی آپ کے معترضین خاموش نہیں رہیں گے بلکہ اصحاب کہف کی تعداد اور مدت قیام کے بارے میں بحث اٹھائیں گے۔ اس ضمن میں جب آنحضرت کو یہ ہدایت دی کہ وہ بحث و مناظرہ میں نہ الجھیں، وہیں لا تقولن لشیء...... کی ہدایت بھی دے دی کہ آپ وحی آنے کے اعتماد پر کوئی وعدہ نہ کیا کریں۔ وحی کا نزول اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تابع ہے۔ اس طرح تمام ہدایات یکجا ہو گئیں اور اس کے بعد سلسلہ کلام کی تکمیل کر دی۔ اس طرح سلسلہ کلام کو توڑ کر بات کرنے کی دوسری مثالیں بھی ہیں مثلاً سورہ قیامہ میں لا تحرك بہ لسانك لتعجل بہ...... سورہ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کے بیچ میں مما خطیئاتھم...... کی آیت۔

قرائن اس بات کے موجود ہیں کہ اصحاب کہف والا سوال بطور امتحان اہل کتاب کی طرف سے اٹھایا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے اعتماد پر اگلے دن اس کا جواب دینے کا وعدہ کر لیا۔ آئندہ اس طرز عمل کو روکنے کے لیے مذکورہ

Marfat.com

ہدایت آئی لیکن اسے الگ سے ممیز کرنے کے بجائے بحث ومناظرہ کے سلسلہ کی ہدایات ہی کا حصہ بنا دیا گیا۔ یہ ہدایات اتنی لازمی تھیں کہ ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بات کی تکمیل سے قبل ان ہدایات کی تکمیل کرنا ضروری ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (11 مئی 1999ء)

☆......☆......☆

بنام:...... اصغر حبیب

آپ کا گرامی نامہ مولانا اصلاحی کو ملا۔ وہ اپنی کبر سنی اور نقاہت کے باعث خود جواب لکھنے سے معذور ہیں۔ انھوں نے جواب کے لیے مجھے حکم دیا ہے:

❀...... مولانا قرآن مجید میں نزول مسیح علیہ السلام کی کوئی دلیل نہیں پاتے۔ جن آیات سے لوگوں نے استدلال کیا ہے مولانا کے نزدیک ان کا مفہوم بالکل دوسرا ہے جو تدبر قرآن تفسیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حدیثوں میں جہاں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا ہے وہاں مولانا کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح علیہ السلام کے مماثل کسی مسلمان خلیفہ کی خبر دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی صحابہ کو انبیاء بنی اسرائیل کے مشابہ ٹھہرایا ہے۔

❀...... مولانا کے نزدیک لفظ امی اہل کتاب کے مقابل میں عربوں یعنی بنی اسماعیل کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اہل کتاب صحف آسمانی سے واقف تھے جب کہ بنی اسماعیل اپنے آپ کو اس رہنمائی سے بے بہرہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو امی یعنی ''کتاب کے علم سے بے بہرہ'' کہتے، حالاں کہ قریش کے اندر لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی کمی نہ تھی، بہر حال نبی معلم کے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے رہے ہوں۔

❀...... قرآن مجید کی تشریح خود قرآن کی روشنی میں کرنا ممکن ہے لیکن بعض چیزیں تقاضا کرتی ہیں کہ قرآن کے خارج سے بھی رہنمائی لی جائے۔ مثال کے طور پر نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے لیکن ان کی تفصیلی کیفیت اس میں نہیں، اس کے لیے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کرنا لازم ہے۔ اگر کوئی شخص صرف قرآن سے ان کا مفہوم متعین کرنا چاہے گا تو اس میں کامیاب نہ ہوگا۔ مولانا نے اپنی تفسیر تدبر قرآن کی پہلی جلد کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تفسیر کے خارجی وسائل پر مفصل لکھا ہے۔ آپ اس کو وہاں پڑھیں۔ ان مضامین کو خط کی صورت میں لکھنا آسان کام نہیں۔ (22 جون 1991)

☆......☆......☆

بنام:...... ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی

نوازش نامہ موصول ہو کر باعث مسرت ہوا کہ کچھ لوگ رسالہ تدبر کے حوالے سے ہماری محنت کے قدر دان موجود ہیں اور اس کے مندرجات کو غور سے پڑھتے ہیں۔ صدر اول کی تاریخ والے مضمون کی مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی [1] نے بھی تحسین کی ہے۔

---

[1] مولانا منظور نعمانی کے صاحبزادے۔

Marfat.com

آپ کا اشکال مولانا مدظلہ کے سامنے پیش کیا۔ مولانا اب عمر کے جس مرحلے میں ہیں اس میں ان کے لیے کچھ پڑھنا اور غور کر کے رائے دینا سخت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں جو کچھ وہ درس میں بیان فرما دیں۔ ان کے ثقل سماعت کے باعث ان سے کمیونی کیشن تقریباً ناممکن ہے۔

آپ کے سوالات کو سرسری دیکھ کر انھوں نے یہ فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیت المال کی امانت خلیفہ کے بیٹوں کے حوالے کرتے وقت یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اس سے تجارت کر سکتے ہیں اور اصل رقم بیت المال میں پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اگر اسی کے مطابق عمل کرتے تو اس میں قباحت نہ تھی لیکن وہ اس مزاج کے آدمی تھے کہ اپنے یا اپنے خاندان کے افراد کے لیے کوئی جائز مراعات حاصل کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی اور کئی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے اپنے خاندان کو محروم رکھنا ہی مناسب سمجھا، لہٰذا ان کے اس طرح کے فیصلوں کو شرعی حکم کے استخراج کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ یوں بھی روایت ایک اثر ہی ہے، حدیث نہیں۔

مولانا کے نزدیک تجارت میں امانت کا مال بشرائط ہی سہی، لگایا تو جاسکتا ہے۔ اس واقعے میں خود گورنر صاحب کی اجازت موجود تھی، اس لیے اس میں کوئی قباحت نہ تھی۔ مولانا کی وضاحت سے معاملے کا قرض ہونا تو ظاہر نہیں ہوتا۔

مولانا کی یہ وضاحت چوں کہ آپ کے سوالات کا بالاستیعاب ❶ جواب نہیں ہے، اس لیے ہوسکتا ہے تشفی بخش نہ ہو۔ لیکن، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسی پر قناعت کرنا ہوگی۔ (21 نومبر 1992ء)

☆......☆......☆

بنام:...... ڈاکٹر محمد سلیم الدین

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے میری بعض باتوں سے اتفاق کیا، لیکن یہ آپ کی بلند حوصلگی ہے کہ آپ مجھے یہ کریڈٹ دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھ رہا ہوں کہ آپ نے اس مسئلے میں بڑی محتاط رائے قائم کر رکھی ہے جس سے خواہ مخواہ کوئی کیوں اختلاف کرے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ عام لوگ اس بارے میں اتنے حساس ہیں کہ وہ ان احتیاطوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے، مثلاً وہ خالی بشارت ہی حاصل نہیں کرتے، حکم بھی حاصل کر لیتے ہیں اور اس کو اپنے عمل کی بنیاد بھی بنا لیتے ہیں۔ ایسا کرنا بے حد خطرناک ہے۔

جہاں تک ایک عالم دین کے خوابوں کا تعلق ہے میں نے اس کا حوالہ محض اس لیے دیا تھا کہ خواب پر مبنی بیانات کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی ذاتی رائے نہیں لکھی تھی۔ ان خوابوں پر عام طور پر پائی جانے والی حیرت کا حوالہ دیا تھا یا پھر بعض لوگوں کی اس رائے کا کہ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر ہوئی ہے۔ یہ دوسرے لوگوں کی رائے تھی۔ آپ کی رائے حسن ظن پر بھی ہوسکتی ہے۔ میں نے اپنی کوئی رائے اس لیے نہیں دی کہ مجھے اس مسئلے سے متعلق تمام تفصیلات پڑھنے یا سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔

مولانا اصلاحی مدظلہ کا یہ موقف بالکل نہیں ہے کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں نہیں دیکھ سکتا۔

---

❶ بالاستیعاب: اوّل سے آخر تک مسلسل اور اچھی طرح پڑھ کر، فہم و ادراک کے ساتھ۔

Marfat.com

زیر بحث حدیث کی وضاحت کرتے وقت انھوں نے زیادہ زور ان خطرات پر دیا ہے جو اس مسئلے میں پیش آسکتے ہیں۔ خواب میں دیکھنے یا نہ دیکھنے کو موضوع بحث نہیں بنایا۔ چوں کہ رسالہ تدبر میں ان کا درس مدون کر کے چھاپا جاتا ہے اس لیے درس کے خلا باقی رہ سکتے ہیں۔ کسی بھی مسئلے کا ہمہ جہتی جائزہ کوئی شخص اس وقت لیتا ہے جب وہ اس پر جامع و مانع بحث کر رہا ہو۔ ان دروس کی یہ حیثیت یقیناً نہیں ہے۔ (7 جولائی 1995ء)

☆......☆......☆

بنام:...... پروفیسر خالد شریف

میرے نزدیک تفسیر حقانی کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا معلمانہ انداز بیان ہے۔ مقدمہ میں سیر حاصل بحث ہے جس میں علم تفسیر کے کئی اطراف کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ پھر جملوں کی ترکیب نحوی مسلسل دی گئی ہے تاکہ قارئین اولاً کلام کا دروبست سمجھ لیں اور پھر مضمون کی طرف متوجہ ہوں۔ تفسیر کرتے ہوئے گزشتہ مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس سے ربط کلام قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ مزید برآں جس طرح ایک اچھا معلم شاگردوں کے لیے سوال قائم کرتا ہے تاکہ ان میں غور وفکر کی صلاحیت بیدار ہو، اسی طرح اس تفسیر میں بھی سوالات قائم کر کے ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔

ہمارے اہل دین بالعموم صرف اپنی کتب تفسیر پر نظر رکھتے ہیں۔ اس سے باہر ان کی واقفیت بہت کم ہوتی ہے۔ تفسیر حقانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نے مستشرقین کو بھی پڑھا ہے اور ان کے نظریات اور دلائل سے واقف ہو کر اسلام اور قرآن پر ان کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جا بجا ان کے حوالے نظر آتے ہیں۔ یہ جدیدیت ان عنوانوں میں بھی نظر آتی ہے جن پر اثنائے تفسیر میں مصنف نے مفصل مضامین لکھے ہیں۔ انھوں نے قدیم وجدید تمام حوالوں کی مدد سے یہ مضامین لکھے ہیں اور خاصے وقیع ہیں۔

(3 مئی 1993ء)

☆......☆......☆

علالت

بنام:...... ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

آپ کا نوازش نامہ اس وقت موصول ہوا جب آپ کی طرح میں بھی ایک خطرناک آپریشن کے نتیجے میں بحالی صحت کا منتظر تھا۔ مجھے تین سال قبل عارضہ قلب لاحق ہو گیا تھا۔ اس تکلیف کا علاج ادویہ کے ذریعے کرایا لیکن بیماری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ بازار اور مسجد تک چلنا دشوار ہو گیا۔ ادارہ امراض قلب میں گیا تو انھوں نے فوری آپریشن تجویز کیا، چناں چہ وسط مئی میں داخل ہوا۔ وہاں بائی پاس آپریشن ہوا۔ الحمد للہ آپریشن کامیاب رہا اور کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ دو ماہ گھر پر آرام کرنے کے بعد اب اپنے کاموں کی طرف پھر سے متوجہ ہوا ہوں، اگر چہ مشقت کے کاموں پر ابھی تک پابندیاں ہیں۔

Marfat.com

امید ہے آپ کی صحت اب بحال ہوگئی ہوگی۔ پہلے آپ نے بچے کی تکلیف دیکھی اور اب خود بیمار ہوگئے۔ صحت، بیماری اور شفا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر شخص کو خود ہی اپنی امان میں رکھے ورنہ بندہ تو نہایت کمزور ہے۔

مولانا مدظلہ نے، جیسا کہ تدبر کے حالیہ شمارہ سے معلوم ہو چکا ہوگا، سلسلہ درس سے اب معذرت کر لی ہے۔ ضعف پیری اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ بیشتر اپنے کمرے ہی میں رہتے ہیں اور اٹھنے، چلنے سے ڈر لگتا ہے کہ گر نہ جائیں۔ شام کے وقت ذرا سی دیر کے لیے باہر نکل کر لان میں بیٹھتے ہیں اور بس۔ دیکھا ہے کہ طبیعت میں نشاط نہ ہونے کے باعث اب وہ ملنے والوں سے زیادہ کلام بھی نہیں کرتے۔ بالعموم خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

میں نے مقالات اصلاحی کا حصہ دوم مکمل کرلیا ہے جو اب کمپوزنگ کے مراحل میں ہے۔ اس میں شخصیات کے بارے میں مولانا کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ تلاش بسیار کے باوجود مجھے یہاں کسی کے پاس عنایت اللہ سبحانی صاحب کی کتاب مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب پر نہیں مل سکی۔ میں نے اس میں سے مولانا کا نوٹ لینا تھا۔ آپ کے پاس یہ کتاب یقیناً موجود ہوگی۔ اگر کتاب عطا کرنا ممکن نہ ہو تو اس میں سے مولانا کے نوٹ کی فوٹو کاپی جلد ارسال فرمائیں۔ نوازش ہوگی!

(23 جولائی 1993ء)

☆......☆......☆

احوالِ وطن

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

عیدالفطر کے موقع پر آپ نے یاد فرمایا تھا۔ اس کا شکریہ۔ میں نے بھی ایک عید کارڈ تیار کیا ہوا تھا، لیکن اسے حوالہ ڈاک کرنے میں تاخیر ہوگئی۔ پھر سوچا چلو اب خط لکھیں گے اور کئی مہینے گزر گئے!

ہمارے یہاں کے حالات سے تو آپ باخبر ہوں گے ہی۔ تاریخ بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ بنگلہ دیش بڑی چابک دستی سے تسلیم ہوگیا۔ اب برعظیم ❶ کے ممالک میں معمول کے حالات پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ حکومت نہایت مضبوطی سے اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ ملک کے اندر کوئی مخالف آواز نہیں ہے۔ جماعت نے اپنے حالیہ اجتماع میں کچھ قراردادیں منظور کی ہیں، لیکن جماعت کبھی وجہ تشویش نہیں بنتی۔ اس لیے ان کی اہمیت صرف علمی و نظریاتی ہے۔ اصغر خان بولتے ہیں، لیکن پریس ان کے ساتھ نہیں اس لیے ایک کالمی خبر بھی ان کے بارے میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

سنا ہے آپ کے ہاں مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں تو اس نے ہمیشہ کے ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ زندگی بہت مشکل ہوگئی ہے۔ خیر سے سوشلسٹ معیشت نے معاشی بحران پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ مزدوروں کے مسائل بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ پیداواریت (Productivity) بالکل پست ہے۔ سرمایہ کاری مفقود ہے۔ پبلک خطرہ

---

❶ برعظیم: برصغیر پاک و ہند (Subcontinent)، جنوبی ایشیا

Marfat.com

محسوس کرتے ہوئے پیسہ لگانے سے اجتناب کر رہی ہے۔ افراط زر پیدا کر دیا گیا ہے جس کا باعث سوشلسٹ وزیر خزانہ کی پالیسیاں ہیں۔

مولانا اصلاحی بخیریت ہیں اور تفسیر میں مشغول ہیں۔ تدبر قرآن کی جلد سوم بازار میں آگئی ہے اور چہارم (جو سورہ کہف سے شروع ہوگی) میثاق میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ مولانا سورہ عنکبوت میں کام کر رہے ہیں۔

(9 اپریل 1974ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

نوازش نامہ موصول ہوا۔ شہزاد کی درد بھری روداد سے بہت صدمہ ہوا۔ ❶ عورتوں کے بارے میں عام تاثر تو یہ ہے کہ وہ ماحول اور حالات کے ساتھ سازگاری کرنے میں بہت طاق ہوتی ہیں لیکن مغربی تہذیب نے جو آزادی فکر پھیلائی ہے اس کے باعث ممکن ہے یہ تاثر مغربی عورتوں کے بارے میں صحیح نہ ہو۔ معلوم نہیں کیا اسباب ہوئے جن کے تحت نوبت علیحدگی تک پہنچی ہے۔ خدا کرے اس گھرانے کا سکون لوٹ آئے اور دلوں کی کدورت زائل ہو جائے۔ شہزاد تو پہلے ہی بہت حساس ہیں اور ایسے مواقع پر ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ میرے وہاں زمانہ قیام میں بھی ان پر اس طرح کا ایک دورہ پڑا تھا۔ اب کے خدا انھیں ہمت وحوصلہ عطا کرے اور پریشانی سے نجات دے۔

یہاں کے حالات سے آپ مطلع ہوتے رہتے ہوں گے۔ آج کل یہ قیاس آرائی عام ہے کہ جنرل الیکشن 1977ء کے ابتدائی مہینوں میں ہونے والے ہیں۔ وزرا کے دورے خوب زوروں پر ہیں جن سے انتخابی مہم کا تاثر ملتا ہے لیکن اپوزیشن کو ابھی تک جلسے کرنے کی اجازت نہیں۔ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر ہوگئے ہیں اور عوام الناس میں بھارتی پروپیگنڈے کے نتیجے میں واقعی یہ احساس بھی پیدا ہو چلا ہے کہ برصغیر میں دو حکومتوں کی کیا ضرورت تھی اور تقسیم کیوں ہوئی۔ نوعمر طبقہ اس تاثر کا برملا اظہار کرتا ہے۔

آپ نے اپنی کسی علمی سرگرمی کا تذکرہ نہیں کیا، شائد خاموشی ہی ہوگی۔ تدبر قرآن کی چوتھی جلد چھپ گئی ہے۔ یہ بیسویں پارے تک ہے۔ پانچویں زیر کتابت ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تنظیم اسلامی کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے جس میں سو سے کچھ کم ممبر ہیں۔ ان کے درسوں کا انتظام بہت زوروں پر ہے لیکن ادھر مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تعلقات کچھ کشیدہ ہوگئے ہیں جس کی وجہ ان کے بعض امور سے مولانا کا علمی اختلاف ہے۔ مولانا اس وقت سورہ محمد میں پہنچے ہوئے ہیں۔

(6 اگست 1976ء)

☆......☆......☆

---

❶ خالد بھائی کے دوست شہزاد احمد نے ایک رومانوی خاتون سے شادی کی تھی لیکن یہ کامیاب نہ ہوسکی اور آخر کار طلاق ہوگئی۔ درد بھری روداد کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (عبدالرشید صدیقی)

Marfat.com

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

نوازش نامہ ملا۔ آپ کی ترقی درجات سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور مزید ترقیاں عطا کرے۔ امید ہے اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت میں تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگیا ہوگا۔ آپ نے یہاں کے بارے میں پوچھا ہے کہ ان چیزوں کی کوئی قدر ہے یا نہیں تو عرض یہ ہے کہ یہاں کی مطلوبہ کوالی فکیشن کچھ مختلف ہوا کرتی ہے اور وہ موقع بموقع ہی طے ہوتی ہے۔ مجھے ایم ایس سی کے زمانے کا ایک واقعہ بالکل نہیں بھولتا۔ اس وقت ہمارے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کریم اللہ تھے جن کی نشو ونما ایک غریب زمین دار گھرانے میں ہوئی تھی۔ میں اور میرا ایک دوست ان سے ایک مشورہ لینے گئے۔ وہ کسی خط کتابت کورسز (Correspondence Coures) کی افادیت کے بارے میں تھا۔ ہم اسے شروع کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: عزیزو! ان چیزوں میں کچھ رکھا نہیں ہے۔ اس دور میں کام آنے والی چیزیں بس دو ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہو۔ لیکن اگر سوئ اتفاق سے اس نے کسی غریب گھرانے میں جنم لے لیا ہو تو دوسری چیز یہ ہے کہ بڑے گھرانے میں شادی کرے۔ اگر یہ بھی اس کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر دال دلیہ کھا کر محنت مزدوری سے جو کچھ میسر ہو اسی پر خوش رہنا چاہیے۔ کسی ڈگری ڈپلوما سے فائدہ نہیں۔ اپنے تجربے میں تو یہی بات آئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا نکتہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لیے آپ سے بھی یہی کہوں گا کہ کسی بڑے گھرانے میں شادی کرائیے، پھر آپ کی ضرور قدر ہوگی...... اور ہاں اب شادی کے متعلق بھی کبھی کبھی سوچ لیا کیجیے۔ ہر کام کے کرنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کا صحیح وقت آپ گزار ہی دیں۔

خوشی ہوئی کہ حروف مقطعات کی بحث آخری مرحلے میں ہے۔ لیسٹر میں کیا کوئی سکول آف اورینٹل لرننگ نہیں ہے۔ وہاں کے کسی استاد عربی سے تبادلہ خیال کیجیے کیوں کہ ان حروف کا استعمال خالی قرآن ہی نے نہیں کیا بلکہ جاہلی خطبا نے بھی کیا ہے۔ اس بارے میں ان اساتذہ فن کی رائے کیا ہے۔ سورتوں کے ساتھ مناسبت کے معاملے میں شاید میری کچھ تعلیقات آپ کے مضمون پر مفید رہیں۔

میں نے اپنے طور پر ایک حلقہ تدبر قرآن تشکیل کیا ہے جس میں چھ سات نوجوان حصہ لے رہے ہیں۔ ابتدا عربی قواعد سے کی ہے اور اس کے بعد قرآن کا مطالعہ فراہی طریقہ کے مطابق شروع کیا ہے۔ دعا کریں کچھ لوگوں میں شوق پیدا کرنے میں (یا بقول مولانا اصلاحی روگ لگانے میں) کامیاب ہو جاؤں۔ ہماری قوم کے جدید رجحانات بڑے ہی افسوس ناک ہیں۔ اونچا طبقہ (جو حکومت کا مشیر بھی ہے) پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ سرگرم ہے اور دین اور اہل دین کا عمل دخل ختم کرنے کے درپے ہے۔ یہ لوگ آج کل ایسی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جس کے استعمال کی پہلے انھیں کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ عوام کا یہ حال ہے کہ لوگ جیسے اپنی اولادوں کی کوئی ذمے داری محسوس ہی نہیں کر رہے ہیں۔ نوجوانوں کے اندر متانت اور احساس ذمے داری کا زبردست فقدان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر رحم فرمائے۔

علماء ابھی تک رویت ہلال کو نہ ماننے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ کل چند علماء کا وفد اس بارے میں صدر صاحب

Marfat.com

سے ملنے گیا جس میں مولانا اصلاحی بھی شامل تھے۔ دیکھیں ملاقات کا کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ (2 فروری 1967ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... عبدالرشید صدیقی

اب کی مرتبہ خط لکھنے میں بہت تاخیر ہوگئی ہے جو خلاف معمول ہے۔ آپ بھی معلوم ہوتا ہے اتنے مصروف ہیں کہ چند سطر لکھنے کا وقت نہیں نکال سکے۔ آپ کا آخری عنایت نامہ ملے چوں کہ عرصہ ہو چکا ہے، اس لیے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ سلسلہ کلام کہاں ٹوٹا تھا۔ میری طرف سے تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ دسمبر میں میں نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور گھر چلا گیا۔ واپس آیا تو محکمے کی طرف سے حکم نامہ ملا کہ سیمنٹ اور سیمنٹ کا سامان بنانے والی تمام فرموں کا دورہ کرو اور ان کے متعلق سروے رپورٹ لکھو۔ یہ کام خاصا طویل تھا۔ جنوری سے اپریل تک سفر میں رہا اور پشاور سے کراچی تک متعدد شہروں میں جانا ہوا۔ مئی کا پورا مہینہ رپورٹیں مرتب کرنے میں گزرا۔ اس طرح گویا جون میں آ کر فارغ ہوا ہوں اور کچھ سکون ملا ہے۔

میں نے تفسیر تدبر قرآن آپ کو بھجوادی تھی۔ اس کے ملنے کی ابھی اطلاع نہیں پہنچی۔ خدا کرے بحفاظت آپ تک پہنچ گئی ہو۔ تاکہ وہ جتنی شاندار ہے اسی حالت میں آپ کو مل جائے۔

یہاں اب نئے الیکشن کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ محلوں میں BD ممبری [1] کے لیے گٹھ جوڑ ہونے لگے ہیں۔ حکومت نے اپنی حسن کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ خود گورنر صدر صاحب کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اور ان کی خارجہ پالیسی تک پر بھی تبصرہ فرماتے ہیں۔ تمام وزرا یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہیں کہ جو کچھ ملک کو حاصل ہوا ہے وہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد حاصل ہوا ہے۔ احمد سعید کرمانی وزیرخزانہ نے مغربی پاکستان کا جو بجٹ اس سال پیش کیا ہے اس میں بھی دور جمہوریت اور دور ایوبی کا تقابل دکھایا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس سال خدا کے فضل و کرم سے برموقع بارشیں ہوئیں اور گندم کی فصل اچھی ہوگئی ہے۔ تو اس کا کریڈیٹ بھی حکومت لے رہی ہے اور اس کا سہرا ایوب خان کی زرعی پالیسیوں کے سر باندھ رہی ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

"دی مسلم" آتا رہتا ہے مگر آپ کے پرچے کو عرصہ ہو گیا۔ مسلم کا معیار تو انھوں نے خاصا بلند کر لیا ہے۔

سفر سے واپسی پر اپنا حلقہ تدبر قرآن از سر نو منظم کیا ہے۔ اب کے حدیث شریف کی تعلیم بھی اس میں شامل کر دی ہے۔ آپ لوگوں کے لیل و نہار کیا ہیں؟ (17 جون 1968ء)

☆......☆......☆

---

[1] یہ جنرل ایوب خاں کا خود ساختہ بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کا نظام (بی ڈی سسٹم) تھا جس کے تحت 80 ہزار بی ڈی ممبر (کونسلر) چنے جاتے تھے، 40 ہزار مشرقی پاکستان سے اور 40 ہزار مغربی پاکستان سے۔ انھی بی ڈی ممبروں کے ووٹوں سے یونین کونسلوں اور تحصیل و ضلع کونسلوں کے چیئرمین چنے جاتے تھے اور انھی کے ذریعے سے ارکان صوبائی و مرکزی اسمبلی اور صدر مملکت کا انتخاب ہوتا تھا۔ یہ نظام ایوب کے ساتھ ہی جاتا رہا۔ (محسن فارانی)

Marfat.com

سفرِ حج

بنام:...... ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

نوازش نامہ موصول ہوا۔ بے حد قلق ہوا کہ سفر حج میں یک جا ہونے کے باوجود ملاقات نہ ہوسکی جس کا سبب آپ کا قلیل قیام، بٹی کا ساتھ اور قافلہ حج میں شرکت ہوئی۔ چوں کہ میں نے اپنی تفصیلات سے مطلع کر رکھا تھا اس لیے مجھے ہر لمحہ انتظار رہا کہ آپ وہاں کے واقف حال ہونے کے باعث کچھ نہ کچھ وقت نکال سکیں گے۔ خیر جو اللہ کو منظور تھا وہی ہوا۔

منٰی میں ہمارا مکتب شارع جوہرہ پر جمرات کی طرف سے بالکل پہلا تھا۔ آگ کے موقع سے دور ہونے کے باعث ہم تو محفوظ تھے تاہم خیموں سے نکلنے کے حکم کے تحت ہمیں بھی میدان میں جانا پڑا اور اتفاق کی بات ہے کہ میں اور آپ کہیں قریب قریب ہی فروکش ہوئے کیوں کہ میں وسطی جمرہ کے بالمقابل سڑک کے وسط میں لگے ہوئے چھوٹے ستونوں میں سے ایک کے ساتھ ٹیک لگائے تقریباً دو گھنٹے بیٹھا رہا اور اردگرد گزرتی ایمبولینسوں کو دیکھتا رہا۔ جب آگ بجھی اس وقت میں واپس خیمہ کو روانہ ہوا۔ عرفات میں ہمارا مکتب مسجد نمرہ کے جوار میں تھا اس لیے میدان میں امام صاحب کے پیچھے نمازیں ادا کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ میری واپسی 23 اپریل کو ہوئی۔

واپس آنے کے بعد مولانا اصلاحی مدظلہ، سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف پہچانا بلکہ انھیں شائد یہ بھی احساس ہوگیا کہ میں حج سے آیا ہوں، اس لیے لیٹے لیٹے ہی بغل گیر ہوئے۔ ان کی کمزوری کی نوعیت ایسی ہے کہ سہارا دے کر بٹھانا پڑتا ہے۔ خود کھا بھی نہیں سکتے۔ نرم غذا منہ میں ڈالنی پڑتی ہے۔ گفتگو نہیں کر سکتے۔ بس کسی وقت ایک آدھ جملہ ادا کرتے ہیں۔ وہ کبھی سمجھ میں آتا ہے کبھی نہیں آتا۔ اس کیفیت میں وہ کئی ماہ سے مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو شفا عطا فرمائے۔ دعاؤں میں ان کو یاد رکھیں۔

(20 مئی 1997ء)

☆......☆......☆

بنام:...... نعمان راشد

حرم شریف کی حاضری بڑی پر کیف ہے۔ نمازیوں کے وسط میں طواف کرنے والوں کا اللہ کے گھر کا دیوانہ وار طواف ایسا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے کہ اس کو دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں۔ جی چاہتا ہے آدمی اسی کیف میں مستغرق رہے اور خود بھی طواف کرنے والوں میں شامل ہو جائے۔ مسجد کے صحن کا مسقف ❶ حصہ بہت وسیع ہے جس کا اندازہ پہلے مجھے نہیں تھا۔ یہ پچیس تیس صفوں کے لیے بنا ہوا ہے اور بہت بڑی تعداد کو سمیٹ لیتا ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ یہ حصہ چوکور بنایا گیا ہے اور معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس کے بعض حصے آگے اور پیچھے ہیں۔ یعنی تعمیر یکساں نہیں ہے جبکہ صفیں گولائی میں بنائی جاتی ہیں۔ یہ کام بس حیرت انگیز طور پر ہی ہو جاتا ہے حالاں کہ قالینوں پر کوئی نشان نہیں

❶ مسقف: چھتا ہوا (سقف: چھت)

Marfat.com

اور آدمی پر آدمی چڑھا ہوتا ہے۔

اپنے شاگرد مستحسن میر صاحب کے ہمراہ منیٰ اور عرفات کا پورا علاقہ گھوما اور اس کو اپنے تصورات سے بالکل مختلف پایا مثلاً اس علاقے میں پہاڑوں کی کثرت ہے۔ بیچ بیچ میں قدرے زمین ہے جب کہ میرے خیال میں یہ تھا کہ یہ علاقے ہموار میدان ہیں۔ پہاڑوں کی ساخت ایسی ہے جیسے ٹوٹی پھوٹی چٹانیں ہوں۔ منیٰ کے اردگرد ایک جدید شہر آباد ہے اور جو رہائشی علاقہ بن چکا ہے۔

اپنے امتحان کی طرف پوری توجہ دینا۔ یہ چیزیں اپنے کام سے توجہ ہٹانے کا باعث نہ بننے پائیں۔ زیادہ سے زیادہ اعتکاف کی طرح کی زندگی کا معمول بنانا چاہیے تاکہ دل جمعی کے ساتھ اپنا فرض ادا ہو۔ اس کے بعد نتیجہ خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مرضی اس کی پوری ہوتی ہے اور تمام امور اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس لیے اس کے ساتھ وابستگی میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ وہ اپنے بندوں کا خود حاجت روا ہے اور توکل کرنے والوں کو نامراد نہیں کرتا۔

یہ بات نہایت خوشی کی ہے کہ حسان عارف نے نماز کی پابندی کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ یہی زندگی کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اس جانب سے کبھی غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ (19 جولائی 1990ء)

☆......☆......☆

بنام:...... حسان عارف

غسل کعبہ کے بعد غلاف کعبہ کو کئی فٹ اونچا اٹھا دیا گیا ہے اور وہ ابھی تک ایسا ہی ہے۔ سلیٹی پتھروں کی تعمیر ہے جن میں کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا، کوئی بہت بڑا۔ یہی رنگت یہاں کے عام پہاڑوں کی بھی ہے۔ غلاف کے اٹھنے کے بعد سے طواف کرنے والے طواف کے دوران دیواروں سے لپٹ جاتے ہیں اور آہ وزاری کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔ بعضوں کا رونا اتنا بلند آہنگ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ یہی جذبہ یہاں کا اصل جذبہ ہے۔ اصل میں اگر آدمی غلطی کرے اور اسی پر اڑا رہے، کبھی اس پر نادم ہو کر اپنی اصلاح کی کوشش نہ کرے تو وہ غلطی اس کی عادت بن جاتی ہے جس سے پیچھا چھڑانا بعد میں مشکل ہو جاتا ہے۔ عام زندگی میں ہر اچھے انسان کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ غلطیوں پر نہ اڑے۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کی عادت ڈالے۔ یہی چیز بڑے پیمانے پر حج کی عبادت سکھاتی ہے۔ آدمی زندگی بھر کے گناہوں پر نادم ہوتا اور خدا کی رحمت کو بلاتا ہے کہ اس کی مغفرت ہو۔ طواف، سعی وغیرہ سب کی دعاؤں کا غالب عنصر گناہوں پر ندامت اور معافی کی طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح جذبے کے ساتھ حج کرنے والے کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے ایک معصوم بچہ پاک ہوتا ہے۔

اصل میں دعا کا بھی ایک فلسفہ ہے۔ بعض چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً یہ کہ اس نے کسی انسان سے کون کون سے امتحان لینے ہیں۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جن کے لیے بندوں کی جدوجہد کو ضروری قرار

Marfat.com

دیا گیا ہے۔ پہلی چیزیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ آدمی صبر یا شکر ادا کر کے امتحان میں سرخرو ہونے کی کوشش کرے۔ دوسری باتوں کے لیے جدوجہد لازم ہوتی ہے، وہ کی جائے اور ساتھ دعا ہو تو کارآمد ہوتی ہے۔ ورنہ دعا بے اثر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی روزی کمائے بغیر محض دعا کے زور سے کچھ حاصل کرنا چاہے گا تو ناکام رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ پہلی چیزوں میں دعا امتحانوں کو سہل کرنے کا باعث یا ان میں سرخروئی کا باعث ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں تعلیم دی گئی ہے کہ لوگ یہ دعا کیا کریں کہ پروردگار ہمیں ایسی مشکل میں نہ ڈال جس سے ہم عہدہ برانہ ہوسکیں۔ مولانا اصلاحی نے مجھے اپنے لیے یہی دعا کرنے کو کہا تھا۔

(24 جون 1990ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... ام نعمان صاحبہ

الحمد للہ حج کے مراحل ختم ہو چکے ہیں۔ 30 جون کو سحری کے وقت حج کا احرام بندھا۔ فجر کی نماز حرم شریف کے امام کی اقتدا میں حرم شریف سے کوئی سو گز دور ایک بازار کی سڑک پر ادا کی۔ اس کے بعد پاپیادہ مختصر سامان لیے ہوئے منیٰ کو روانہ ہوئے۔ یہ پیدل راستہ پہاڑوں کے اندر سرنگیں تعمیر کر کے بنایا گیا ہے اور آخر تک چھتا ہوا ہے۔ حاجیوں کے قافلے لبیک اللہم لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے منیٰ کو رواں دواں تھے۔ بہت مزے سے راستہ طے ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اپنے خیمے میں جا پہنچے۔ ہر خیمے میں دس آدمیوں کی رہائش تھی۔ پانچ سو سے زائد خیمے ایک مکتب کے تھے۔ ہمارا خیمہ نمبر 311 تھا۔

یکم جولائی کی صبح ویگن لی اور عرفات پہنچے۔ وہاں اونٹ کے گوشت اور خمیری روٹی سے ہماری دعوت ہوئی۔ اس کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ دعوت بادشاہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ نماز ظہر وعصر مسجد نمرہ میں جا کر پڑھی لیکن جگہ اوپر گیلری میں ملی۔ ذہن میں آیا کہ نعمان، حسان اس وقت خطبہ ٹی وی پر سن رہے ہوں گے اور اس طرح کارروائی میں ایک حد تک شریک ہوں گے۔ عرفات کا قیام غروب آفتاب تک ہوتا ہے اور تمام دعائیں اس مقام پر کی جاتی ہیں۔ اب اس میدان میں جابجا سایہ دار درخت نیم کے لگا دیے گئے ہیں جن کی آب رسانی کوئی سعودی مخیرؔ تاجر اپنے خرچ پر کر رہا ہے۔

مغرب کے وقت دوسرے لوگ تو بسوں میں سوار ہوئے اور ہم پانچ کا گروپ پیدل روانہ ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں مزدلفہ کے مشعر حرام کے قریب فٹ پاتھ پر قیام کیا۔ بسوں والے کوئی دو گھنٹے کی تاخیر سے پہنچے۔ رات آسمان کے نیچے بسر کی۔ فجر کی نماز کے بعد وقوف کیا اور منیٰ کو روانہ ہوئے۔ اس رات محض اتفاق سے ڈاکٹر شفیق صاحب کی بس ٹھیک اس جگہ آ کر رکی جہاں ہم براجمان تھے۔ اس طرح اس کا ساتھ بھی ہمارے گروپ کو میسر آ گیا اور رات میں ڈاکٹر شفیق صاحب کے مسئلوں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ منیٰ کا کچھ فاصلہ پیدل طے کیا تو ایک گاڑی نظر آئی۔ ڈرائیور سے

Marfat.com

معاملہ کر کے اس میں بیٹھ گئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہمارا یہ فیصلہ دانش مندانہ نہ تھا۔ اس کو جگہ جگہ ٹریفک کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جو کام ہم مزید آدھ پون گھنٹہ میں کر سکتے تھے اس میں کوئی دو گھنٹے صرف ہوئے اور راستہ بھر ڈرائیور سے تکرار الگ رہی۔ منیٰ میں بڑے شیطان کو رمی کی جو نہایت آسانی سے ہوگئی۔ اس کے بعد خیموں میں آ گئے۔

خیمے میں پہنچے تو نقشہ بدلا بدلا نظر آیا۔ اپنا خیمہ پہچاننا مشکل ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ جب ہم عرفات میں تھے تو یہاں خیموں کو آگ لگ گئی جس نے تین چار مکتبوں کو بھسم کر ڈالا۔ ساری انتظامیہ کی توجہ عرفات کی طرف تھی اس لیے منیٰ میں آگ بھڑکنے کے بعد اس پر قابو نہ پایا جاسکا۔ ہمارا تمام تر سامان نہ ملا۔ اس لیے بال منڈوانے کے بعد احرام کھولنے کے لیے کپڑے میسر نہ ہوئے۔ میں دو جوڑے ساتھ لایا تھا، وہ اور چھوٹی موٹی باقی سب چیزیں غائب ہوگئیں۔ آپ کے ماموں صاحب کا خیمہ جلنے سے بچ گیا۔ ان سے ملنے گیا تو انھوں نے اپنا ایک جوڑا مجھے عنایت کر دیا جو اس وقت پہنے ہوئے ہوں۔

طواف زیارت اور سعی کے لیے رات دو بجے اٹھے۔ بس لی اور سوا تین بجے شب حرم شریف پہنچے۔ طواف نہایت آسان تھا بلکہ عام نفل طوافوں سے بھی آسان تر، بڑا لطف آیا۔ فجر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد سعی کی۔ الحمد للہ حج کا یہ رکن اتنی آسانی سے مکمل ہوا کہ اس کا تصور بھی نہ ہوسکتا تھا۔

سہ پہر کو رمی کے لیے گئے۔ وہاں خاص رمی کے دوران تو ایسی مشکل پیش نہ آئی لیکن راستے میں بے قابو ہجوم میں پھنس جانے کے باعث کچھ لمحوں کے لیے پاؤں بالکل اکھڑ گئے، تاہم اللہ تعالیٰ نے گرنے سے بچا لیا۔ آج دوسرے دن کی رمی ہے۔ لوگ منیٰ کے قیام سے گھبرائے ہوئے وقت سے پہلے ہی رمی کر کے مکہ روانہ ہوگئے ہیں۔ بہت کم لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ مسنون طریقہ کے مطابق کل تیسرے دن کی رمی کر کے یہاں سے رخصت ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

پانچ دن کے لیے بسنے والا یہ شہر آج ہی سونا سونا لگ رہا ہے اور کل تو بالکل ہی ختم ہوجائے گا۔ رمی کے بعد حج کا صرف ایک کام طواف وداع ہوتا ہے۔ لیکن اس کی نوبت مکہ سے روانگی کے وقت پیش آئے گی۔ کل مکہ کو واپسی ہوگی۔

یہاں کی گرمی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن حقیقت کو مختلف پایا۔ عرفات اور منیٰ میں دن بھر ہم خیمے میں رہتے ہیں لیکن شدید گرمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ہوا ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ یہ لُو نہیں ہوتی بلکہ ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ مزدلفہ کی رات بھی بڑی خوشگوار تھی۔ لاہور کی نسبت یہ علاقہ ٹھنڈا ہے۔ (5 جولائی 1990ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عزیزہ نبیلہ سلمہا اللہ تعالیٰ

تمھارا خط ملا، حج کی مبارک کا شکریہ۔ گھر میں ہر فرد کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے۔ اگر وہ فرد موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کچھ اثر تو پڑتا ہے اور معمول سے ہٹ کر زندگی گزرتی ہے۔ اس لیے اس مرتبہ عید الاضحیٰ اگر مختلف انداز سے منائی جا

Marfat.com

سکی ہے تو وہ فطری بات ہے۔

فاروق کمال صاحب نے مجھ سے آتے وقت بات کی تھی۔ وہ مجھے یاد رہی اور حرم شریف میں اپنی دعاؤں میں اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہی دعا کی ہے اور اب بھی کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ میں اپنے عزیزوں سے ہر طرح کا حسن سلوک کرتا ہوں اور ان کو دیتا دلاتا رہتا ہوں لیکن وہ ہیں کہ میرے ساتھ بُرا سلوک ہی روا رکھتے ہیں، اس صورت میں میں کیا کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنا اچھا سلوک ترک نہ کرنا۔ اس طرح تم ان کے منہ میں مٹی بھرتے رہو گے۔ مطلب یہ کہ اس صورت حال سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ اپنا نیک رویہ ترک نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے اور وہ اس کی تلافی فرماتا رہے گا۔

آج مکہ شریف میں ہمارا آخری کامل دن ہے۔ کل بعد جمعہ معلم کی بسیں آجائیں گی اور عصر کی نماز کے بعد روانگی کا اعلان ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہفتہ کی فجر کی نماز مدینہ منورہ پہنچ کر ادا ہوگی۔ ان شاء اللہ طواف وداع بھی کل جمعہ کے بعد متوقع ہے۔

میری صحت الحمدللہ اچھی ہے۔ رب کریم کی عنایت سے پورا سفر نہایت اطمینان سے کٹا ہے۔ تمام مناسک بہت اچھی طرح ادا کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ سنت کے مطابق تمام کام ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا فرمائی ہے اور ہمیں کیا چاہیے۔ (19 اگست 1990ء)

☆......☆......☆

بنام:...... ناعمہ سلمہا اللہ تعالیٰ

ہمارا قافلہ نماز جمعہ کے بعد مدینہ روانہ ہونے کے لیے پابند کیا گیا تھا، لہٰذا حرم شریف جانے سے پہلے سامان پیک کر لیا گیا۔ جمعہ کی نماز امام کعبہ کے پیچھے پڑھی، کچھ تلاوت کی اور اس کے بعد طواف وداع کیا۔ حرم شریف کو الوداع کہتے وقت لوگوں کی کیفیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ کوئی نمناک آنکھوں کے ساتھ رخصت ہوتا ہے، کوئی دہاڑیں مار کر روتا ہے، کوئی الٹے قدم مودب ہو کر چلتا ہے، کوئی مڑ مڑ کر بیت اللہ شریف کو دیکھتا ہے، کوئی تکمیل فرض پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ میں تین بجے فارغ ہو کر مکان پر پہنچا۔ ساتھیوں نے آخری پیکنگ کی۔ عصر کی نماز محلے کی مسجد میں پڑھی۔ واپس آئے تو معلم کی بسیں موجود تھیں۔ لوگ اپنا اپنا سامان لے کر آئے۔ چھتوں پر رکھوایا۔ اب مسافروں کی گنتی شروع ہوئی۔ یہ پنسیری باندھنے میں خاصا وقت لگا۔ بالآخر 6 بجے بس روانہ ہوئی۔ مکہ سے مدینہ کا فاصلہ 270 میل ہے یعنی اتنا ہی جتنا لاہور سے پشاور تک کا فاصلہ ہے۔ رستے میں تین چار مقامات پر پاسپورٹ چیک ہوتے ہیں۔ ایک جگہ رات کے کھانے کے لیے بس رکی، ایک جگہ نماز مغرب ادا کی گئی۔ بالآخر رات دو بجے بس مدینہ منورہ پہنچ گئی۔

Marfat.com

چوں کہ شام مکہ سے نکلتے ہی ہوگئی، اس لیے رات کی تاریکی میں راستے کی سیر نہ ہوسکی۔ اتنا اندازہ ہوا کہ ابتدائی تیں میل کی مسافت میں ادھر ادھر چھوٹی پہاڑیاں تھیں، آگے وہ بھی نہ تھیں۔ راستہ ہموار ہی رہا۔ سڑک پر جا بجا ایسے مراکز آتے تھے جہاں کھانا، پٹرول، اور اشیائے ضروریہ کی دستیابی ممکن تھی۔ ہر مقام پر مسجد بھی ہوتی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہ سفرنئی تعمیر کردہ سڑک شارع الہجرہ سے ہو رہا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ہجرت کے لیے اختیار کردہ رستے پر مبنی ہے اور یہ مراکز وہ مقامات ہیں جہاں حضور ﷺ نے پڑاؤ فرمایا تھا۔ بہرحال یہ بات طبع پر گراں گزری کہ رات میں یہ سفر کیا گیا۔ دن میں ہوتا تو کہیں زیادہ سبق آموز ہوتا۔

مدینہ میں معلم کے آدمیوں نے چیکنگ کی اور بس کو مکان پر لے گئے۔ یہ مکان دو منزلہ ہے۔ ہم پہلی منزل پر ہیں۔ یہاں سہولتیں بہتر ہیں۔ حرم شریف تک پہنچنے میں دس منٹ لگتے ہیں۔ حرم شریف کی توسیع کا کام ہو رہا ہے۔ مکان پر سامان رکھنے کے بعد مسجد نبوی میں حاضری دی۔ جا کر تہجد کی نماز پڑھی۔ نماز فجر کے بعد ریاض الجنت میں نفل پڑھے اور روضہ رسول اللہ ﷺ پر سلام پیش کیا۔ وہاں سے نکل کر جنت البقیع پہنچے اور اہل بقیع کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد گھر واپس آ کر ناشتہ اور پھر آرام کیا۔ اب معمول یہ ہے کہ ہر نماز پڑھنے کے لیے مسجد نبوی میں حاضری ہوتی ہے۔ تلاوت اور درود شریف کی کثرت رہتی ہے۔ ابھی زیارتوں پر توجہ نہیں دی جاسکی۔

سب کو سلام۔ امید ہے نعمان کا امتحان اختتام پذیر ہوگا اور حسان تیاری کو فوقیت دے رہا ہوگا۔ دونوں کو سلام اور دعا۔

(22 جولائی 1990ء)

☆......☆......☆

بنام:...... راشدہ سلمہا اللہ تعالیٰ

قرآن مجید میں رحمان کے بندوں کی ایک دعا بتائی گئی ہے۔ وہ یوں مانگتے ہیں کہ ''پروردگار! ہمیں ہمارے بیوی بچوں کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں جو تو نے ان کا سربراہ بنایا ہے تو اپنے پرہیزگار بندوں کا سربراہ بنا۔'' اس دعا میں سب کی ہدایت، خدا خوفی اور نیکی کی دعا بھی ہے اور دنیا کے ان حالات کی اصلاح کی بھی جن سے آل اولاد کو دیکھ اطمینان قلب نصیب ہوتا اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میں یہ دعا تقریباً ہر طواف میں کرتا ہوں اور مجھے خدا کے فضل وکرم پر کامل بھروسا ہے کہ وہ اس کو قبول فرمائے گا۔ میرے نزدیک داماد بھی اولاد ہی کی طرح ہوتے ہیں اور وہ بھی اس دعا میں شامل ہیں۔

دعا کی قبولیت کی بعض شرائط بھی ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ جن کے لیے دعا کی جارہی ہے وہ خود بھی اس چیز کے طالب اور اس کے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے والے ہوں۔ اس صورت میں اللہ فرماتا ہے کہ اگر وہ میری جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں تو میں ان کی طرف دس قدم بڑھاتا ہوں۔ اگر وہ دھیرے دھیرے چل کر آتے ہیں تو میں بھاگ کر ان کی طرف جاتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوشش کا آغاز بندے کی طرف سے ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ بعد

Marfat.com

میں اپنی توفیق شامل کر دیتا ہے۔ دعا عملی کوشش کے بعد ہی سنی جاتی ہے۔ (18 جولائی 1990ء)

☆......☆......☆

بنام:...... ناصرہ سلمہا اللہ تعالیٰ

ہمارا مکہ اور مدینہ کا قیام بڑا پرسکون رہا ہے۔ خوب جی لگا کر حتی المقدور عبادت کی گئی ہے اور سب کے لیے دعائیں کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے وہ ان کو شرف قبولیت عطا فرمائے گا۔ یہ دونوں مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ میاں نظر آتے ہیں اور ان کا قرب محسوس ہوتا ہے۔ ایسی حضوری کی کیفیت اور کہیں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ تمام اعزہ و اقربا کو اس سعادت سے بہرہ مند فرمائے۔

یہاں موسم خاصا خوشگوار ملا ہے۔ مدینہ منورہ میں تو دو دن سردی کی لہر چلی اور لوگوں نے کوٹ سویٹر پہن لیے۔ مکہ میں سردی نہیں ہے تاہم یہاں بھی کھلی جگہ پر رات ٹھنڈی ہے اور فجر کی نماز کے لیے جاتے ہوئے یا چھت پر طواف کرتے ہوئے سردی لگتی ہے۔ فرش چونکہ سنگ مرمر کے ہیں اس لیے ان پر پاؤں بے حد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

اب حاجیوں کی تعداد پورے جوبن پر ہے۔ مسجد الحرام کے تہہ خانے، دونوں منزلیں، چھت اور اردگرد کی کھلی جگہیں حاجیوں سے بھر جاتی ہیں اور نماز کے اوقات میں اردگرد کی سڑکوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ طواف کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ نیچے کی نسبت اوپر چھت پر طواف کرنا نسبتاً آسان لگتا ہے۔ اس میں وقت تو زیادہ صرف ہوتا ہے لیکن دھکم پیل سے نجات مل جاتی ہے۔

صبا نعیم کے امتحان کا نتیجہ سامنے آ چکا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے دین اور دُنیا دونوں میں کامیاب و کامران فرمائے۔ اُمید ہے رسالہ تدبر آ چکا ہوگا۔ دس بارہ پرچے نعیم بلوچ کے حوالے کر دیں کہ وہ المورد میں پہنچا دیں۔

☆......☆......☆

مُتفرّق

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

عید مبارک! آپ کا نوازش نامہ ملے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ جواب میں کسی قدر دیر ہو گئی ہے۔ ادھر کچھ باتوں نے پریشان رکھا۔ دسمبر کے آخری عشرہ میں والد صاحب کی ناگہانی وفات ہو گئی۔ ان کو کوئی بیماری لاحق نہ تھی، بس تیرھویں روزے کو افطار سے ذرا پہلے ان کو اختلاجِ قلب کا دورہ پڑا اور ایک گھنٹے کی کشمکش کے بعد وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ مجھے رات چار بجے تار کے ذریعے لاہور میں اطلاع ملی اور دوسرے روز شام کو گھر پہنچا اور ان کے جنازے میں شرکت کی۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ہاں اعلیٰ درجات سے نوازے اور ہمیں ان کا صحیح خلف بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

(5 جنوری 1968ء)

Marfat.com

بنام:...... ابو سعد اصلاحی

آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ آپ کے عوارض کی شدت سے بہت تشویش ہوئی۔ جب آپ سے بمبور میں ملاقات ہوئی، اس وقت بھی آپ کو صحت کی جانب سے پریشانیاں لاحق تھیں۔ معلوم ہوتا ہے اب معاملہ مزید سنگین ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے اور آپ کی پریشانیاں دور کرے۔

ابوطلحہ نے مولانا مرحوم کی کسی کتاب کے چھاپنے کا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے مجھے اجازت دینے کے لیے لکھا تھا۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ ان کتابوں کے حقوق پاکستان میں فاران فاؤنڈیشن کے پاس اور انڈیا میں ابوسعد صاحب کے پاس ہیں لہٰذا آپ انھی سے معاملہ کریں۔ وہ اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ اس کے بعد ان کا کوئی جواب نہیں آیا، البتہ ماہنامہ اردو بک ریویو میں ایک کتاب کے شائع ہونے کا اشتہار آیا۔ اب تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے اور اس میں شرح موطا کا اضافہ ہوگیا ہے جو ادارہ تدبر قرآن وحدیث نے تیار کی ہے۔ انھوں نے ادارہ کو نمونے کی ایک کتاب بھیجنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ کیا کیا جائے لوگ کاروباری اخلاقیات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

رسالہ تدبر آپ کو برابر بھیجا جاتا ہے لیکن ادھر دونوں ملکوں کے تعلقات میں جو سردمہری پیدا ہوئی ہے اس کے نتیجے میں ڈاک کا نظام بھی متاثر ہوا ہے۔ اگر کشیدگی کم ہوئی تو آپ کو مطلوبہ شمارے بھیج دوں گا۔ اس وقت بھیجنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ (22 رمضان المبارک 1422ھ)

☆......☆......☆

بنام:...... خلیل الرحمن چشتی

آپ کی زیر تصنیف کتاب اور نوازش نامہ ملا۔ حسب الحکم ایک تقریظ بھیج رہا ہوں۔ [1] آپ کی سعی مرعوب کن ہے۔ کتاب کے صفحہ 508 پر جہاں جہاں "تفعل" آیا ہے وہاں شائد "مفاعلہ" مراد ہے۔ اگر "تفعل" ہی درست ہے تو بات میری گرفت میں نہیں آئی۔ امید ہے اس پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیں گے۔ (2 اپریل 2002ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

آپ کا نوازش نامہ ملے تقریباً ایک ماہ ہو چلا ہے۔ جواب میں اس دفعہ کچھ تاخیر ہوگئی ہے، امید ہے معاف

---

[1] مولانا خالد مسعود رحمہ اللہ کی خدمت میں، میں نے اپنی کتاب قواعد زبان قرآن کا مسودہ بغرض اصلاح وتنقید روانہ کیا تھا۔ مولانا مرحوم نے ایک غلطی کی نشان دہی کی، جس کی اصلاح میں نے فوراً کرلی۔ دراصل صحیح "مُفَاعَلہ" ہی تھا، میں نے سہواً "تفعُّل" لکھ دیا تھا۔ غور کیجیے اس صریح غلطی کی نشاندہی بھی مولانا مرحوم نے کس عاجزی اور انکسار سے کی ہے، جس میں دل شکنی کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر اعلیٰ درجات نصیب فرمائے۔ آمین۔ (خلیل الرحمن چشتی)

Marfat.com

فرمائیں گے۔ وہاں سال بھر میں تو آپ نے اپنی شاعری کو کچھ لفٹ نہیں دی مگر اخوان رہنماؤں کی شہادت سے آپ پر جو رقت طاری ہوئی اس کے طفیل آپ کے دبے ہوئے جوہر کھل سکے۔ خورشید احمد صاحب تو خیر غزل کو چھاپ دیں گے مگر میرے طالب علمانہ سوالات بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ''سپیدۂ صبح'' صحیح ہے یا ''سپید صبح''۔ موخر الذکر کا استعمال آپ کے سامنے ہے؟ پھر یہ کہ دوسرے شعر میں ''شمعِ حیات'' کی ترکیب میں ''ع'' گرتا ہے۔ پڑھیے تو ''شمِ حیات'' سے وزن برقرار رہے گا ورنہ نہیں۔ امید ہے روشنی ڈالیں گے!

آپ حضرات کے اسلامک مشن کا ایڈیشن 1966ء مجھے تو کچھ مفید معلوم نہیں ہوتا۔ خیر یہاں بیٹھے یہ اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ آپ لوگوں کی کی ہوئی تبدیلیاں کیسی ہیں لیکن جماعت کے دو لیڈروں کی پالیسی سازی اور تشکیل قیادت سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود اسلامک مشن کی اس انفرادیت کو ختم کرنا ہے جتنی اسے اب تک حاصل تھی۔ امید ہے حبیب الرحمٰن صاحب [1] امامت چھوڑ کر لندن منتقل ہو گئے ہوں گے۔ اچھا خدا کرے وہ انگلینڈ کے حالات کو سمجھ کر کوئی مفید لائحہ عمل مشن کے لیے اپنا سکیں۔

مولانا اصلاحی کی تفسیر کی کتابت 700 صفحات تک ہو چکی ہے۔ چھ سو صفحے میں سورہ بقرہ ختم ہوئی ہے۔ آج کل مولانا سورہ نساء میں ہیں۔ (13 اکتوبر 1966ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالخالق فاروقی

نوازش نامہ موصول ہوا۔ لڈّ [2] میں میری آمد واقعی اتنی مختصر تھی کہ اس کو آمد کا نام دینا ہی زیادتی ہے۔ جس مقصد کے لیے گیا تھا وہ بھی نہایت رواروی میں پورا کیا اور اطمینان سے نہیں بیٹھا۔ ارادہ تو میرا دوسرے دن واپسی کا تھا لیکن صورت حال ہی کچھ ایسی بن گئی کہ میرے لیے وہاں قیام مشکل ہو گیا۔

رسالہ تدبر کے مضامین پر آپ کے تبصرے سے اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی تیاری میں جو محنت کی جاتی ہے اس سے زیادہ نہیں تو معدودے چند لوگوں کو ضرور فائدہ ہو رہا ہے۔ یہی ہماری محنت کا حاصل ہے۔ ان شاء اللہ یہ انداز فکر پھیلے گا اور اس کو قبول کرنے والوں کا ایک قافلہ بنے گا۔

جماعت اسلامی کے ساتھیوں سے انقطاع کا اگر کوئی فائدہ نہیں تو اس کو کیوں ضروری سمجھ رہے ہیں۔ جڑے رہنے میں آپ کو ایک حلقہ تو ایسا ملتا ہے جہاں آپ اپنی بات کر سکتے ہیں۔ انتظامی ذمہ داری نہ سنبھالیے۔ اس میں تضیع اوقات ہوگی۔

---

[1] حبیب الرحمٰن صاحب سے مراد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہیں جن کا تعلق گوجرانوالا سے ہے۔ 1965ء میں مانچسٹر کی ایک مسجد میں امام وخطیب کے طور پر آئے تھے، جماعت اسلامی پاکستان سے وابستہ رہے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کے بعد اسلامک مشن کے چوتھے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل تقریباً دس سال صدر رہے۔ بعد میں خرابی صحت کے بنا پر صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ اب بھی مانچسٹر میں مقیم ہیں۔ (عبدالرشید صدیقی)

[2] علامہ خالد مسعود کا آبائی گاؤں۔

Marfat.com

مقالات اصلاحی کی دوسری جلد کی کمپوزنگ ہوچکی ہے۔ چھپنے میں شاید دیر ہے۔ ماجد خاور صاحب کچھ عرصے سے بیمار ہیں۔ ان کی صحت یابی میں مزید وقت لگے گا۔ اس کے بعد ہی اپنے ناتمام کاموں کو شروع کرسکیں گے۔

(18 مارچ 2001ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

مدت سے آپ کی جانب سے کوئی خیریت نامہ نہیں ملا۔ البتہ اس دوران میں بک ریویوز مل گیا اور حیرت ہوئی کہ میرا ریویو پہلے نمبر پر شائع کیا گیا۔ مدیر صاحب کا شکریہ ادا کردیجیے۔ یہ ایک مبتدیانہ کاوش تھی لیکن معلوم ہوتا ہے ادارہ کے معیار پر پوری اتری۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ بھی کوئی ریویو قبولیت پائے گا۔

ادھر ارونگ کا ترجمہ قرآن موصول ہوا اور میں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اس پر ایک ریویو لکھا۔ بعد میں جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ بک ریویوز میں تو اس پر تبصرہ پرویز منظور صاحب کے قلم سے ہوچکا ہے۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے تبصرے سے زیادہ ترجمے کے نام وغیرہ پر اعتراض اٹھایا ہے اور دو صفحے تک مصنف کو اس پر رگڑتے گئے ہیں۔ اس سے ترجمے پر تبصرے کا حق ادا نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا تاکہ قاری یہ جان سکتا کہ اس کو یہ ترجمہ ہاتھ میں لیتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا ہے۔ افسوس کہ منظور صاحب کا تبصرہ یہ بات بالکل نہیں بتاتا۔

اب رسالے میں دوسرا تبصرہ تو دینا مشکل ہوگا لیکن اگر اس کو Critique یا Critical Appreciation کے نام سے دینا ممکن ہو تو میں یہ تبصرہ آپ کو بھیج دوں۔ میں نے اس میں یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ فاضل مترجم کس طرح کی چیزوں میں چوک گئے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر آپ مدیر محترم سے دریافت کرکے اطلاع دیں کہ اسے بھیجا جائے یا نہیں۔ اگر وہاں چھپ سکے تو یہ وسیع دائرے میں پھیل سکے گا اور لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

آج کل سلیم کیانی صاحب کہاں ہیں اور ان کا کیا پتہ ہے۔ (1 مارچ 1988ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ کتاب پر تبصرہ ارسال خدمت ہے۔

چند ماہ قبل میں نے ایٹن کی کتاب Islam and the Destiny of Man پر ایک تبصرہ لکھا تھا۔ وہ بھی بھیج رہا ہوں۔ اسلامک ریویو والوں کو دکھا دیں۔ اگر ان کے کام کا ہو تو وہ اس کو چھاپ دیں۔ اس صورت میں شاید پہلا پیرا تو دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ بھی کسی کمی وبیشی کی ضرورت ہو تو آپ کر سکتے ہیں۔ خرم جاہ مراد صاحب [1] ہیں تو پاکستان ہی میں لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ کچھ زیادہ ہی مصروف ہیں، ورنہ ان کو دکھا لیتا۔ تاہم

---

[1] خرم جاہ مراد صاحب خاصا عرصہ اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے۔ وہ Muslim World Book Review کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا انتقال لیسٹر ہی میں ہوا اور یہیں ہی مدفون ہیں۔ (عبدالرشید صدیقی)

Marfat.com

جو لوگ بھی وہاں کے رسالے کے ذمے دار ہیں، ان کو آپ دکھا سکتے ہیں۔ اگر وہ پسند کریں تو مزید کتابوں پر بھی ریویو لکھا جائے۔ ادھر میں نے لائبریری میں ہونے کے ناتے سے کریگ کی کتاب Jesus and the Muslims، فریڈرک ڈینی کی کتاب An Introduction to Islam اور علی کتانی کی کتاب Muslim Minorities in the World Today پر بھی تبصرے لکھے ہیں جو لائبریری میں منعقد ہونے والے بک ریویو سیشن میں پڑھے گئے۔ اگر ان کی افادیت ہو تو انھیں شائع بھی ہونا چاہیے جس کے لیے آپ حضرات کا پرچہ نہایت موزوں ہے۔

باقی خیر و عافیت۔ امید ہے آپ مع اہل و عیال خیریت سے ہوں گے۔ (20 جنوری 1987ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... عبدالرشید صدیقی

عید مبارک۔ کافی دنوں سے آپ کا کو خط نہیں لکھ سکا۔ رمضان شریف میں خوب مصروفیت رہی۔ اپنے محلے کی مسجد خضریٰ میں دعوت دین کا کام جاری رہا۔ آخری عشرہ میں اعتکاف کا فیصلہ کیا۔ اس لیے دفتر سے چھٹی لے لی چناں چہ اعتکاف کے دن بھیرہ کی جامع مسجد [1] میں گزار رہا ہوں۔ عید کے دوسرے روز اپنے گاؤں للہ ضلع جہلم جاؤں گا اور 20 جنوری تک وہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد لاہور کو واپسی ہوگی۔

شاید آپ کو پچھلے خط میں خبر دے چکا ہوں کہ تفسیر تدبر قرآن چھپ کر مارکیٹ میں آگئی ہے۔ نہایت اعلیٰ معیار پر چھپی ہے جس سے دیدہ و دل روشن ہوتے ہیں۔ ہدیہ تیس روپے رکھا گیا ہے جو اس کے حجم اور معیار کی کتابوں کے لیے بہت ہی کم ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس تفسیر کو فہم قرآن کا وسیلہ بنا دے۔

امید ہے رسالہ میثاق باقاعدگی سے پہنچ رہا ہوگا۔ اور تنظیم اسلامی کے پہلے اجتماع کی کارروائی معلوم ہوئی ہوگی۔ ابھی تک مولانا کا دورہ مکمل نہیں ہوسکا اس لیے جماعت کی تشکیل کا حتمی اعلان کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اب رمضان شریف کے بعد شاید یہ منزل طے ہوسکے گی۔

آپ کا پیغام ملتا رہتا ہے۔ یہ ہے بہت ہی مختصر۔ اب مسلم والوں نے تو اچھا خاصا پرچہ نکالنا شروع کردیا!

(16 دسمبر 1968ء)

☆......☆......☆

بنام: عبدالخالق فاروقی

آپ کا نوازش نامہ ملا جو فراہی مکتب فکر کے ساتھ گہری انسیت و وابستگی کا غماز اور آپ کے گہرے تاثرات و احساسات کا ترجمان ہے۔ اللہ رب العزت ان جذبات کو مزید قوی کرے اور ان کی عملی تعبیر میں مدد و معاون ہو۔

امید ہے رسالہ وصول کرلیا ہوگا۔ اس کے مضامین پر آپ کا تبصرہ ادھار رہے گا۔ اس مرتبہ جنگوں سے ہٹ

[1] جامع مسجد سے مراد بھیرہ کی شیر شاہ سوری مسجد ہے۔

Marfat.com

کر کچھ لکھا ہے۔

خوشی ہے کہ آپ نے کسی عنوان پر کام شروع کر دیا ہے۔ جوں جوں آپ آگے بڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ کام آسان ہوتا جا رہا ہے اور آپ کا ذہن روشن تر۔ کوئی چیز موصول ہوگی تو رائے قائم کروں گا۔

رسالہ حرمین میں میں نے دو قسطیں تدبر حدیث پر تنقیدی مضامین کی پڑھی ہیں۔ اس میں کام کی بات تو کوئی نظر نہیں آئی جس سے معلوم ہوتا کہ مولانا اصلاحی کی تنقید بے محل ہے۔ بس غیر مربوط جذباتی تحریریں ہیں یا گھٹیا زبان۔ دیکھتے رہیے اگر کوئی معقول تحریر آئے تو اس پر غور کریں گے۔ حرمین کے مضامین پر لکھنے کی فی الحال تو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

امام فراہی کی عربی تصانیف یہاں تو کہیں سے دستیاب نہیں ہیں۔ ممکن ہے انڈیا میں ہوں۔ خود میں بھی بعض تصانیف سے ابھی تک محروم ہوں۔ (15 جنوری 2001ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اس سے پہلے عید کارڈ بھی وصول کر چکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو لیسٹر میں بھی اچھا ماحول عطا کیا۔ توقع ہے کہ آپ اپنے ملنے والوں میں جذبۂ ایمانی بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے اور ان شاء اللہ جلد ہی وہاں اپنے ڈھب کے آدمی تلاش کریں گے یا تیار کر لیں گے۔ لیسٹر کا بیرونی نظارہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے۔ ایک مرتبہ میلٹن جاتے ہوئے یہاں سے گاڑی گزری تھی۔ مجھے اس کا اسٹیشن اچھا اور ستھرا معلوم ہوا۔ چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے شاید آپ کو کھلی فضا زیادہ میسر ہوگی۔

مجھے ڈپلومہ موصول ہو گیا ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ڈیپارٹمنٹ ہیڈ نے ڈپلومہ کی عبارت کے ساتھ ہی یہ فقرہ بھی ثبت کر دیا ہے کہ Commended for Work on Plant Design، گویا ہماری رات دن کی محنت نے پروفیسر سے داد حاصل کر لی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ میں اس داد پانے میں منفرد ہوں یا شہزاد بھی اس میں شریک ہے۔ مگر افسوس کا مقام بھی ہے کہ اس علم کے استعمال کے یہاں بالکل مواقع نہیں ہیں۔ عہدے میں ترقی کا تو کوئی امکان نہیں البتہ شاید -/40 روپے کی ایک ترقی ڈپلومہ کی وجہ سے مل جائے گی۔

ہمارے ہاں مہینوں سے خشک سالی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں نے خدا کے حضور التجائیں کیں اور نماز استسقاء پڑھی گئی چنانچہ گزشتہ ہفتہ بھر پورے غربی پاکستان میں خوب بارشیں ہوئیں ہیں۔ اُمید ہے اب فصلوں پر اچھا اثر پڑے گا۔

میں نے یہاں آنے کے بعد ابھی تک ''میثاق'' میں لکھنا شروع نہیں کیا۔ آج کل کچھ مطالعہ کر رہا ہوں۔ پیش نظر یہی بات ہے کہ کچھ خیالات جمع کر کے لکھنا شروع کر دوں گا۔ جب ایسا ہوا آپ کی طرف ''میثاق'' بھجوا دوں گا۔

Marfat.com

پچھلے دنوں رسالۃ الاخبار [1] کے دو پرچے اور نیوز لیٹر [2] کا ایک شمارہ ملے تھے جن سے وہاں کے حالات معلوم ہوئے اور کچھ یادیں تازہ ہوئیں۔ تمام رفقاء کو سلام پہنچا دیجیے۔ (16 فروری 1966ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عبدالرشید صدیقی

آپ کا رواروی میں لکھا ہوا مکتوب بڑے انتظار کے بعد موصول ہوا۔ آپ حضرات کے درمیان ایک خاصی مدت گزارنے کی وجہ سے قدرتی طور پر آپ کی خیر خیریت کا منتظر رہتا ہوں اور وقتاً فوقتاً اپنے آپ کو اسی ماحول میں موجود پاتا ہوں۔ یہ موجودگی خالص ذہنی اور جذباتی سہی، مگر دوستوں کے ساتھ قلبی لگاؤ کی مظہر ضرور ہے۔

آپ کی کامیابی کی خبر سے دلی خوشی ہوئی۔ [3] اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور اسے آپ کی مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمیں باد۔ اب آپ کے ارادے کیا ہیں؟ مجھے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ اگر آپ کو یہاں کے گھریلو حالات اجازت دیں تو مزید کچھ عرصہ سروس کر کے کچھ اندوختہ بنا لیں اور پھر پاکستان کا رُخ کریں۔ کیونکہ وہاں ہم لوگوں کے لیے بچت کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں مگر یہاں آ کر آپ کو کئی ذمے داریوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ سلیم کیانی صاحب کی شادی کی خبر سے بھی خوشی ہوئی۔ خدا شکر خورے کو شکر عطا کر ہی دیتا ہے۔ کیانی صاحب کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ خدا اس میں برکت کرے اور جوڑے کو خوش و خرم رکھے۔ ان کی طرف بھی مبارک باد والا خط لکھنے والا ہوں۔

برمنگھم آپ سے قریب ہی تو ہے۔ اس لیے کبھی کبھی وہاں کے اجتماع میں شرکت آپ کے لیے مشکل نہ ہوگی۔ جب کبھی وہاں جانا ہو، میری طرف سے ذاکر صاحب، [4] حافظ عبدالرحمان، [5] نور محمد، [6] اقبال اعجاز، [7]

---

[1] یہ انگریزی کا ایک ماہنامہ تھا جو (FOSIS) شائع کرتی تھی بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے (THE MUSLIM) رکھ دیا گیا۔

[2] اس سے مراد اسلامک مشن کا نیوز لیٹر ہے۔

[3] ''آپ کی کامیابی سے خوشی ہوئی'' اس کا اشارہ میرے The Library Association کے امتحان پاس کرنے کی طرف ہے۔

[4] ذاکر صاحب: سے مراد ذاکر علی صدیقی ہیں جو اُن دنوں کراچی سے برمنگھم منتقل ہوئے تھے۔ یہ میرے بھی دوستوں میں تھے۔ چند سال قبل ان کا امریکہ میں انتقال ہوا۔

[5] حافظ عبدالرحمان: برمنگھم میں اسلامک مشن کے رُکن تھے۔

[6] نور محمد: ایک سرگرم رکن تھے۔

[7] اقبال اعجاز: چودھری اقبال اعجاز صاحب عرصے تک برمنگھم میں مشن سے منسلک رہے۔ میں نیوز لیٹر کا ایڈیٹر تھا اور بھائی اقبال اعجاز صاحب اس کو شائع کرتے تھے۔ بعد میں اس کا نام ''پیغام'' کر دیا گیا۔ یہ ماہ نامہ بھی کافی عرصے شائع ہوا۔ اعجاز اقبال صاحب نے اسے ''پیغامِ اسلام'' کا نام دیا۔ اب مشن کا ایک ادارہ ''پیغام اسلام ٹرسٹ'' کے نام سے برمنگھم میں قائم ہے۔ جہاں مسجد، مدرسہ اور ایک کتاب گھر بھی ہے۔ (عبدالرشید صدیقی)

Marfat.com

مولانا محمد عظیم،[1] ڈاکٹر نسیم[2] صاحبان کو سلام کہیے۔ یہاں کے ایم اے او کالج میں اسلامیات کے لیکچرر مولانا خالد محمود برمنگھم کی مسجد کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ یہ آدمی سلجھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ جماعت وغیرہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ شاید یہ بھی کسی قدر کارآمد ہو سکیں۔

نیوز لیٹر کے سائز وغیرہ میں تو آپ نے تبدیلی کر دی اور تنوع بھی پیدا ہو گیا مگر آپ نے ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا۔ مزید برآں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اسلامک مشن کے لوگوں کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اس کے اندر مشن کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں لوگ اتنے حساس کیوں نہیں ہیں کہ سال بھر گزرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنے اندر اس کام کے لیے کوئی سرگرمی پیدا نہیں کی۔ مجھے خطرہ ہے کہ نیوز لیٹر کہیں مشن کے بجائے آپ ہی کی آواز کا ترجمان نہ رہ جائے۔ آپ میرے خیالات شائع کرنے سے اجتناب ہی کریں تو بہتر ہو گا، ورنہ لوگ معترض ہوں گے۔ مثال کے طور پر اسی اعلان تاشقند ہی کے مسئلہ کو لیجیے۔ آج کل یہاں اپوزیشن بشمول جماعت اسلامی کے پاس حکومت کے خلاف یہی ایک ہتھیار تو ہے۔ اسی عنوان کے زیر سایہ کل جماعتی کانفرنس بھی ہوئی اور مخالف محاذ کی ہائی کمان بنانے کا فیصلہ بھی ہوا۔ اب اگر آپ میرے خیالات شائع کرتے ہیں تو بہت سے لوگ اسے باعث افتراق سمجھیں گے، اگرچہ یہ خیالات سرکاری نہیں بلکہ ذاتی بھی ہو سکتے ہیں۔ (26 مارچ 1966ء)

☆......☆......☆

بنام:...... عارف علوی

آپ کا مکتوب گرامی ملا ہے۔ قرآن مجید کے علم کی ترویج میں آپ کی کوششیں ماشاءاللہ بہت عمدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق اور ان کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ جتنا زیادہ آپ دوسروں پر محنت کریں گے اتنا ہی زیادہ خود آپ کا فہم قرآن کھلے گا۔ یہ تجربے کی بات ہے۔

میں ان شاءاللہ اپریل کے پہلے ہفتہ کے دوران پنڈی آ رہا ہوں۔ کچھ دن قیام رہے گا۔ اس دوران ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی اور آپ کے دوستوں سے ملاقات ہو گی۔ (20 مارچ 1988ء)

☆......☆......☆

بنام:...... مولانا عبدالرحمان ناصر اصلاحی

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے اور دائرہ حمیدیہ کے کاموں میں آپ کی سرگرمیاں روز افزوں ہوں گی۔

رسالہ نظام القرآن کے پہلے تین شمارے نظر نواز ہوئے۔ اس کے بعد سے اس مفید سلسلے کی ترسیل شاید منقطع کر دی گئی ہے پھر کوئی شمارہ نہیں ملا۔

---

[1] مولانا محمد عظیم صاحب: جماعت اسلامی پاکستان کے قدیم رکن تھے۔ وہ برمنگھم میں مشن کے اجتماعات میں درسِ قرآن دیتے تھے۔

[2] ڈاکٹر نسیم: سے مراد ڈاکٹر محمد نسیم صاحب ہیں۔ یہ مولانا محمد عظیم کے بیٹے ہیں۔ برمنگھم کی مرکزی مسجد کی تعمیر اور اس کو چلانے میں ان کی خاصی خدمات ہیں۔

Marfat.com

ادھر اطلاع ملی کہ دائرہ حمیدیہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر شرف الدین صاحب کی کتاب ذکر فراہی رحمہ اللہ چھپی ہے۔ اسے دیکھنے کا اشتیاق یہاں ادارہ کے تمام احباب کو ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ایک نسخہ بھجوا دیجیے۔ معلوم نہیں کتاب کا مسودہ من وعن شائع کر دیا گیا ہے یا اس کے ان حصوں کی ایڈیٹنگ کی گئی ہے [1] جو میری شنید کے مطابق اس میں قابل اعتراض تھے۔

کچھ عرصے سے علیل ہوں۔ میری شفایابی کے لیے دعا فرمائیں۔

مدرسہ میں تمام احباب و اساتذہ کو سلام کہیے۔ (20 جنوری، 2001ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... عبدالرشید صدیقی

آپ کا عنایت نامہ ملے کئی روز ہو گئے ہیں۔ کچھ تو کام کی زیادتی کی وجہ سے جواب نہ لکھ سکا اور کچھ خطوط جمع تھے ان کا جواب پہلے لکھا، آپ کی باری دیر میں آئی۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ حضرات نے اپنی ترقی کا ایک سال اور ختم کر لیا ہے اور ان دنوں اجلاس کا دَور دَورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کام میں برکت دے اور مزید کی توفیق عطا فرمائے۔

رسالہ الاخبار میرے پاس نہیں آتا۔ یہاں صرف ایک پرچہ پہنچا اور وہ بھی پچھلے سال شاید نومبر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا نام ان کی میلنگ لسٹ میں نہیں ہے۔

امید ہے ''میثاق'' کا حالیہ شمارہ پہنچ گیا ہوگا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر زکوٰۃ کے موضوع کو شروع کیا ہے۔ یہ موضوع پہلے سے میرے زیر مطالعہ تھا، بعد میں ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب نے پریس میں یہ تجویز پیش کر دی کہ زکوٰۃ اسلامی ریاست کا ایک ٹیکس ہے اور اس کی شرح غیر معین ہے اس لیے موجودہ دور میں شرح پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔ روزنامہ مشرق میں اس مسئلے پر چند بحثیں ہوئیں اور میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مگر میری خواہش یہ ہے کہ اب زکوٰۃ کے عنوان پر مفصل مضمون قلم بند کیا جائے جس میں اس کی حقیقت، فلسفہ اور قوانین سبھی چیزیں بیان ہو جائیں۔ آپ اسے زیر مطالعہ رکھیں اور دوران اشاعت مشوروں سے اور بعد از تکمیل اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ اس شمارے سے ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنی کتاب ''تحریک جماعت اسلامی'' کا حصہ دوم لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے سے متعین طور پر ان حالات کے سامنے آنے کی توقع ہے جو جماعت میں خلفشار کا باعث بنے اور جس کے نتیجے میں متعدد اکابرین جماعت سے الگ ہوئے۔ جماعت اسلامی ہند کے متعدد اکابرین نے ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں دلچسپی ظاہر کی ہے اور لکھا ہے کہ ہم پہلی مرتبہ اصل اختلاف سے اب روشناس ہو رہے ہیں۔

باقی سب خیریت ہے۔ تمام احباب مجھے بھی اکثر یاد آتے رہے ہیں، کبھی کبھی میں خیال ہی خیال میں دوبارہ لندن پہنچ جاتا ہوں اور پھر سب ہی دوستوں کا خیال آتا ہے۔ آخر ایک سال کا تعلق رکھنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے

[1] دائرہ حمیدیہ نے ''ذکر فراہی'' کو ایڈیٹنگ کے بعد شائع کر دیا تھا۔

Marfat.com

کہ سلام صاحب، سلیم کیانی صاحب، بیگ صاحب، باری، عبدالعزیز خان، [1] سلیم صدیقی بخاری صاحب، امیر بخش صاحب، [2] رشید احمد صاحب، [3] حافظ عبدالرحمان صاحب، نور محمد صاحب اور دوسرے احباب کو بالکل بھول جایا جائے۔ کانفرنس کے موقع پر تمام احباب وشرکاء کو میرا سلام۔ (اگست 1966ء)

☆......☆......☆

بنام: ...... حلیم باچا

مدت سے آپ کا نوازش نامہ مل چکا ہے، لیکن مصروفیت کا کچھ ایسا عالم رہا کہ جواب لکھنے کی مہلت نہ پائی۔ اصل میں رسالہ کی ایڈیٹنگ کافی دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر چونکہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہوں تو گزر اوقات کے لیے ایک کام ذمے لے رکھا تھا۔ اس میں بڑا وقت صرف ہوا۔ اب اس سے فارغ ہو چکا ہوں اور آج کل اپنے تصنیفی مشاغل از سر نو شروع کر رہا ہوں۔

یادگار سفر ہند کو آپ نے پسند فرمایا۔ اصل میں ہم لوگوں نے بھی نام تو سن رکھا تھا کہ مدرسۃ الاصلاح کوئی ادارہ ہے لیکن اس کے بارے میں معلومات نہ تھیں۔ میں نے چاہا کہ سفر کی داستان میں ضروری معلومات بھی سمو دی جائیں۔ لوگوں نے بالعموم اسے پسند کیا ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے لیے وہاں کے ماحول میں بہت اچھے جذبات تھے لیکن ہند کے جماعت اسلامی کے حلقے ان کی تنقیص کرتے ہیں۔ بہر حال ہر شخص کی سوچ کا اپنا معیار ہے۔

ابوسعید [4] نے لندن میں اپنا کاروبار شروع کر لیا ہے۔ اب یہاں وہ آتے ہیں تو مہمان ہی کی طرح آتے ہیں۔ میں انڈیا سے واپس آیا تو اتفاق سے وہ یہاں تھے تو ان سے ملاقات ہوگئی اور انہیں بھی وہاں کے احوال سے مطلع کیا۔ اس کے بعد ملنا نہیں ہوا۔

میری صحت بھی بقول آپ کے گزارہ ہی ہے۔ شوگر کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ پہلے دل کا مریض تھا اس کا تو آپریشن کرا لیا تھا۔ اب یہ لاعلاج مرض شروع ہو گیا ہے۔ آپ بھی میری صحت کے لیے دعا فرمایا کریں۔ خاصی کمزوری ہو چکی ہے۔ (10 دسمبر 2000ء)

☆......☆......☆

---

[1] عبدالعزیز خان: ان کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ بغرض تعلیم برطانیہ آئے تھے۔ اس مکان میں قیام تھا جہاں اسلامک مشن کا دفتر تھا۔ آج کل گلاسکو میں رہتے ہیں۔

[2] امیر بخش صاحب: ان سے مراد امیر اللہ بخش ہیں۔ ان کا تعلق بھی میسور (ہند) سے ہے۔ جماعت اسلامی سے منسلک رہے ہیں۔ مشن کے ابتدائی راہنماؤں میں سے ہیں اور اس کی شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔ اب کافی ضعیف ہو گئے ہیں۔ ہیوٹن میں قیام ہے۔

[3] رشید احمد صاحب: ان سے مراد رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان کا تعلق یوپی (ہند) سے تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لندن میں ایک اسکول میں بطور معلم کام کرتے تھے۔ بعد میں کافی عرصہ اسلامک مشن کے صدر رہے۔ چند سال قبل ان کا انتقال ہوا ہے۔ (عبدالرشید صدیقی)

[4] مولانا اصلاحی کے بیٹے

Marfat.com

بنام:.....

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ صاحبزادہ [illegible] نقطۂ نظر معلوم ہوا۔ میرا خیال ہے تبصرہ مختصر تو ضرور ہے مگر غیر منصفانہ نہیں۔ اس کے مختصر ہونے کی وجہ تو یہ [illegible] کتاب کچھ اہم نہ تھی۔ بعض کتابیں اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ ان پر کئی صفحات سیاہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر [illegible] کتاب ایسی تھی جس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کو خواہ مخواہ اہمیت دے کر مقبول بنانے کا کیا فائدہ؟

پھر تبصرہ لکھتے وقت مقصود تو کتاب کی نوعیت سے قارئین کو آگاہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی ایک ایک بات پر بحث کرنا۔ اس لیے مناظرہ ومباحثہ کی توقع تنقید وتبصرہ میں نہیں ہونی چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت میں نے کتاب کے مندرجات کے اہم پہلو ''مشتے نمونہ از خروارے''[2] کے اُصول پر جمع کر دیئے تھے۔ ان کی غلطی اتنی واضح تھی کہ میرے بیان کی متقاضی نہ تھی۔ اس لیے میں نے اصولی تبصرہ کرنا ہی کافی سمجھا۔

یوں بھی آپ غور کریں کہ ایک مسلمان جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر اعتقاد رکھتا ہے اس کے لیے راہِ نجات دو چیزوں میں ہے، ایک خدا کی مرضی کا علم جو کتاب اللہ سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری سنت رسول جس کا اہم ترین ماخذ حدیث ہے۔ اب جو لوگ عقل کے اتنے دشمن ہوں کہ کتاب اللہ اور حدیث شریف کے علم کو محض چھلکا قرار دیں اور اصل مغز اپنی ان خرافات کو قرار دیں جو ان کو بزعم خویش روح کی پرواز اور مراقبہ وغیرہ سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کے وہم وگمان ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ان کے منجملہ مزخرفات کو آپ ضلالت نہ کریں گے تو اور کس حسین نام سے پکاریں گے۔ میں نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

آپ خود بتائیے کہ قرآن غیر کتاب اللہ اور آدمی کی ذاتی خواہشات کے لیے کیا لفظ استعمال کرتا ہے؟

آپ کو تبصرے کے الفاظ کی سختی پر اعتراض ہے لیکن میں اس عزت واحترام کے باوجود جو صاحبزادہ صاحب کے لیے میرے دل میں ہے، ایسے الفاظ کو لکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیز آدمی کے احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس طرح کی چیزوں کے معاملے میں اگر مصالحانہ روش اختیار کی جائے تو میرے نزدیک اپنے ایمان ویقین کی موت ہے۔

جہاں تک قرآن وحدیث سے صوفیاء کے استدلالات کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ غلط تاویلات کی بدترین مثالیں ہیں لیکن ان پر تنقید کسی تبصرہ وغیرہ میں نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تو الگ تصنیف کی ضرورت ہے اور ہمارے زمانے میں تصوف کو اتنی اہمیت حاصل نہیں کہ یہ دردِ سر اس کے لیے مول لیا جائے۔

---

[1] ''قرآنی نظریہ حیات''، جس پر ماہنامہ میثاق لاہور میں تبصرہ شائع ہوا تھا۔ مولانا محمد عمر بیربلویؒ کی تصنیف ہے۔ (ڈاکٹر انوار احمد بگوی)

[2] مشتے نمونہ از خروارے: ڈھیر میں سے ایک مٹھی اناج بطورِ نمونہ۔

Marfat.com

جلد دوم

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علامہ خالد مسعودؒ

تلمیذ

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین

حسان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com